رمضان مبارک

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

July 2014

اس شمارے میں:

☆ اسرارِ عشق میں ڈوبی ایک خاص کہانی امجد جاوید کے قلم سے

☆ سلیم فاروقی کا "آتش جنوں" ارشد علی ارشد کا "مکھنی" اور نیا تہلکہ خیز سلسلہ "ناگن"

☆ ایک قلندر صفت مرد کی کہانی ☆ جلتے تایا کی روح میں اترتی آپ بیتی

☆ دہشت گردی کا شکار ہونے والے ایک سپاہی کی داستانِ شجاعت

☆ نیا دلچسپ سلسلہ "تین سو تین کہانیاں" سچ بیانیاں اور شعلہ ساماں تحریریں

☆ مسئلہ ہے "قرآنی آیات کی روشنی میں" آپ کے مسائل کا حل

07 زندگی روٹھ گئی — منزہ سہام



09 کچھ اپنی باتیں — کاشی چوہان
اپنے قارئین سے مخاطب
مدیر کی کچھ دلداریاں

10 احوال — مدیر
قارئین کے خطوط اور ان
احوال کا دلچسپ سلسلہ

31 کوئی اپنا نہ رہا — بلقیس حسین
زمینداری نظام کے ظلم کی
شکار عورت کی داستان الم

39 کسے الزام دوں؟ — ارینہ جونیجو
ایک ماں کے ظلم کی کہانی
ایک بیٹی کی عبرت انگیز کہانی

48 کلموہی — غزل قریشی
ایک عورت کے چنگل سے آزادی
حاصل کرنے والی عورت کی کہانی

60 مہراں — کشور وسیم
معاشرے کے ظلم کا شکار ایک
عورت کی دکھ بھری داستان

63 اپنے ہی دام میں — مظفر عباس لغاری
جنگلی ماں کے خوف کے
میں گرفتار بیٹی کی داستان

75 مرد — محمد مزمل
اضطراب سے بھرا ایک مرد کی
روح میں اتری داستان عجب

80 زخموں کا مداوا — محمد عزیز ملک
گھر سے بھاگنے والی
عورت کی الم ناک کہانی

84 سب جائز ہے — عبدالغفار عابد
دولت کی ہوس میں اندھی
ایک عورت کی عبرت انگیز کہانی

87 حیاتِ جاوداں — محمد علی سدوزئی
دہشت گردی کا شکار ہونے
والے ایک سپاہی کی زندہ کہانی

90 وہ باتیں تیری — عائشہ وسیم
کراچی سے اپنے نانا کی
یاد میں، ایک محبت نامہ

92 آتشِ جنوں — سلیم فاروقی
چٹانوں سا حوصلہ رکھنے والے
ایک نوجوان کی سرگزشت

110 میں کون ہوں؟ — سدرہ انور علی
غریبی کے روپ میں چھپی
ایک مجرم عورت کی کہانی



فون: 34930470 - 34939823-021 / پرنٹر: حسام الدین عباسی کی پریس OB-7 جلپور روڈ کراچی

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
120	ناگن	اعجاز احمد نواب	ہزاروں سال کی تپسیا پر چھایا زندگی کا ایک جنگ
138	کھلاڑی	ممتاز احمد	ایک کھلنڈرے مرد کی داستان عبرت، سر گھوم جائے
146	عشقِ آتش	محمد کاشف مغل	ایک نوجوان کی اشکوں میں ڈوبی حسرت بھری کہانی
150	تایا	خلیل احمد انجم	[illegible] روحانی دنیا میں اتری داستان عجب، تجربات سے
158	ملاحظہ	ارشد علی ارشد	خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک عجیب لڑکی کی داستان
176	نظر کا دھوکا	ضیا بشری	روحانی باپ کے گرد گھومتی ایک شعلہ ساز تحریر
186	بٹوارا	اسلم قریشی	دل کی طرح عورت کا بٹوارا بھی ممکن نہیں، [illegible]
199	تیرے انتظار میں	سعید احمد جانی	حسد میں جل [illegible] ایک خاندان کی داستان عجب
208	مکافاتِ عمل	تاعقیل جاوید علی	بیٹوں سے [illegible] اجازت [illegible] محبت سے عاری ایک ماں کی کہانی
215	مقدر کی آگ	عاصمہ الیاس	حاسد دل کے ظلم کی شکار ایک بیٹی کی عبرت انگیز کہانی
220	ایک حقیقت ایک کہانی	ڈاکٹر عبدالرب بھٹی	محبت کی کہانی [illegible] روح کی کہانی جو آگ میں جل اٹھی
224	مسئلہ	ادارہ	آپ کے مسائل کا حل، آپ کی کہانیاں کا لازوال سلسلہ
234	سخن آباد	قارئین	شعراء کے کلام سے آباد ایک سخن اہم سلسلہ خاص
238	فیضِ عشق	امجد جاوید	عشق کے حوالے سے عشق میں ڈوبی ایک خاص افسانوی کہانی

[illegible] پاکستان 720 روپے [illegible] 65 [illegible] 65 [illegible] 55 [illegible]

"زندگی روٹھ گئی"

میرے شہر کراچی کو نجانے کس کی نظر لگ گئی، جہاں خوشیاں تھیں، روزگار تھا...... جس کی شامیں معطر تھیں۔ جہاں راتیں جاگتی تھیں۔ آج وہاں ہر سُو خوف کا عالم ہے۔ زندگی سسک رہی ہے۔ موت ہاتھ پھیلائے ہر ذی روح پر اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ ہر منظر دھواں دھواں ہے اور ہر جانب بارود کی بو ہے۔ زندگی دہائی دے رہی ہے۔ جوان جو کبھی زندگی سے بھرپور تھے، آج سوختہ لاشوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ماں ماننے کو تیار ہی نہیں کہ یہ جلا ہوا پنجر اس کے لاڈلے کا ہے۔ بچے باپ کو پہچاننے کے بجائے ڈر کر بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ بہنیں اس ہاتھ کو تلاش کر رہی ہیں جو اُن کے سر پر سایہ فگن تھا۔ بیوہ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے اپنے سیاہ بخت کو رو رہی ہے۔ میرے شہر کو کس کی نظر لگ گئی کہ زندگی ہی کھو گئی...... زندگی ہی روٹھ گئی۔

منزہ سہام

ہم نہیں بھولے.....



1932ء.....2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں

کچھ اپنی باتیں

آج کا کام بہت مشکل ہے۔ یکسر ٹھنڈ ملی پیشن رہا ہے جاؤ اور بہترین خوبصورت دنیا میں [illegible] لکھنے کے بعد [illegible] تو
صاحب [illegible] سے تعلق سے خط اعوشن داخل ہو۔ [illegible] چند [illegible] سیکنڈوں میں [illegible] سخاوت کے بچاس سال [illegible]
[illegible] ایک ایک سے [illegible] سے وہ کام میں جاتا [illegible] قلم [illegible] بہت آسان [illegible]
سے اس [illegible] کے ایک سے بڑھ کر ایک سافٹ [illegible] ہیں۔ جیسا چاہتے [illegible] ایک [illegible]
[illegible] مشکل نہیں۔ صحافت کے ساتھ [illegible] صاحب [illegible] آپ کی انگلی [illegible]
[illegible] بہت سے [illegible] اس میں مر جاتے [illegible] اس [illegible] انقلاب ہے۔ اب [illegible]
سے رابطہ [illegible] بہت آسان ہے۔ ایک ایس ایم ایس یا ایک کال [illegible] آپ سے [illegible]
[illegible] ایک [illegible] سے [illegible] اور [illegible] کے کام [illegible]
[illegible] ڈیجیٹل [illegible] اور [illegible] آ گئی
ہیں۔ ایک سے ایک سافٹ [illegible] ہے۔ [illegible] سب [illegible]
[illegible] ہم بہت کام [illegible] ایک ہونے۔۔۔
[illegible] سہام مرزا۔ انھوں نے [illegible] ہم سب کا
[illegible] دلوں اور دل [illegible] پتا ہے۔ [illegible]
سہام مرزا [illegible] انسان [illegible] سے [illegible]
[illegible] کیسے ہیں [illegible] قلم سے لکھا کرتے [illegible] کیسے لکھ
لیتے ہوں گے [illegible] اور [illegible] کرلی اور
[illegible] سہام مرزا ایک وقت کی [illegible] کے [illegible]
[illegible] بہت بڑی
غلطی [illegible] صاحب [illegible] سے [illegible] حضرات [illegible]
[illegible] کرتے تھے [illegible] سہام مرزا [illegible] کے [illegible] سال [illegible]
[illegible] ایک [illegible] مراحل تھے جن سے [illegible]
[illegible] سہام مرزا [illegible] کہ USB میں [illegible] آ گیا [illegible]
[illegible] اور [illegible] لکھے گئے
[illegible] سے [illegible] سے [illegible]
[illegible] سہام مرزا اس مرحلے سے بھی
گزر گئے۔ اب [illegible] کا مرحلہ [illegible] کی طرح آسان [illegible] سے رابطہ [illegible]
تھے سہام مرزا ایسے [illegible] سے جانے کے [illegible] ایک [illegible] کیا [illegible] سوچتا
ہوں [illegible] تھے [illegible] کہانیاں کی اشاعت [illegible] کرتے تھے [illegible] اپنے
[illegible] جاتے تھے [illegible] بھی تھے [illegible] اشاعت [illegible] جاتے تھے [illegible] سب سے
[illegible] جاتے تھے۔ آج [illegible] ہو گئے [illegible] گئے ہونے۔۔۔ ارے نہیں۔۔۔ کیا [illegible] سہام
مرزا اس دنیا سے چلے گئے؟ بالکل نہیں سہام مرزا موجود ہیں ان کے [illegible] ہم وہ [illegible] تھا
[illegible] ان کا نام زندہ ہے، ان کا کام زندہ ہے ان کی [illegible] سہام زندہ ہیں۔۔۔ سہام
مرزا زندہ ہیں۔۔۔ جب تک اردو [illegible] پڑھی جاتی رہے گی سہام مرزا زندہ رہیں گے [illegible]
[illegible] انسان مر جاتا ہے مگر اس کا کام، اس کا [illegible] نہیں مرتا۔۔۔۔۔۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور ان کے جواب

بہت پیارے ساتھیو!

ماہ جون پوری حدت کے ساتھ گزرا۔ حبس اور گھٹن نے جہاں اور بہت سی چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لیا وہیں ہمارے رویے بھی اس کی لپیٹ میں آئے بنا نہ رہ پائے۔ مسلسل کچھ لکھاری ایوارڈز کی تکرار کرتے نظر آ رہے ہیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے لکھاریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے جب کہ سچی کہانیاں کو رائٹر میکر پر چھاپتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے رائٹرز میں تنقی کے چند ایک کو چھوڑ کر پوری کھیپ ان رائٹرز پر انحصار کرتی ہے جن کی ہر کہانی پر لال قلم اپنے بھرپور نقش ثبت کر کے سچی کہانیاں کے صفحات کی زینت بناتا ہے۔ ساتھیو! سوچیے اور پھر اپنے دل سے پوچھیے، یہ شور و غوغا کیسا!!

ایک طویل عرصے بعد ہماری بہت پیاری لکھاری بہن ڈاکٹر شہزاد المعروف نانی پشاور سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں پیارے بیٹے کاشی چوہان! خوش رہو آباد رہو! میں اور سب پیچھے ہٹ گئے تو آگے آنے دو ورنہ جو خالی کرو۔ تم سب کیا سمجھتے تھے؟ کہ یہ نانی خدانخواستہ چلی گئی ہے کہ جو جس کا دل چاہا وہ کر رہا ہے۔ ارے میں کچھ عرصے کے لیے صاحب فراش تھی کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ ... مگر اب اللہ کے کرم سے آپ کے سروں پر آفت بن کر کالم آ گئی ہے۔ ارے اتنا ظلم، اتنی اندھیر نگری کہ جعفر شہزاد بنا!!! اور قلم پا کے قلم کی پٹھن بلوچستان سے... بہت حیرانگی کی بات ہے کہ میری اپنی وضاحت کے باوجود غلط سلط نام اور مقام لکھا۔ مجھ بوڑھی جان نے دو دن دو رات کوشش کر کے بھی جو نمبر 15,15 صفحے کے اور پورا تبصرہ کیا!! اور موٹا موٹا کر کے لکھا تو شہزادی المعروف نانی کر دکھایا، اس پیج والے بابا جی کو میرے سے کیا دشمنی ہے؟؟ یہ کون پڑھتا ہے؟ پیج انچارج ذرا ان کا نام مقام مجھے بتاؤ پھر دیکھو کیا کرتی ہوں؟؟ ایسا کام کرواؤں گی کہ... ہاہاہا۔ چلو تو یہ ہو گئی گپ شپ اب آتے ہیں اپنے رسالے کی طرف۔ سب سے پہلے تبصرہ جی "ممتا" پڑھا۔ مگر یہ بھی ابھی جاری ہے مگر کہانی سے زیادہ مجھے انٹرویو اچھا لگا جس سے فرق اتنا ہے کہ وہ ... ہیں جو پڑھ رہے ہیں اور دوسری بات کہ بہت ہی مکمل اور کامل کہانی ہے۔ یعنی 5,6 ماہ سے مکمل پڑھ رہی سب ... کی پڑھ رہی تھی۔ "پیمانی یا تمنا" پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ طلاق روح میں تو کوئی نئی اتری بلکہ مجھے تو سخت غصہ آیا کہ ایک عورت وہ بھی اپنے حق سے کسی قدر آسانی سے دستبردار ہو کر چلی گئی، اپنا مرا تک سیدھا اتنا بے وقوف ہوتا ہے؟؟ آج کل کی تو عورت اتنی سیدھی نہیں تھا کہ مرد... بس اب انتظار ہی کرے اپنے بیٹے کا ماں کو کہاں چھپائے گا اور پھر کیا ڈراما کھیلے گا۔ خاردار بے زندگی میں سب سے بڑا قصور ماں اور باپ کا ہے۔ انجام مجھے زیادہ پسند نہیں آئی۔ خواہشوں کا اسیر بن گزار تھی، امریکا میں مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ جب امر کے خاوند کا انتقال ہوا تو اس کے ماں باپ کہاں تھے۔ "دو چچیاں کی تحقیق تھی کیا کہوں!" کہاں آ کے لٹے کارواں۔ یہی ایک اچھی مریضہ تھی۔ کیوں کہ پوری کہانی پڑھنے کے بعد پہلا خیال یہی میرے ذہن میں آیا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ محبت کا اظہار نہ ہوا اور

خودکشی کرلی۔ بیٹیاں بھی جلتی ہیں، اپنے بویا کاٹ رہی ہوں، ادھوری محبت، اچھی کہانیاں تھیں۔ سب سے زبردست جنت نظیر میرا کشمیر تھی۔ وٹی ڈانا بٹ صاحب۔ تبصرہ تو مکمل ہوا جتنا رسالہ پڑھا تھا تبصرہ لکھ دیا۔ اپنا اداریہ کے ساتھ اب آپ کا حسن سلوک ہے کہ کیا کرتے ہیں؟ تمام بھی تیج لکھتے ہیں یا ؟؟؟ سب کو سلام اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ اب کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ والسلام۔

☆☆ پیاری ڈالی جاناں! کیسی ہیں آپ۔ آپ کا تبصرہ…… اوا خر آ گیا۔ احوال بڑا ہوشیار باش! پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اتنا عرصہ غیر حاضر رہنے پر فائرہ سے فقط بیٹا…… میرا خیال ہے اب آپ غیر حاضر نہ ہوں گی۔



☆ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں رقم طراز ہیں۔ محترم بھیا کاشی، پرنان، جن جن دوستوں نے دعاؤں کے پھول دیے ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔ جون کا کی کہانیاں ما۔ ماڈل گل علی سے سجا سرورق بہت پسند آیا۔ منزہ آپی کا (اداریہ) امتنان تو جنت ہوتی ہے لیکن سبھی آئیں ایک جیسی بھی نہیں ہوتیں۔ احوال میں تمام خطوط پسند آئے۔ ملک عادل حسین جونیجو کا خط ایسے لگا جیسے آسمان کے ستاروں میں چمکتا ہوا چاند ہو۔ رانا محمد شاہد بھیا آپ کا اندازہ بالکل درست ہے میں کھیل سے وابستہ تھی نہیں الگ ہوں۔ میرا دھیان اللہ سے زیادہ اسپورٹس پر ہوتا ہے۔ سائیکل ریس، کرکٹ، باسکٹ بال یہ میرے فیورٹ ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے میں آج تک کبھی فیل نہیں ہوئی، ویسے آپ کی بات ہے رانا بھیا کہ آپ نے لڈو کھا تو لیا لیکن اس کا ذائقہ معلوم نہیں ہوا کیا کیا ہے بھئی۔ ممتاز احمد بھیا 26 جولائی زرینہ جونیجو آپی 8 جولائی۔ Happy Birth Day To You زندگی کی بہت ساری خوشیاں اللہ آپ پر نچھاور کرے آمین۔ اے ہیلو! میری باجی آر یو ریڈی؟ کیوں کتابت ہونے لگا ہے تبصرہ۔ عالیہ عورت سے بڑھ کر کوئی مکار نہیں دنیا میں کرن شبیر کی خواہشات تمام آسودہ مریم بخاری شادی ایک ہی رات، ام ستال کی خار زار ہے زندگی، دلشیر شہزاد کی خواہشوں کا اسیر، سویرا فلک کی بھر پور شرکت تھی، غلام مصطفیٰ کی، مریلی، اانا فراز کی معصوم پہچان، فضیلت فیصل کی شریک سفر یہ تمام سبق آموز تحریریں بہت پسند آئیں۔ آپی جنوں ہمارے کی جان بہت دلچسپ موڑ پہ ہے۔ نا کن اعجاز احمد خواب کی اس کہانی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے، لیکن ہر بار بھی پڑھتی ہوں، زندگی میں رسک نہ لیا تو کیا کیا؟ شائستہ کی ساونی، ایم اشفاق بٹ کی کہاں آ کے لٹا کارواں، نسیم سحر کی ادھوری، عادل حسین بھیا کی بیٹیاں بھی جلتی ہے وغیرہ بہت پسند آئیں۔ فن آباد میں تمام لوگوں کی شاعری پسند آئی، میری طرف سے تمام اہل ایمان کی کہانیاں کو رمضان… انوتو سارا اور برکتوں والا ماہ رمضان مبارک ہو، اب اجازت دیں جب بھی ہاتھ دعا کے لیے اٹھیں اپنی اس بہن، دوست کو ضرور یاد رکھیے گا۔ سب لوگ اپنا خیال رکھیے گا زندگی رہی تو اگلے ماہ ملیں گے تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆☆ سسٹر سدرہ! تمہارا اتنی فرصت سے کیا گیا تبصرہ تمہاری طبیعت کی جانب سے اطمینان دلا گیا۔ خدا تمہیں صحت دے۔ آمین۔ تبصرہ اچھا لگا تمہارا بطور خاص نیلی سیاہی سے لکھنا ہمیں بہت بھایا۔



☆ عادل حسین، کراچی سے شامل احوال ہیں لکھتے ہیں پیارے کاشی بی! السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے رخسانہ آنٹی اور منزہ آپی کو بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ جون کی کہانیاں اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا منزہ آپی کا ممتا چڑھ کر آخر میں ہم بھی دعا میں شامل ہو گئے۔ کاشی جی آپ کی اپنی باتیں ہمیشہ ہی کی طرح دل کو لگیں۔ احوال میں شامل ہو کر ہمیشہ ہی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی محبت اور جذبات قابل دید ہوتے ہیں۔ باتوں میں سچائی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اللہ اس محفل اور اس کے لوگوں کو ہمیشہ صحت و سلامتی کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔ اب ذکر ہو جائے تیج یا یوں کا۔ طاہر چھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ اپنے مقصد کے لیے کس حد تک گر جاتے ہیں۔ انداز بیاں بھی خوب تھا۔ خواہشات نا آسودہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مریم شاہ بخاری کی ایک ہی راستہ۔ ام

انسانوں کی خاطر ہے زندگی، یہ بتی چڑیاں، شکیل شہزاد صاحب کی خواہشوں کا اسیر، سویرا فلک کی مجرم لوٹ گیا، غلام مصطفیٰ صاحب کی امر رہا، ماہ اتراز کی معصوم پہیلیاں، شکیل صاحب کی بہت شریف سفر بھی اچھی لگیں۔ آتش چنار، کاش اور تناسخ خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شائستہ آرزو کی مونی کہانی آ گئے تھے کاروان، ایم اشفاق بٹ صاحب کی نیم کربناک ادھوری محبت اچھی لگی۔ ڈاکٹر محمد صاحب کی پہلی صدی پہلی تحریر بہت درست اور بہت خوب تھی۔ رشتوں کی محبت اور رشتوں کی کمزوری دونوں بہترین طریقے سے نظر آ گئے۔ میری تحریر آپ اگلے دور میں گے۔ شگفتہ عالم طارق کی اچھی پھر کاٹ رہی ہوں۔ عابد حسین کی پسند اپنی اپنی ہے۔ عامل بات نظمیں میرا انتخاب، نصرت سرفراز صاحب کی امانت، ڈھیروں کی تحریر تو بہت ہی نیا شادی میں جھلک گئی۔ خاص کر بابا داتا کی خاص تھی۔ منظر ہے ایک کامیاب سلسلے کے نتیجے میں اجرا آپ سب کو مبارک ہو۔ تحت آیا، سب نے اچھی تحریر ہی نظر نواز کیں۔ ٹائٹل بھی سوہنا خوب صورت تھا۔ اللہ پاک پرچے کو نظر بد سے بچائے اور مزید ترقی عطا فرمائے۔ بشیر ازندگی پھر ملاقات ہوگی، اپنا خیال اور ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ

☆ عادل حسین! آپ کی باقاعدگی ہمیں بہت اچھی لگتی ہے، اس میں بے قاعدگی نہ آئے۔

☆ جگت پورہ لاہور سے شمیمہ بٹ صاحبہ احوال میں موجود ہیں۔ لکھتی ہیں السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ادارہ پال پبلی کیشنز کے تمام اسٹاف، پیارے پیارے رائٹرز اور سب مدیر پیارے قارئین کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور دشمنوں، بری نظر والوں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ جناب عالی میں نے چند ماہ پہلے اور تے ڈرتے ہمت کر کے ایک تحریر بھجوائی تھی اور پھر اس کے بعد انتظار کا دامن تھام لیا۔ ہاں جی انتظار اور خوب لمبا چوڑا انتظار۔ کاش سر آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے اس انتظار کی اذیت سے آخر کار نکال دیا اور میری تحریر کو پسندیدگی اور منتخب کر لیے جانے کی نوید مجھے سنا دی۔ آپ کا بہت شکریہ۔

☆ شمیمہ صاحبہ! آپ کی کہانیاں موصول ہو چکی ہیں۔ آپ کی کہانی اس شائع ہونے ہی والی ہے، دیگر کہانیاں بھی جلد شائع ہو جائیں گی۔

☆ مسز نوید ہاشمی ارجمند قیوم آباد کراچی سے احوال میں رقم طراز ہیں۔ سدا خوشیاں بانٹتے رہو اور خوشیاں وصول کرتے رہو۔ تمام قارئین کی کہانیوں کا انتخاب خوب، کاشی چوہان اور منزہ سہام ہمیشہ خوشیاں باٹتی رہیں۔ احوال میں 43 افراد نے شرکت کی ان میں سے ڈاکٹر ظہیر احمد عابد، مہر شاہد حسین، غلام رسول گل، ندیم بھٹی، ممتاز احمد، منشی محمد عزیز، ایم اشفاق بٹ، عامر زمان عامر کی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔ حنا ایم۔ جی امین کی خواہشات، آسودہ کرن بشیر کی بابا جی پیاں، شکیل احمد احمدانی کی خواہشوں کا اسیر، شکیل شہزادی، مجرم لوٹ گیا سویرا فلک کی امر رہا غلام مصطفیٰ خان کی، معصوم پہیلیاں ماہ فروز کی، کہاں آ گئے کاروان، ادھوری محبت تبسم عمر کی، نصیب کی بارش محمود آکاش کی، پسند اپنی اپنی عابد حسین کی اور امانت نصرت سرفراز کی بے حد پسند آئی۔ نخن آباد میں ڈاکٹر شاد محمد تمر بزمی، عادل حسین، اسلم جاوید، شائستہ بتول کی شاعری پسند آئی، مہر شاہد حسین آپ کی شاعری اچھی لگی۔ ڈاکٹر صغیر احمد کی شاعری نے محفل لوٹ لی۔ تخن آباد کی جان ڈاکٹر صغیر احمد کی شاعری تھی۔

☆ مسز نوید ہاشمی صاحبہ! احوال میں آپ کی آمد اچھی لگی، امید ہے آپ کی احوال میں شرکت میں ناغہ نہیں آئے گا۔

☆ احوال میں ایک بار پھر ہے ہماری فن کاری اور تاسامل ساتھی کی محفل شکور صاحبہ کی سرگودھا سے۔ بہت محبت سے مخاطب ہیں۔ جون کے گرم ترین مہینے میں ٹھنڈک کا احساس ہے "سچی کہانیاں" چھپنے سے آن پہنچا زندگی حسین ہے سرورق کو دیکھ کر اندازہ ہوا تو کیوں نہ شیئر لیا جائے اور سچی کہانیاں کو جلد پڑھ لیا جائے۔ منزہ صاحبہ کی گھری باتیں رسالے کے حسن میں ہمیشہ سے اضافہ کرتی آئی ہیں۔ کاشی چوہان صاحب نے جس انداز سے گلہری کی زندگی اور انسانی زندگی کی ضروریات لکھی ہیں بھی داد طلب اور خوب مشاہدہ ہے۔ چمکتا دمکتا احوال، ناموں سے سجی محفل، بہت خوب۔ عبدالعزیز صاحب

خوشخبری

میرے قاری دوستو اور لکھاری ساتھیو! جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ماہنامہ سچی کہانیاں قارئین اور لکھاریوں کے لیے ایک معیاری اور دلچسپ پرچہ ہے جس میں ان کے دل کی عرضیاں اور من کی سچی کہانیاں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس بات سے انکار تو ناممکن ہے کہ سچی کہانیاں لکھاریوں کے لیے وہ منفرد پرچہ ہے کہ جس میں جب بھی تحریر لگتی ہے سنوار کر پرچے کی زینت بنائی جاتی ہے۔ سچی کہانیوں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے بے شمار لوگوں کو گمنامی سے نکال کر میدان ادب میں لاکھڑا کیا ہے اور آج وہ صف اول کے لکھاری کہلاتے ہیں۔ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے لکھاریوں اور قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے وقتاً فوقتاً کوئی سلسلہ جاری کرتا رہتا ہے۔ اب سچی کہانیاں کی جانب سے آپ تمام لوگوں کو یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ ادارہ کی جانب سے لوگوں کے بے حد اصرار پر دوبارہ سے انعامی سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں پہلی کہانی کو 1500 سو روپے دوسری کہانی کو ایک ہزار اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کو 700 روپے دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ادارے نے ایک کوپن پالیسی وضع کی ہے۔ جس کے تحت کہانی چھپوانے کے لیے کوپن منسلک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کہانی کے لیے قارئین اپنی آراء اور پسندیدگی کے ساتھ سب سے زیادہ کوپن بھیجیں گے وہ کہانی پہلے انعام کی مستحق ٹھہرے گی۔ اسی طرح آپ کو احوال میں اپنے خطوط چھپوانے کے لیے بھی خط کے ساتھ کوپن منسلک لازمی ہوگا۔ یاد رکھیے کسی کوئی کہانی یا خط ہرگز ہرگز قابل اشاعت نہ ہوگا جس کے ساتھ کوپن منسلک نہ ہوگا اور انہی کہانیاں انعام کی حق دار ہوں گی جن پر کوپن کے ذریعے پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قاری لکھاری حضرات اس ضابطے کو ضرور اپنائیں گے اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں تعاون کریں گے۔

نے میرے خط کی تعریف کی بہت شکریہ۔ بھی ذرا ہو جاتی ہیں چلتے ہیں لوگوں کے خطوں کی طرف میرا مطالعہ کہانیوں کی طرف۔ علاء الحسن صاحب کی کہانی تو ٹھیک تھی عورت ایسی چالاک بھی ہوسکتی ہے حیرت ہے اور مریم ہمیشہ کی بے وفا دوسری شادی کے لیے ہمہ وقت تیار۔ خواہشات آسودہ از شبیر صاحب کی اچھی کوشش ہے مریم شاہ بخاری کی ایک ہی رات بہترین کی محمد اسلم آزاد کی ذوق و شوق سے ہم نے کہانی پڑھنا شروع کی مگر اگلے ہی صفحے پر اختتام گیا سورا اللہ ویسے ایک بات کروں مجھے ایسا خیال کہ یہ کوزہ ان چھانے پر تل جاتا ہے۔ یہ کوئی بہت سنگین جرم نہیں جہاں پیار ہو وہاں ایسی باتیں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ کہاں آ گئے کاروان ایم اشفاق بٹ کی کاوش تحریر اچھی تھی۔ اب چلتے ہیں شعر آباد کی طرف کی جہاں ایک زبردست کلام کی محفل بھی ہے۔ تمیرا بڑ نیا صاحب غزل نمبر لے گئے بھئی واہ پیچھے عادل حسین بھی نہیں رہے عمران لائق صاحب خوب لکھتے ہیں، ریحان آفاق کی غزل اچھی تھی۔ قارئین کو رمضان کی برکتیں اور فضیلتیں مبارک اللہ حافظ

ڈاکٹر فلک شکور صاحب! آپ کی تعریف و توصیف تو قدکاوش تک آ گئی۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار اور احوال پر چھا گیا۔



زکی آئی خان سے یہ دھمکی ایم بے ترکشی کی۔ لکھتے ہیں السلام علیکم سب سے پہلے میری طرف سے تمام پاکستانیوں سچی کہانیاں فرینڈز ماشاءاللہ سچی کہانیاں اور تمام میرے عزیز کو ماہ رمضان کا مقدس ماہ بہت بہت مبارک ہو۔ 31-05-2014 بروز ہفتہ کری کا دن تھا میں 4 بجے آفس سے نکلا پیچھے میں شہر اور نیوز ایجنسی پر رکا تو ماہنامہ

سچی کہانیاں پر نظر پڑی جو سب سے منفرد، ہنستا مسکراتا ہزاروں رنگ بکھیرتا اپنے چاہنے والوں کی داد وصول کر رہا تھا۔ ٹائٹل دیکھا بہت پسند آیا، لڑکی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی دکھائی دی۔ منزہ سہام کی محبتوں سے لے کر امتیاز حسین ملک کی سنگ ملامت تک سب کی سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، بہت پسند آئیں۔ اپنا خط پڑھنے سے پہلے آپ کا محبت بھرا جواب پڑھا، آپ کو میری تحریر پسند آئی، بہت بہت شکریہ۔ تخت آباد، عادل حسین، ثمینہ ناز، آصف ریاض، شاہد فراز کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ باقی دوستوں نے اچھا لکھا۔ سچی کہانیاں ہمارا پیارا پرچہ ہے، سچی کہانیاں کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو اور بہت زیادہ ترقی دے آمین۔ میری والدہ محترمہ عرصہ 5 ماہ سے سخت بیمار ہیں۔ کاشی بھائی، اسٹاف سچی کہانیاں اور دوستوں سے التماس ہے کہ میری والدہ کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

☆ آپ کی والدہ کو خدا تعالیٰ صحت کاملہ عطا کرے۔ پرچہ پسند کرنے کا شکریہ۔



جمیل مجید: ایک عرصے بعد احوال میں رقم طراز ہیں۔ محترم کاشی روحانی نمبر ملا [illegible] سرورق سے لے کر آخری ورق تک بہت ہی پسند آیا۔ مبارک ہو ایسے اچھے نمبر کے لیے۔ کہانیاں ایک سے ایک تھیں۔ جاوید دراوڑی کی بہت ہی اچھی لگی، پھر [illegible] والی [illegible] یہ کہانیاں مجھے بہتر لگیں۔ ایسے سب کہانیاں بہت اچھی تھیں، میری بھابی [illegible] کی اللہ دین کی مثال سورج کے ساتھ [illegible] آپ کا شکریہ۔ مجھے موقع تو دے [illegible] ہیں۔ [illegible] بھی پسند آئی اور آتش [illegible] میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں، بہت اچھی لگتی ہے۔ تخت آباد میں عبدالعزیز کی آمد [illegible] حکیم خان کی شاعری پسند آئی، سب سلسلے خوب ہیں [illegible] چاندنی کی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کا کالم [illegible] اللہ ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔

☆ بہت اچھے خیالات ہیں، آپ کی آمد سے ہمیں خوشی [illegible] ایسی خوشی ہمیں ہر ماہ حاصل نہیں ہوتی؟؟



غلام رسول گل، جیکب آباد سے لکھتے ہیں: کاشی جان بھیا امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ 30 مئی کو 12 بجے [illegible] کے لفافے میں بند سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں تھا۔ [illegible] کے بغیر [illegible] سے آزاد کر دیا اور احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی، میرے قدم صفحہ 15 پر رک گئے۔ بے حد شکریہ۔ [illegible] شاہد حسین خدا آپ کو سدا خوش رکھے اور تمام کامیابیوں سے نوازے آمین۔ [illegible] انور علی نظم پسند کرنے کا شکریہ، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، دعا گو ہوں [illegible] خدا کے کرم سے ہم ٹھیک ہیں، آپ سنائیں۔ محفل میں خوب رونق تھی۔ تحریر سے بھائی غلام حسین، شاہد فراز، [illegible] کی کمی محسوس ہوئی۔ اسماعیل بھائی ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ [illegible] حسین، [illegible] رانا محمد شاہد، منظور احمد، امجد علی، شفقت حسین، منشی محمد عزیز کی خدمت میں سلام و دعا کہنا۔ تخت آباد میں تمام غزلیں اور نظمیں اچھی تھیں۔ محمد شاہد حسین آپ کی نظم اے جان، خوب رہی، سدا خوش رہو۔ کاشی بھیا آپ نے کوئی تحریر لکھنے کا حکم دیا، کیا کریں ٹائم ہی نہیں ملتا۔

☆ غلام رسول بھائی! جس طرح تم احوال میں آمد کے لیے وقت نکالتے ہو اسی طرح تحریر کے لیے بھی وقت نکال سکتے ہو بھائی۔

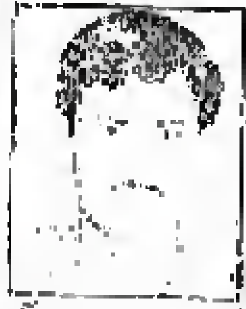


احوال میں یہ ہیں غلام حسین جیکب آباد سے لکھتے ہیں: جون کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، ٹائٹل اچھا ہے۔ محفل احوال خوب صورتی سے سجی ہوئی تھی، بس کمی تھی تو میری۔ یقین کریں جب جون کا تازہ شمارہ ملا تو میں نے ایک دم محفل احوال میں قدم رکھا، صفحہ 10 سے خود کو تلاش کرتے کرتے صفحہ 29 پر پہنچا کہ میرا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں تھا، اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟ کتنے ارمانوں سے میں نے خط تحریر کر کے پوسٹ کیا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں، ابھی سے [illegible]

شکوہ گلہ کریں۔ اب چلتے ہیں تازہ شمارے کی طرف حمزہ سہام تقا کی ''ممتا'' خوب صورت سبق تھا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ مریم شاہ کی ایک نئی راست، نصرت سرفراز کی امانت، عروج ہدوشان کی جنت نظیر میرا کشمیر بے مثال تحریریں تھیں۔ نصیب، نقش، شریک سفر، شاہدہ کی بکھرا موتی چن لیا، سویرا فلک بھرم ٹوٹ گیا۔ خوب صورتی سے بیان کی گئیں۔ مصروفیات کے باعث باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے اب اجازت اس شعر کے ساتھ۔

نہ دینا خط انہیں قاصد بس اتنا ان سے کہہ دینا
جنہیں تم بھول بیٹھے ہو وہ تم کو یاد کرتے ہیں

☆ ارے واہ سامیہ! تبصرہ زبردست ہے۔ خط ہمیں موصول نہیں ہوا ورنہ ضرور شامل اشاعت ہوتا۔



☆ یار اللہ یار، بلوچستان سے ساحل ابڑو رقم طراز ہیں۔ آج 4 جون کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں قریبی بک اسٹور سے خریدا۔ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر یہاں کچھ کمی محسوس ہوئی جس کی وجہ ہے ذاتی صفحہ۔ جی کاش کبھی کبھار اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے رہیں۔ احوال بھی اچھا سلسلہ ہے جہاں رائٹرز اور ہم ستاروں سے خوب گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ احوال میں تصویر کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے یقیناً مجھے بہت اچھا لگا۔ کم سے کم رائٹر ایک دوسرے کو پہچان تو سکیں گے اس طرح عورت اور نوجوان کی عزت تو آ جائے گی ہمارے دلوں میں۔ ایم اسلم آزاد صاحب آپ کی کہانی ''انتقام'' مجھے بہت اچھی لگی۔ آپ نے جو بھی تخلیق کی عورت کے حقوق پر کی، عورت کی اہمیت کیا ہے اس کو اجاگر کیا۔ کفیل احمد اعوان کی پانچ پریاں، سویرا فلک کی بھرم ٹوٹ گیا، مالا فراز کی معصوم پہچان، ایم اشفاق بٹ کی کہاں آ کے لئے کارواں، نسیم سحر کی ادھوری محبت دل میں بھا گئی، کیوں کہ میں ان کا فین ہوں۔ نصرت سرفراز کی امانت اور تمام رائٹرز کی کہانیاں بھی بہت ٹاپ پر تھیں۔ سلیم راہل آپ کہاں ہیں پلیز اپنی کہانیاں بھی لوٹا دیں، آپ کے بغیر سچی کہانیاں سونا سونا لگتا ہے، باقی تمام سلسلے اچھے چل رہے ہیں۔

☆ ساحل! آپ کی آمد نے ہمیں خوشی دی۔ تبصرہ بہتر ہے مگر مکمل کیوں نہیں؟ اس کے علاوہ تمہارے علاقے میں پرسچی کی سرکولیشن کم کیوں ہے اس پر بھی توجہ دیں۔ اقرأ کی لکھاری کا رشتہ پرچے کی مضبوطی ہی سے ہی مضبوط تر ہوتا ہے۔



☆ امجد علی اعوان ملک چیچل آباد سے شریک ہیں۔ لکھتے ہیں مدیر اعلیٰ حمزہ سہام اور مدیرہ کاشی چوہان سچی کہانیاں السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ 29 مئی کو بک اسٹال پر سچی کہانیوں کا دیدار ہوا۔ اس بار سرورق بہت پسند آیا۔ محفل احوال میں اپنا مختصر سا خط دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ کم از کم مختصر ہی جگہ پر کسی میں ہوں تو اور بیا ہے ہونے کا احساس، آپ کی محبت اور خلوص ہے۔ ظفر علی ابڑو، ام خیریت سے ہیں جناب دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ مور شاہد حسین آپ کی نظم اچھی تھی، غلام رسول گل نے بھی کھلا دیا ہے۔ ممتا اور کچھ اپنی باتیں، دل کی آنکھ سے پڑھیں۔ ماضی کی آگہی ہوں، تمام پسندیدہ سلسلے ہیں۔ نصیب کی بارش، بیٹی بھی جلتی ہے، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، پسند اپنی اپنی، امانت، بکھرا موتی چن لیا، بہت پسند آئی۔ جنت نظیر میرا کشمیر، ایک ہی راستہ، پانچ پریاں، امر بیل، ادھوری محبت، سلونی، اچھی تھیں۔ سنگ ملامت، کہاں آ کے لئے کارواں، شریک سفر، خواہشوں کا اسیر، حالات، خواہشات نا آسودہ زبردست تھی۔ معصوم پہچان، خارزار ہے زندگی، بھرم ٹوٹ گیا بھی پسند آئیں۔ انجمن آراء میں سب کے کلام عمدہ تھے۔ غزلیں اور نظمیں بے حد پسند آئیں۔

☆ امجد علی! تمہارے مختصر خط میں چھپی بہت اسیر کر دینے والی محبت کا شکریہ۔



٭ شفقت حسین۔ حسب سابق ہے۔ ۔ ۔ ترتیب وار۔ ۔ ۔ جون شمارہ اردو کے ساتھ شمارہ بھی نہایت ہی شاندار تھا۔ سرورق بہت شاندار، روحانی باتیں لاجواب ہے۔ اقوال میں سب سے پہلے بہت پر حسین تھی۔ شاہد فراز اور شاہد حسین بھائی آباد میں آباد ہیں خوشی کامیابی کی دعا ہے۔ سلام رسول گل، امجد علی، تحسین جونیجو، غلام حسین، عبدالعزیز کی آمد ہوئی۔ احمد بہت اچھے ہیں آپ کہانیوں کی ابتدا لطیفے بار بار پڑھتے ہیں پر سلیم نوروزی آتش دل کی بہت دلچسپ پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ ارشد علی ارشد کی افسانوی بے حد پسند ہے۔ اعجاز احمد نواب کا کمال ہوتی ہے۔ سویرا قلق کی خواہشوں کا اسیر، سید حسین کی پسندیدہ، عادل حسین کی بھی اچھی ہے۔ سب سے اچھی تھیں۔ امجد علی قاسم مصطفیٰ، امانت نصرت سرفراز، محبوب محبت، تمام تحریریں بے حد پسند آئیں باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں اب اجازت۔

٭٭ پیارے بھائی شفقت! آپ کی اقوال میں شرکت ہمیں خوشی دیتی ہے۔ خوش رہو۔

٭ کراچی سے مومنہ بتول اقوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں پیارے کاشی آپ کا روحانی نمبر بہت پاکیزہ اور خوب صورت سرورق دیتے پر شمارہ۔ روحانی باتوں میں آپ کا تجزیہ پڑھا۔ بخدا مجھ کی اللہ بھی کر بیگی بھی کیفیت طبیعت پر ضرور گراں گزرتی ہے۔ اقوال میں بھی دوستوں سے ملاقات رہی تمام روحانی کہانیاں بے حد اچھی تھیں دل کو ایمان تازہ اور یقین مستحکم ہوا ان کی کاوش آپ کو بام عروج پر لے جائیں گی۔ حسن اتفاق ایک چھوٹا سا سچا واقعہ پھر مجھے روحانی واقعے میں نے کردار میں ڈھال کر افسانے کی شکل دے دی۔ بےاب موضوع اور رمضان کے عین مطابق ہے لہٰذا آپ اسے رمضان کے شمارے میں ضرور شائع کریں گے۔ میں انتظار کروں گی امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے اور ہاں یہ محض اتفاق ہے لیکن آپ اس دوسری کاوش کو میری ذہنی اختراع مت سمجھیں ایسا ہرگز نہیں۔ یہ کہانی کا اصل کردار میرے ساتھ ہی موجود ہے۔

٭٭ بہت اچھی بہن مومنہ بتول! آپ کی کہانی صرف صفحات کی کمی کے باعث شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ باقی آپ کی کہانی انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

٭ نفیسہ طفیل صاحبہ کراچی سے شامل اقوال ہیں لکھتی ہیں اعزاز بھیجے کاشی خوش رہو امید ہے تمام اسٹاف ممبران اور بھائی افسانہ سہام مرزا کے خیر و عافیت ہوں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سب کو صحت و سلامتی عطا فرمائے آمین۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ دو بھائیوں کا شکر یہ ملا۔ کیا بات ہے روحانی نمبر کی تعریف بھی کریں۔ ۔ ۔ کم ہے پہلی ہی کہانی نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا۔ جادوئی جنون، پڑھتی چلی رہتی ہوں۔ اہل قلم کا قاری، احمد، ابو اسامہ، شان مراد، صدف آصف، وحی اللہ والی تجلی، معاذ، نور کا مالک تحریر سب، کنول مرزا، مرشد کی دعا، تسلیم کے صدف، یقین کا سکون، خالد، مجرم کے جیسوں الناس، فاطمہ، اور ان اور کی ملاقات، مسز زرین، شگفتہ اعجاز، دعا، پرویز احمد بہت پسند آئیں۔ ناکن، اعجاز احمد نواب، صنم کدہ ہے جہاں پر بھی ایک زبردست تحریر ہے مجموعی طور پر روحانی نمبر نے دلی سکون پہنچایا مجھے تو روحانی اور پراسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔ سب احمد کے اور تمام اسٹاف کو دعائیں سلام دیوں۔



٭٭ تم نفیسہ اخدا آپ کو صحت اور لمبی عمر دے تبصرہ آپ کا اچھا لگا۔ اگلے ماہ آپ کا تبصرہ ہمیں ضرور ملنا چاہیے۔



٭ بہاولپور سے یہ اقوال میں آمد ہے فیض رسول صاحب کی لکھتے ہیں جون کا شمارہ کل ہی ملا ہے میں نے ابھی پورا نہیں پڑھا سوچا پہلے خط تحریر کروں کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ دراصل قدرت سے یہاں ابھی گزرتی ذرا سی مشکلوں میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نئی کہانیاں وقت پر نہیں ملتی جس کی شکایت آپ سے پہلے بھی پچھلے دو شماروں میں کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود بھی شمارہ کافی لیٹ ملتا ہے۔ سب سے پہلے اقوال پڑھا حیرت ہوا کہ شاہد فراز اور غلام حسین کی کمی محسوس ہوئی۔ اور شاہد حسین آپ کہانی کب بھیجنے والے ہیں۔ میں خاص کر کے آپ کی کہانیاں پڑھتا ہوں۔ سدا خوش

رہو۔ باقی احوال میں تمام احوالی بہن بھائی دوستوں کو فیض رسول کی طرف سے سلام۔ شہزادہ زندگی حالات ایک ہی رات، سنگ ندامت بہت پسند آئیں۔ کہاں آ گئے لے کارواں، خواہشات کا آ... دونوں اچھی تھیں۔ باقی وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے اتنا ہی پڑھا ہے۔ سخن آباد میں مور شاہد حسین اور شاہد فراز کی نظمیں خاص طور پر پسند آئیں۔ مزید تبصرہ اس بار بھی نہیں۔ پاؤں کا ... زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ۔

☆☆ فیض رسول! تمہاری آمد کا تسلسل اور تحریر کا انداز ہمیں بتا رہا ہے کہ یقیناً تم بھی بہت جلد سچی کہانیاں میں بطور لکھاری یا شاعر دکھائی دینے والے ہو۔

☆☆ ظفر علی ابڑو۔ ٹھیڑ کراچی سے احوال میں تشریف فرما ہیں لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان السلام علیکم۔ سچی کہانیاں کے نئے احوال میں فوٹو شائع کیا۔ صفحہ 17 پر فوٹو کو پا کر دلی خوشی ہوئی۔ بے حد نوازش۔ احوال میں نئے لوگوں کو Well Come اور پرانے لکھاریوں کو سلام اور دعائیں۔ جناب کس کس کے نام لکھیں۔ تمام کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ تبصرہ ... عدنان کی جنت نظیر میرا کشمیر، نفیسہ کنول کی شریک سفر، ایم اشفاق کی کہاں آ گئے لے کارواں، مریم شاہ بخاری کی ایک ہی رات، امتیاز حسین ملک کی سنگ ندامت، مہر اللہ کی مجرم ... کیا بے حد پسند آئیں۔ ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی کی غزل، عادل حسین، اسلم جاوید، عصمت پروین، ... ملک، عاشق حسین ساجد کی غزلیں بہت اچھی تھیں۔ مور شاہد حسین کی اے جان خوب رہی۔ آصف ریاض، شاہد فراز، عمران واسر بیگ، شمیت ناز، ڈاکٹر مظفر احمد، نگہت ناز کی نظم بھی اچھی تھی۔ اب اجازت اپنا بہت خیال رکھے گا۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو دلی معذرت۔

☆☆ ظفر ابڑو بھائی احوال میں آپ کا آنا آپ کی محبت کی دلیل ہے۔ یہ تحفہ تمہاری تصویر والے پرچے ہمارے کتنے دوستوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

☆☆ قصور شریف سے ریاض حسین شاہد جلوہ افروز ہیں۔ مئی کا شمارہ روحانی نمبر اپنے دامن میں بزرگان دین کی روحانی فضیلتیں اور ان کی افروز کرامتیں، ریاضتیں اور روح کو تازہ کر دینے والی تحریریں لیے جلوہ افروز ہوا۔ صفدر علی حیدری کی تحریر دعا جانے حروف کی وہ ... تھی جس کا ہر لفظ گوہر نایاب تھا۔ عاشق حسین ساجد بھی قلم کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ ساز اور ... لکھ رہے ہیں۔ ... واقعات میں لرزش آ گئی ہے شاید انداز بیاں میں جھول ہے۔ البتہ مجید احمد جائی نے اچھی کاوش دے کر روحانی نمبر کو رونق بخشی۔ صدف سکینہ کی مختصر تحریر اچھی تھی۔ کنول کا دوسرا حصہ فنی اعتبار سے متاثر کن تھا۔ سب نے اپنی اپنی جگہ خوب صورت انداز میں طبع آزمائی کی۔ احوال میں شامل دوستوں کی محفل نے بے پناہ اپنائیت کا احساس دلایا۔ کاشی چوہان کی عارفانہ باتیں پڑھ کر روح کو تازگی ملی کہ حق آشنائی کا ایک چشمہ ادھر بھی چھپا ہے۔ "صنم کدہ ہے جہاں" کو پڑھ کر جن دوستوں نے پھر سے حوصلوں کو جلا بخشی، ان میں جناب عامر زمان بورے والا، صفدر علی حیدری اوچ شریف، ملک عاشق حسین ساجد، مجید احمد جائی ملتان، عبدالغفار ... نے دل کھول کر تبصرہ کیا۔

☆☆ بھائی ریاض! سلامت رہیے تبصرے کا شکریہ آپ کی دوسری تحریر کا انتظار ہے۔

☆☆ اٹک سے عمران فاتح تشریف لائے ہیں احوال میں لکھتے ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب! تسلیمات، مئی 2014ء کا شمارہ "روحانی نمبر" نظروں سے گزرا۔ پسند آیا اور دل چاہا کہ کچھ الفاظ بطور تبصرہ پیش کروں۔ حسب سابق "کچھ اپنی باتیں" سب سے پہلے نظروں سے گزریں اور آپ کی باتوں سے متفق ہونا پڑا۔ "احوال" کی طرف قدم بڑھایا تو تمام ساتھیوں کے احوال پڑھنے کو ملے۔ گزشتہ شمارے پر بڑے اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے کچھ

غمگین خبریں بھی پڑھنے کو ملیں۔ بالخصوص محمد اقبال زمان صاحب کی والدہ اور سدرہ انور علی کے ایکسیڈنٹ کا علم ہوا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم انہیں جلد از جلد صحت یاب فرمائے۔ رہی بات کہانیوں اور افسانوں کی تو "جلوہ جنوں" اول نمبر پر رہی۔ پڑوسی، دشمان سوالا، رحمتی اللہ والی، دو رکا، ماتم کدہ ہے جہاں اور بز بہت خوب رہیں۔ ارشد علی ارشد کی قسط وار کہانی بڑے احسن انداز سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ موصوف کی نئی شائع ہونے والی کتاب "چاند کی دہلیز" کا اشتہار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شمع آباد میں اتری، مارٹی، گیت غزل دیگر شعراء اچھی گی اپنے ماموں حکیم خان حکیم صاحب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا ہوں۔

ہر پھول کے چہرے پہ اداسی کا سماں ہے
افسردہ بہاروں نے تجھے پا لیا ہے

دیگر شعراء کا کلام بھی زبردست رہا۔ باقی تمام سلسلے حسب معمول خوب رہے۔ ایک نظم ارسال ہے، امید ہے کہ ان والد تصویر کے ساتھ شائع کریں گے۔

☆ پیارے عمران! اتم ملو ضرور ان شاء اللہ اور دیگر شعراء کا بھی خیال رکھو۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا اچھا لگا۔

☆ جاوید علی چغتائی آبادت لکھتے ہیں محترم کاشی بھیا، پیاری سدرہ کی جی کو پیار اور اچھی دعائیں آپ کے سمیت پورے اسٹاف اور سچی کہانیوں کے پڑھنے والوں کے نام۔ تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں مصروفیات کے باعث پچھلے ماہ احوال میں شریک نہ ہو سکا۔ احوال اجنبیوں کی خوب صورت باتوں سے چمک رہا تھا۔ مودستاجد حسین کا خط اور عمران کو بھائی۔ محمد عزیز سے شکریہ۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں سب بے حد پسند آئیں۔ سلیم فاروقی آتش جنوں، ارشد علی ارشد صاحب کی، اعجاز احمد نواب ناگن پسندیدہ سلسلے ہیں۔ مجرم موت کیا شریک سفر، انتقام، امانت، پسند اپنی اپنا نصیب کی بارش اچھی ہیں۔ حالانکہ یہ تی راست یہاں آپ کے لئے کاروان، ادھوری محبت، سنگ ملامت بے حد پسند آئیں۔ دیگر شمار خواہشوں کا اسیر، ام سنان فاطمہ زارا سے غزل، کرن شبیر خواہشات نا آسودہ، اسے خوشی ہوئی۔ غزلیں نظمیں سب حد اچھی تھیں بہت پسند آئیں۔

☆ پیارے جاوید! احوال کے ایک خط سے تم بھی تو ہو تم سب کی سلامتی کے لیے دعائیں۔

☆ طارق جاوید بہاولپور سے رقم طراز ہیں۔ مجھے اللہ پاک کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ آپ اور پورے اسٹاف سمیت تمام قارئین حضرات بھی خیر و خیریت سے ہوں گے۔ احوال میں یہ میری تیسری حاضری ہے یہ آپ کی محبت ہے جو ہم ہر ماہ مصروفیات سے وقت نکال کر بھی آپ کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ آپ بھی کھلے دل سے محبت و اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں، میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا۔ جون کا شمارہ بہت اچھا تھا بے حد پسند آیا۔ سچی کہانیاں ایک منفرد رسالہ ہے سب سے پہلے کہانی عکس پڑھی۔ بے مثال تحریر لیا آپ نے۔ عابد حسین کی پسند اپنی اپنی، عادل حسین یہ بھی جلتی ہے، امتیاز حسین ملک سنگ ملامت، شازیہ گل کھرا سونی چن لیا، نسیم سحر ادھوری محبت، شکیلہ انجم طارق اپنا اپنا کاشت، دیوی ہوں، عروہ رمضان جنت، نظیر بیرا کشمیر بے حد پسند آئی۔ خوب صورت موضوع پر کہانیاں لکھی گئیں۔ سلیم فاروقی آتش جنوں زبردست سلسلہ ہے، مٹی ارشد علی ارشد اچھا ہے، باقی شمارہ مصروفیات کی وجہ سے زیر مطالعہ ہے اجازت دیں۔ خدا حافظ

☆ طارق! بہاولپور سے تمہاری آمد اچھی لگتی ہے مگر بار بار سرکولیٹ ہو وہاں تو بات ہے۔

☆ فیصل آباد سے ہماری نئی کہانیوں کی شعاعت، آپ کی نگاران سے پھول نمبر فرحت صدیقی صاحب کی آمد لکھنی ہیں اچھے لگے کاشی چوہان السلام علیکم۔ حسب وعدہ نئی کہانیاں کے لیے حاضر ہوں۔ بقیہ صفحہ 82 سے 87

پُراسرار کہانی نمبر II

ناقابلِ یقین، دہشت انگیز، خوف ناک سچ بیانیاں۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی خوفناک کہانیاں......

شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پُراسرار کہانی نمبر II ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جولائی 2014ء

کوپن برائے احوال

میں بچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ---------------

مکمل پتا: ---------------

جولائی 2014ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں بچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: --------------- تعداد صفحات: ---------------

نام: ---------------

مکمل پتا: ---------------

فون/موبائل نمبر: ---------------

جولائی 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں بچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اول عنوان: --------------- مصنف: ---------------

دوم عنوان: --------------- مصنف: ---------------

سوم عنوان: --------------- مصنف: ---------------

نام: --------------- شہر: ---------------

تک کا زمانہ بھی یاد آ رہا ہے۔ جب ہر شمارے میں میری کہانی ضرور ہوتی تھی۔ یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے جس نے مجھے باندھ دیا ہے۔ تم میرے بہت بہت چھوٹے بھائی ہو۔ اور زبردست بھائی ہو۔ نئی کا شمارہ "روحانی نمبر" بہت زبردست تھا۔ بہت اچھا لگا۔ "جلوہ جنون" "سرکار دولہ حسین شاہ کی کرامت کی کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضرور نوازتا ہے۔ کیوں کہ وہ بندے اللہ کے بندوں کا خیال رکھتے ہیں۔ جاوید راہی کا اپنا انداز بیاں ہے۔ "بابا پاگل" ایسے بزرگ ہمارے سامنے اور ہمارے زمانے بھی ہوتے تھے جو اچانک غائب ہو جایا کرتے تھے میرے والد صاحب اور والدہ ایسے بزرگ کو بہت پسند کرتے تھے اور روزانہ ولی ذکری "بابا" رات کے کھانے پر ضرور ہوتا تھا۔ ونوک ہیئے تین ایسے بھی تھے جو گوجرہ میں میرے دادا حکیم سلطان احمد سے قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کا واقعہ ہے جو ہمارے والد صاحب اکثر ان کے قصے سنایا کرتے تھے۔ نوتال والی سرکار ٹھیک ہی تھی۔ حضرت میاں ورایا عالہ حضرت میاں مشتاق سائیں کی پرنور کہانی دل میں اتر گئی۔ وفا بے حد خوب صورت اور دل میں اتر جانے والی کہانی ہے اس کا ایک ایک لفظ حق کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ سرور ٹھیک ہی تھی، پڑوسن بھی ٹھیک تھی، ڈھونڈ کی کہانی بہت اچھی تھی کہ اس کی کایا پلٹ گئی۔ واقعی جس کے دل میں قرآن ہوتا ہے اس کی حفاظت بھی اللہ ہی کرتا ہے۔ وہ میرا ہمسایہ پڑھ کر بھی مزا آیا۔ اعجاز رضا کا آغاز اور انجام دونوں ہی پسند آئے۔ کنول عمران خان نے بھی اچھا لکھا ہے۔ ہر کہانی لاجواب اور خوب صورت ہے۔ کایا پلٹ میں افسانوی رنگ نمایاں ہے۔ مکافات عمل کا انجام بھی بہت اچھا۔ روحانی تفسیر کی خاص کہانی اچھی گئی ہے جس نے بہت متاثر کیا۔ ارشد علی ارشد کی تحریر میں جادو ہے۔ اور حق ہے۔ انشاء اللہ کی سچائی ہے۔ علم کا خزانہ ہے۔ جستجو کی جستجو ہے۔ امید ہے اب تم خوش ہو گئے کاشی چوہان۔ میری طرف سے سب کو بہت سلام۔

☆ آپ کا خط پڑھ کر مزا آ گیا۔ ہمارے سینئر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہی وقت کے ان لوگوں کو بہت ضرورت ہے۔

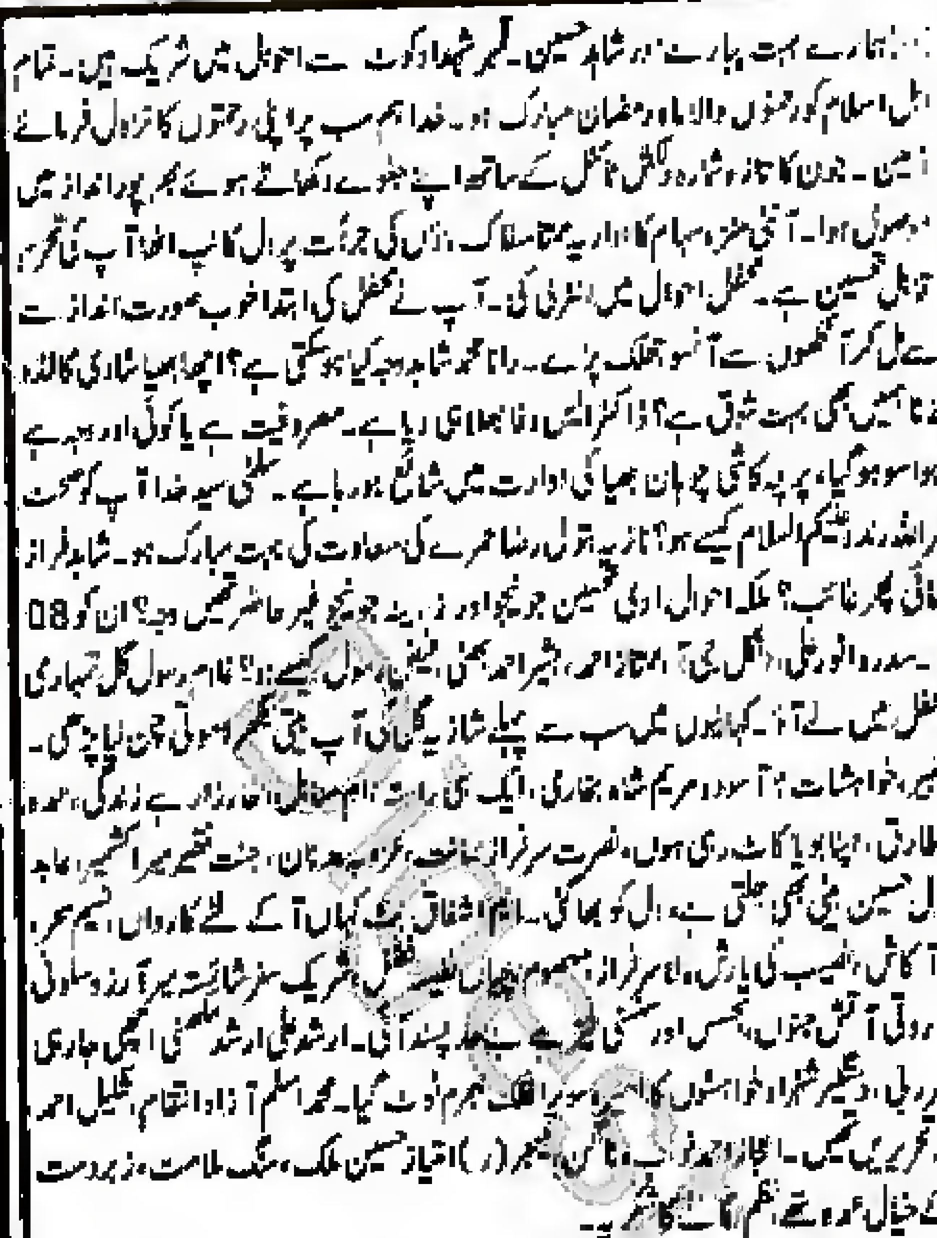


✉ ریحان آفاق، حیدر آباد سے شامل احوال ہیں لکھتے ہیں کاشی چوہان صاحب امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ "کچھ پتا نہیں" کے عنوان سے آپ کا کالم بھی بہت اچھا لگا۔ تحسین آباد میں اپنی غزلیں دیکھیں تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ آپ کے آنے سے نئی کہانیاں میں بہار کا موسم آ گیا ہے۔ آگہی کے عنوان سے بابا احمد نواب کی کہانی پہلی مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اب دل پچھتا رہا ہے کہ پہلے کیوں نہیں پڑھی۔ بہت ہی دلچسپ اور سحر انگیز کہانی ہے۔ سچی کہانیاں کے لیے ایک غزل روانہ کر رہا ہوں آپ کی حوصلہ افزائی کا منتظر۔

☆ پیارے ریحان آپ کی غزل شامل اشاعت ہے۔ پڑھ کر بتائیے گا۔ پچھتانا کیسا... آپ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

✉ نسرین اختر نینا، ... سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتی ہیں محترم بھائی کاشی چوہان صاحب یقیناً آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ احوال کا نیا انداز بہت اچھا ہے۔ سچی کہانیاں نے بروقت اشاعت کی اپنی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں مل جاتا ہے۔ آپ نے یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے کہ نئے رائٹرز کے ساتھ ساتھ سینئر رائٹرز سے بھی تحریریں لکھواتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح سے ہمیں سینئرز سے سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ آگہی کہانیاں کا ... بہت پراسرار تھا۔ اس کی بہت تعریف کی تھی۔ مجھے تو رات کو پڑھتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ کہانی ... انشاء اللہ ... آج کل ... بہت زیادہ ... ہے۔ ... ہیں ... کے لیے ...

☆ نسرین اختر نینا صاحب احوال میں خوش آمدید۔ آپ کے ... اقبال تمنا تعاون کے لیے شکریہ۔

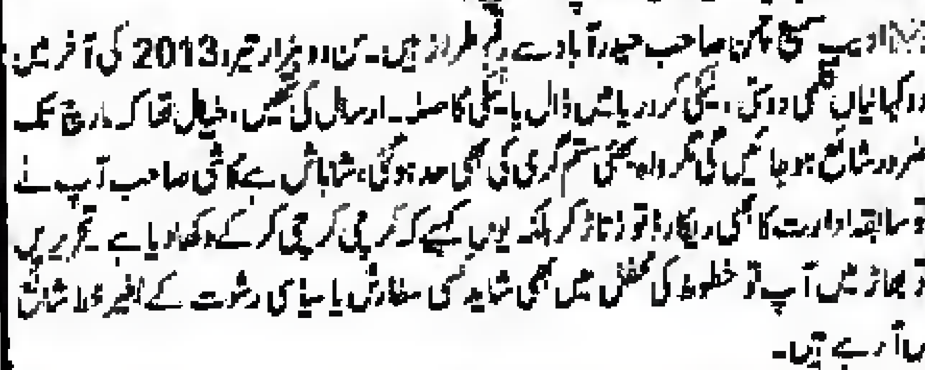


ہمارے بہت پیارے دوست شاہد حسین۔ لہر شہداد کوٹ سے احوال میں شریک ہیں۔ تمام اہل اسلام کو رحمتوں والا ماہ رمضان مبارک ہو۔ خدا ہم سب پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے آمین۔ جون کا تازہ شمارہ دلکش ٹائٹل کے ساتھ اپنے جلوے دکھاتے ہوئے بھرپور انداز میں وصول ہوا۔ آتشی حمزہ سہام کا اداریہ ہمیشہ کی طرح دل کی جرأت پر دل کا لب الوا آپ کی تحریر قابل تحسین ہے۔ محفل احوال میں انٹری کی۔ آپ نے محفل کی ابتدا خوبصورت انداز سے کی۔ محمد اسماعیل بروہی سے مل کر آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ رانا محمد شاہد وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اچھا بھیا شادی کا لڈو میٹھا تھا یاد کرو اور بتاؤ نا ہمیں بھی بہت شوق ہے؟ ڈاکٹر الیاس رفا بھائی رہا ہے۔ مصروفیت ہے یا کوئی اور وجہ ہے کی۔ سمیع ٹمن ویلکم، جو ہوا سو ہو گیا، یہ پڑھ کر خوشی ہوئی چوہان بھیا کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ملکی سید خدا آپ کو صحت تندرستی عطا فرمائے۔ عظمیٰ اللہ دتہ وعلیکم السلام کیسے ہو؟ نازیہ بتول رضا عمرے کی سعادت کی بہت مبارک ہو۔ شاہد فراز بھیا آپ نے جھلک دکھائی پھر غائب؟ ملک احوال اردی تحسین جرنیجو اور زینت جونیجو غیر حاضر تھیں وجہ؟ ان کو 08 جولائی جنم دن مبارک ہو۔ سدرہ انور علی، انکل جی، امتیاز احمد، بشیر احمد بھٹی میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہو؟ غلام رسول گل تمہاری دوستی کو سلام، مگر غلام کو تو محفل میں لے آؤ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شازیہ گلنار آپ بیتی عظمیٰ اصولی حق لیا پڑھی۔ ایم۔ ایس ایمن طلال، کرن شبیر، خواہشات ہو آسودہ مریم شاہ بخاری، ایک ہی بات، ام محمد اعوان، زندہ رہے زندگی، عمدہ تحریریں تھیں۔ شکیلہ انجم طارق، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، نصرت سرفراز، مناظر، عروبہ عدنان، جنت تقصیر میرا کشمیر، عابد حسین پسند اپنی اپنی، عادل حسین بیٹی بھی جلتی ہے۔ ان کو بھائی۔ ام اشفاق بٹ کہاں آ کے لٹے کارواں، نسیم سحر، ادھوری محبت، طارق محمود آکاش، نصیب کی بارش، ام سرفراز، معصوم بچوں کا قاتل، فقط تو شریک سفر شائستہ میرا رزق و سلوٹی نے متاثر کیا۔ انکل سلیم فاروقی آتش جنون، تجسس اور سسپنس کا تجربہ بہت پسند آئی۔ ارشد علی ارشد علمی ٹی اچھی جا رہی ہے۔ غلام مصطفیٰ خان امیر ربانی، دستگیر شہزاد خواہشوں کا اسیر، سویرا فلک بھرم ٹوٹ گیا۔ محمد اسلم آزاد انتقام، شکیل احمد ابدالی، پانی پریاں، پر اثر تحریریں تھیں۔ اعجاز احمد نواب وفا کی تعبیر (ر) امتیاز حسین ملک، سنگ ملامت، زبردست تھی۔ نجمہ آپا! میں سب کے خیال عمدہ تھے، نظم رکھنے کا شکریہ۔

☆ مور شاہد! تمہارے آنے سے لگتا ہے احوال میں رنگ اتر آئے ہوں۔ خوش رہو۔

ڈاکٹر الیاس رفا ارشاد کا دست لکھتے ہیں اقتضٰے بھیا کاشی چوہان سلام و دعائیں خدا آپ کو سدا سلامت رکھے آمین۔ عرض یہ ہے کہ میں نے یہ خط مور شاہد حسین ابن سلام اور گل بھائی کی محبت میں مجبور ہو کر تحریر کیا ہے۔ مور شاہد حسین نے ماہ مئی میں سالگرہ مبارک دینے کے بعد جون میں اس حسین محفل میں آنے کی دعوت دی اس لیے تو آنا ہی تھا۔ مور شاہد حسین اور غلام رسول گل میرے بہت ہی اچھے دوست ہیں، یہ پرچے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ بہت ہی شاندار اور نہایت ہی خوبصورت معیاری کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے ادارے کی ترقی اور آپ کی کامیابی کے لیے دعائیں۔

☆ ڈاکٹر صاحب! خدا کرے ادب کیا کیوں بھائی وفا آپ کے لیے۔



ادیب سمیع ٹمن صاحب حیدرآباد سے رقم طراز ہیں۔ میں دو ہزار تیرہ 2013 کی آخر میں دو کہانیاں لکھی تھیں دو دکھی دلوں کی۔ رسی کی کر دریا میں ڈال پانی کی کا صف۔ ارسال کی تھیں، خیال تھا کہ مارچ تک ضرور شائع ہو جائیں گی مگر وہ بھی ستم گری کی حد ہوگئی۔ شاباش ہے کاشی صاحب آپ نے تو سابقہ ادارت کا بھی ریکارڈ توڑ ڈالا۔ کر کے دنیا کہ کر پی کر جی کر کے دکھا دیا ہے۔ تحریریں تو بہار میں آپ تو خطوط کی محفل میں بھی شاید کسی سفارش یا سیاسی رشوت کے بغیر شائع کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہے ہیں۔

☆ ادیب سمیع ٹمن صاحب! آپ ماشاءاللہ جہاندیدہ اور زمانہ دیکھے بزرگ ہیں۔ بھلا یہ تو بتائیں کہ صفحات کی

قدرا کبھی دیکھی ہے کسی پرچے میں؟؟ اور ہاں آپ کے خط میں پھلجھڑیاں آپ کی طبیعت کی رنگینی کو خوب ظاہر کر رہی تھیں آپ کی غزل اس ماہ شامل اشاعت ہے۔ اب آپ کے تین نان سٹاپ صفحات میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جسے شامل احوال کیا جائے بتائیے اب کیا کریں؟ لہٰذا آپ بھی اب قلم کی آبرو کا پاس کرتے ہوئے بے سروپا تحریروں سے باز رہیں تو نوازش ہوگی۔

✉ شہزاد احمد صاحب، شاہ رکن عالم کالونی ملتان سے رقم طراز ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب السلام علیکم۔ سچی کہانیاں پڑھنے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے اب کی بار روحانی نمبر پڑھا بہت خوشی ہوئی کہ بزرگان دین کی شان و عظمت سے نئی نسل کو آگاہ کرنے کی ایک بہت اچھی کاوش ہے۔ سچی کہانیاں مئی 2014 کے شمارے صفحہ 108 پر بشیر احمد بھٹی صاحب کی کہانی بعنوان "وہ سو رہے تھے" میں جس بات کو بطور کرامت بیان کیا گیا وہ بات ہرگز اس قابل نہیں۔ باقی بھٹی صاحب کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی کہ انہوں نے کہا کہ بہشتی دروازے سے گزرنے والے پانچ وقت نماز بھی ادا کیا کریں کیوں کہ بابا فرید نے کبھی بھی نماز ترک نہیں کی۔ تو میں بھٹی صاحب کی بات کو بڑا کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ بابا فرید شکر گنج علیہ الرحمتہ نے ساری زندگی کبھی کسی کا ایک آنہ بھی غصب نہیں کیا پھر ان کے پردہ فرمانے کے بعد ایک "خود کردہ فراڈ" کو ان کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

☆ شہزاد احمد! آپ کا خط شائع کر دیا گیا ہے مگر ہماری محبت کو ہماری کمزوری سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کیجیے گا۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

✉ خیر پور ناتھن شاہ سے ملکۂ احوال تحسین جونیجو احوال میں رقم طراز ہیں۔ پیارے بھیا کاشی السلام علیکم۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے، پھولوں کی ننھی خوشبو کے سنگ نیک تمنائیں آپ سب کو۔ ہم تو پگلی نامعلوم کن خیالوں میں گم ہیں، بھئی واپس آ جاؤ تاکہ ہماری بھی سن لو۔ اور یہ حمزہ آپی کی داستان پڑھ کر غم زدہ کر گئی۔ کچھ اچھی باتیں آپ کی بہت اچھی لگیں۔ سید شاہد حسین بھائی، ٹھیک تو گئے زمانے کا شکوہ لگا رکھا ہے جو کہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ خیر آپ کی مرضی۔ انعام رسول گل صاحب وعلیکم السلام۔ خوش رہیے۔ روحانی نمبر پڑھ کر بڑی نوازش طبیعت کا سناؤ بحال ہوئی کہ نہیں؟ دعاؤں کے پھول آپ کے نام۔ عبدالعزیز جی آنکل وہ تو بے فکری اور بچپن کا زمانہ تھا کہ شرارت ہوا کرتی تھی۔ خیر اب بھی ویسا ہو سکتا ہے مگر اب وہ لوگ ساتھ ہی نہیں آ رہے۔ محمد عزیز صاحب مدتوں بعد کوئی اچھی تحریر سراہنے پر شکریہ ادا کر رہے ہیں جو کہ اچھی بات ہے۔ ورنہ تو اب لوگ یہ زحمت ہی نہیں کرتے۔ محمد اسماعیل بروہی بھائی اللہ سائیں آپ کی بھابی کے درجات بلند فرمائے (آمین) لقمان آباد میں بہت شمیم ناز، غزل نوید جمیل، اکھو بھائی سید شاہد حسین بھائی ان سب نے بہت عمدہ کہا۔ کہانیوں میں خواہشات نا آسودہ کرن جمیر، شریک سفر حنیفہ فضل، ادھوری محبت نسیم سحر، پانچ پریاں شکیل احمد احمرانی، چیتا بھی جلتی ہے عادل حسین، جنت نظیر میرا کشمیر عروبہ عدنان کی، خواہشوں کا اسیر دستگیر شہزاد، سنگ ملامت امتیاز حسین ملک انکل، معصوم پہچان ہالا سرفراز، بکھرا موتی جون لیا شازیہ گل اور ملغی ارشد علی ارشد کی بہت لاجواب تحریریں رہیں۔ آپی زرینہ کو 8 جولائی سالگرہ بہت بہت مبارک۔

☆ اچھی تحسین زرینہ آپی کو سالگرہ مبارک۔ باقی نئے لڑکوں کو کچھ نہ کہنا، ابھی تو وہ خاموش بیٹھے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں سنبھالنا ہی مشکل ہو جائے۔



✉ کراچی سے کنول عمران خان احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔ السلام علیکم کاشی بھائی۔ کیسے ہیں؟ جون کا شمارہ بہت اچھا لگا اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ نے ذیلی سرخی ختم کر دیا۔ واقعی اس سے پڑھنے میں کافی مشکل ہوتی تھی۔ اس بار میرا خط بھی شائع نہیں ہوا شاید لیٹ موصول ہوا ہوگا۔ میں نے ایک کہانی بھیجی تھی اس کا کیا ہوا؟ پورا شمارہ بھرپور ہے۔ حلالہ بہت اچھی اور الگ انجام کی کہانی تھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ویسے آپ کا کام بھی آسان نہیں

...تنی ہی کہانیاں آتی ہوں گی تو آپ کے پاس ان میں سے زبردست کہانیاں چن کر چھاپنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔ سلونی، معصوم چہیاں، [illegible] خواہشات تو آسودہ [illegible] زبردست تھی۔ اس کے علاوہ بھی باقی تمام تحریریں اچھی اور منفرد تھیں۔ [illegible] سے بات [illegible] آگے بڑھتا ہے۔ میں ایک غزل بھیج رہی ہوں [illegible] اور میری کہانی کا بھی بتا دیجئے کیا بنا؟ [illegible] اس بار جلدی خط بھیج رہی ہوں لیکن [illegible] سب کا خیال رکھئے گا۔ اللہ حافظ

پیاری [illegible]! آپ کی بہت سراہنے کا بہت شکریہ۔ تبصرہ جلدی آیا اور لگ گیا۔ ہماری کوششوں کو سراہنے کا شکریہ۔ شاعری اس [illegible] اشاعت ہے اور کہانی بھی جلد شائع ہوگی۔



بہت عزیز [illegible] آپ چکوال سے قلم طراز ہیں۔ [illegible] سلامت رہو [illegible] ماشاءاللہ سبحان اللہ۔ [illegible] پڑھ کر دل [illegible] ہو گیا۔ [illegible] آپ نے ہماری تصویر [illegible] 2010 [illegible] آپ کا [illegible] آپ نے [illegible] اللہ [illegible] بھائی کو جنت میں اعلیٰ مقام اور آپ سب اہل خانہ کو صبر [illegible] کہانیاں میں سب [illegible] کاش [illegible]

[illegible] بھائی [illegible] کہانیاں میں [illegible] آپ سب کا [illegible] تمام [illegible] آپ [illegible]۔



[illegible] شریف سے [illegible] قلم طراز ہیں اس بار بھی "[illegible]" کہانیاں [illegible] (31 مئی) [illegible] انہوں نے [illegible] "[illegible]" [illegible] آپ [illegible] کی شریک [illegible] معصوم چہیاں [illegible]

[illegible] ایک [illegible] زندگی [illegible] خواہشات [illegible] ایک [illegible] کہانی [illegible] ایک معیاری تحریر [illegible] صاحب [illegible] مبارک [illegible] اخلاقی [illegible] ایک معیاری [illegible] ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے [illegible] دوستوں [illegible]۔

ہاں صفدر! تبصرہ بالکل درست کیا۔ آپ تو ہمارا بہت انداز سے دیکھتے بھائی ہیں۔



جاوید ہزاری بلوچستان سے اسلم آزاد لکھتے ہیں کاشی چوہان صاحب السلام علیکم! خیریت احوال اس طرح ہے کہ ماہ جون 2014 کا شمارہ میرے سامنے ہے جس سے آپ کی محنت اور کاوش جھلک رہی ہے۔ باقی رائٹرز کی کاوشوں پر تبصرہ کرنے کے لیے میں بغور تحریریں پڑھوں گا تو شاید تبصرہ آپ تک مقررہ وقت تک شاید نہ پہنچ سکے۔ مگر شمیم صاحب کی خواہشات کا سودا، مریم شاہ بخاری کی تحریر ایک ہی رات، پرندہ، مدثر شمیم کی تحریر خواہشوں کا اسیر، ایم اشفاق بٹ کی تحریر کہاں آ کے لئے کارواں پڑھیں اور ان کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا۔ امید ہے کہ یہ حضرات آئندہ بھی اپنی تحریروں کے ساتھ شامل ہو کر اچھی کہانیاں اور دلچسپی بکھیرتے رہیں گے۔ دیگر دوستوں سے معذرت خواہ ہوں کہ وقت کی کمی کے باعث ان کی تحریروں پر روشنی نہیں ڈال سکا۔ باقی ڈائجسٹ کے آخری صفحہ تک میری آنکھیں پاکستان کے بہت ہی مقبول سینئر ادیب جناب محمد شمیم اختر صاحب کی تحریر کے لیے ترس رہی ہیں۔ جو کچھ عرصہ سے نہ جانے کیوں سچی کہانیاں میں نظر نہیں آ رہے۔ آپ نے میری تحریر انتقام شائع کی۔ ورنہ شاید [illegible] تحریر کو قبول کیا گیا۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح حوصلہ افزائی کریں گے۔

جاوید جناب اسلم آزاد! آپ تو آپ ہی ہیں۔ گلے اور شکوے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ سے غلط بات شک کرنے والے کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ آپ کی تحریر پر جو محنت ہوئی ہے اس سے انکار کر سکتے ہیں آپ؟؟؟ اچھا ہوا کہ آپ کو بروقت اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بہرحال ادارہ سچی کہانیاں تمام لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ بلکہ ان کی کاوش کو منظر عام پر لاتا رہتا ہے۔ کسی کا بھی چہرہ درست آپ کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ آپ نے جو گلے شکوے کیے یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ قارئین لکھاری اور ادارہ کے مابین اس طرح کی باتیں معمول کا حصہ ہیں۔ بہرحال آپ کی کاوشیں خوب ہیں اور جس طرح ہم آپ کو سنوار کر پرچے کی زینت بنا رہے ہیں، امید ہے کہ آپ بھی سچی کہانیاں کی ترقی و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے اور صوبہ بلوچستان میں پرچے کی اشاعت و ترقی کے لیے ہمارے شانہ بشانہ قدم بقدم ساتھ رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی کاوش سے بلوچستان میں تحریر اور قاری کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔



ظفر اللہ رند ڈیرہ مراد جمالی سے رقم طراز ہیں، جناب منزہ آتش اور کاشی چوہان صاحب! اللہ آپ کو اور ادارے کو [illegible] سب کو خوش رکھے آمین۔ جون کا پرچہ ہاتھ میں ہے جو کہ 5 جون کو ملا ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ساحل ابڑو صاحب کا اور میرا مشترکہ ایک [illegible] ہے آپ کو بھی پرچہ لیٹ ملتا ہے اور مجھے بھی۔ غلام رسول گل بھائی یہ سچ ہے کہ ہم دونوں قریب رہتے ہیں اور بعض وقت تو ہم پرچہ لیتے آپ کے شہر جا کر رہتا ہوں۔ ہانیہ صفیہ سلطانہ آپ آج کل کہاں غائب ہو گئی ہو اور ثانیہ عثمیٰ صاحبہ آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری شاعری کو پسند کیا۔ احوال میں آپ کا خط پڑھ کر مسرت ہوا اور دل کو سکون ملا اور جن جن لوگوں نے پسند کیا ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ ماہ مئی میں ایک شاعری بھیجی تھی، وہ کیوں شائع نہیں کی۔ انکل جی آپ سچ کہتے ہیں ہم جونیئرز کو چاہیے کہ سینئرز کا احترام کریں اور آپس میں محبت قائم کریں تاکہ نفرت [illegible] اور جناب انکل آپ کا شکریہ دل سے کہ آپ نے فولڈنگ والا سسٹم ختم کر دیا۔ یہ بہت ہی اچھا کیا ورنہ پرچے کا تو وقت سے پہلے برا حال ہوتا تھا۔ اس ماہ منزہ آتش کے ماؤں پر خوب صورت الفاظ پڑھنے کو ملے۔ احوال پر تبصرہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ آتش جاویں اور آگن کو ایک ہی سانس میں پڑھ کر ختم کر دیا۔ بہت ہی خوب اور ملاحظہ ابھی تک زیر مطالعہ ہے۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت خوب ہوں گی۔

جاوید ظفر اللہ رند صاحب! بہت افسوس ہوا کہ آپ نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اس طرح غلط فہمیوں کو ہوا ملتی ہے۔ خدا آپ کو روزگار عطا کرے۔

☆ چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمیں فیصل ندیم بھٹی کا نامہ آیا ہے۔ ماہ جون کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے شمارے کا ٹائٹل اچھا لگا اس کے بعد محترمہ صباء صاحبہ کا اداریہ پر نظر پڑی جس میں ماؤں کے عالمی دن کے حوالے سے پڑھا۔ اس کے بعد کاشی بھیا کی تحریر پڑھنا اچھا لگا پڑھ کر یہ نصیحت حاصل کی کہ ہمیں ان تحریروں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ احوال میں خطوط میں نئے دوستوں کی آمد خوش آئند ہے اس کے بعد مطالعہ میں عورت کی مکاری ظاہر ہوتی ہے اور خواہشات نا آسودہ کی بن لیٹری کی کہانی بہت دکھی کر دینے والی ہے۔ مریم شاہ بخاری کی ایک ہی رات، بہت ہی اتفاقی کہانی ہے بہت پسند آئی۔ خار زار ہے زندگی، انتقام، پانچ پریاں، خواہشوں کا اسیر، امر بیل اچھی کہانیاں ہیں۔ نسیم سحر کا ادھوری محبت بہت اچھی ہے۔ عادل حسین کی نینا بھی اچھی ہے مردوں کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکی کا انجام۔ آتش جنوں نسیم فاروقی کا عروج کے مراحل میں ہے۔ مشتاق ارشد خان کا شاہکار بھی کمال ہے۔ شازیہ گل کی کہانی نکھر سونی بھی بہت ہی خوب صورت کہانی ہے۔ ممتاز بھیا کو عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مسعود شاہد بھائی کیسے مزاج ہیں۔ جعفر حسن آپ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ عبدالعزیز بلی آپ کا شکریہ احوال میں خط بہت ہی دلچسپ سے لکھتے ہیں۔ مسعود انور علی کی بہت شکریہ کہ آپ نے زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی کی دعا دی۔ سرگودھا سے صائمہ شاہین صاحبہ آپ کیوں غیر حاضر ہیں اس ماہ کوئی مصروفیت؟ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ رمضان کے صدقے ہمارے ملک پاکستان اور خصوصی طور پر کراچی میں امن کی فضا قائم ہو آمین۔ کاشی بھیا اب تو کہانی شائع کر ہی ڈالیں۔

☆ فیصل! امید ہے بہت جلد تم بھی اپنی کہانی کے ذریعے پہچانے جاؤ گے۔ تبصرے کا شکریہ۔

☆ چک نمبر 6 ضلع ننکانہ صاحب سے رضوان احمد آرائیں بھی پہلی مرتبہ محفل میں رقم طراز ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب امید ہے کہ آپ، محترمہ نسانہ سحر مرزا، محترمہ عذرا صباء مرزا اور ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ سچی کہانیاں کی اس محفل ''احوال'' میں پہلی مرتبہ حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مطالعہ کی حد تک سچی کہانیاں سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ احوال کی اس خوب صورت محفل میں کبھی کبھی دیکھ کر دل کیا کہ میں بھی اس محفل میں شرکت کروں۔ امید ہے کہ میری حاضری کو قبول کرتے ہوئے محفل میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔ جون کے شمارے میں سے ''ایک ہی رات، پانچ پریاں، امر بیل، نینا کی جستی ہے، اپنا پرایا کاش رہی ہوں، نکھر سونی نصیب کی بارش، ادھوری محبت، امانت اور بھرم ٹوٹ گیا'' بہت اچھی تھیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں مشتاق اور آتش جنوں اچھی جا رہی ہیں۔

☆ رضوان آپ کی پہلی آمد اچھی لگی اب آتے جاتے رہنا۔

☆ عامر بن عامر بورے والا سے لکھتے ہیں۔ قابل قدر رخسانہ آپی، عذرا آپی اور پیارے کاشی آداب جون کا خوب صورت ٹائٹل سے سجا تازہ شمارہ پڑھ کے دل خوش ہو گیا۔ عذرا کا ممتا کی شان میں گراں قدر الفاظ ماں کی عظمت اور شفقت اور بے لوث محبت کا اچھا پیغام ہے۔ کاشی بھیا باتیں تو ہمیشہ اچھی باتیں لگتی ہیں۔ محمد اسمٰعیل بروہی خداوند کریم بھائی مرحوم کے درجات بلند کرے اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) تانیہ بھٹی، سلمیٰ سید، ایم بی قریشی خوش آمدید۔ اس کے علاوہ احوال میں جن کے خطوط اچھے لگے ان میں عظمیٰ شکور، مسعود انور، فیصل ندیم بھٹی، میر پرویز احمد، داؤ فریدی، ممتاز احمد، عشی عزیز سے اور اسامہ ندیم وامق۔ اب کی بار ہمارا خط احوال کے آخر میں جگہ کا مریم ہے۔ تحسین آباد سے لگاتار بلیک لسٹ ہی کر دیا ہمیں تو گلہ بھی تو اپنوں سے ہوتا ہے بہرحال خوش رہیے۔ م۔ س۔ ساگر کی مطالعہ خواہشات نا آسودہ، ایک ہی رات، امر بیل کی خار زار ہے زندگی، قتیل احمد کی پانچ پریاں، خواہشوں کا اسیر، سویرا فلک کا بھرم، امر بیل، ماہ فروزاں کی معصوم پہچان، نغیسہ فضل کی شریک سفر اور آتش جنوں کی 27 ویں کڑی زبردست رہی۔

شائستہ میرزا رضوی کی سلونی، اشفاق احمد بٹ کی کہیں آگے ملتے محبت کے کارواں، ادھوری محبت نسیم سحر، حسن کی سزا تو پہلی قسط بھی حسب سابق اچھی لگی۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی نصیب کی بارش، عادل حسین کی تنہائی بھی چلتی ہے، شگفتہ انجم طارق کی اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، عجوبہ داستان، عابد حسین کی پسند اپنی اپنی، عروبہ عرفان کی تشبیہ جنت نظیر، نصرت سرفراز کی امانت، شازیہ گل کی کہانی بھی زبردست رہی۔ تحسین آباد میں اب کی بار ہمارے نام کا ایک بھی پھول نہیں ہے۔ تمیر رضوی، عادل حسین عادل، ثمینہ ناز، نگہت اکرم، ڈاکٹر صفیر احمد اور شائستہ جمال کی شاعری داروں سے تر چھوٹی مجیر اعجاز ملک کی سنگ ملامت شاہکار تحریر ہے۔ تمام قارئین، رائٹرز اور اہل قلم احباب کے لیے پرخلوص دعائیں، بڑے بھائی عبدالغفار عابد، عشی عزیز، میر پرویز احمد رولو، سعدیہ انور، نگی شور کے لیے سلام خلوص۔

☆ عامر زمان عامر لیجیے آپ کا مراسلہ شامل احوال ہوا، اپنا بہت خیال رکھنا۔

▒ اعجاز احمد راعیں، کراچی سے شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں محترم کاشی چوہان صاحب۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ، محترمہ رخسانہ سہام مرزا، محترمہ منزہ سہام مرزا اور ماہنامہ "سچی کہانیاں" کا تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ حسب وعدہ احوال کی اس ہنستی مسکراتی محفل میں حاضر ہوں۔ بے شمار پرانے چہرے غائب ہیں، نئے نئے چہرے جگمگا رہے ہیں۔ پرانے ساتھیوں کو نہایت محبت و الفت اور دل کی گہرائیوں سے گزارش ہے کہ واپس آ کر اس محفل کو روشن کریں اور تمام نئے ساتھیوں کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ طویل عرصے تک غیر حاضری کا مجھے سخت افسوس ہے۔ اس کوتاہی کے ازالے کے لیے اب انشاء اللہ باقاعدگی سے حاضری کی کوشش کروں گا۔ جون کا شمارہ ملا، حسب معمول تمام قلمکار اپنی اپنی تحریروں کے ساتھ انصاف کرتے نظر آئے۔ سچی کہانیاں کی کامیابی اور بڑھتی ہوئی کا راز ہے۔ جون کے شمارے میں سے علاوہ ایک ہی راستہ، پانچ بوند پانی، امر بیل بھی خوب تھی۔ اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، بکھرا موتی اور بھرم ٹوٹ گیا بہت اچھی تھیں۔ سلسلے وار کہانیاں حسب معمول ٹھیک جا رہی ہیں۔ خدمت خلق کے لیے مسئلہ اپنی مثال آپ ہے۔ سچی کہانیاں کی کامیاب اشاعت پر آپ سب کو اور تمام اسٹاف کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد اور سب کو بہت بہت سلام قبول ہو۔

☆ بھائی اعجاز! لیجیے آپ کا تبصرہ شامل اشاعت ہوا۔ آپ کی احوال میں باقاعدگی اچھی بات ہے۔

▒ بشریٰ سعید احمد، لاہور سے مخاطب ہیں، سچی کہانیاں سے وابستہ سب کو میرا سلام۔ روحانی نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر کہانی ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔ جاوید ماتی صاحب کی تحریر جلوہ جنوں سچ میں ایک بہترین شاہکار تھی اور کمالات کی تھا۔ ایک بار جو پڑھنا شروع کی تو آخر تک ایک طلسم میں جکڑی رہی۔ نیتوں جلو سرکار بھی بہت اچھی تھی "مقتل" "کفن" ہوئی بہت زبردست تحریر تھی، منتظر کدہ ہے جہاں، یاسر حسین شاد کی روحانی نمبر کی خاص کہانی تھی جس کی بہت خاص تھی شروعات سے آخر تک الفاظ کا انتخاب بہت ہی خوب صورت تھا خاص طور پر وہ حصہ جہاں سمندر سے کوئی آواز طلب ہو کر پوچھتی ہے "تو وہ انگلی رکا کرتا کہ تو کہاں ہے" سے لے کر "پھر تھکتا کیوں نہیں" تک سارا ہی بہت ہی خوب صورت سے لکھا گیا ہے جیسے ایک لڑی میں موتی پروئے ہوں آج کل کچھ طبیعت خراب ہے اس لیے ابھی سارا ڈائجسٹ نہیں پڑھا۔

☆ بشریٰ جی! آپ کی محبت کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا مگر پھر بھی یاد کرنے کا بہت شکریہ۔

▒ شاہد فراز۔ حیدرآباد سے اپنی محبت کے پھول دے رہے ہیں، لکھتے ہیں پیارے بھائی کاشی چوہان السلام علیکم! محترمہ منزہ سہام کا اداریہ (ممتا) بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ اپنی باتیں آپ کے قلم سے ہمارے دل تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ گئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ گیارہ سچ بیانیاں، تین شعلہ سامان تحریریں اور ناگن، کلکی اور آتش جنوں سے سجا جون کا رسالہ میرے سامنے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کون سی کہانی پڑھوں۔ معاشرے کے

چونکہ میں اپنے بچپنے میں ہی کہ دو سال سے صرف دوں کی پڑھ رہا تھا اب اس دور تک کی نسل پڑھ نہیں پاتا لیکن میں ماہانہ رسالوں کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔ بھائی ظاہر دل میں خیریت ہوں امید کرتا ہوں آپ بھی خیریت سے ہوں گے جو مجھے آپ کا ادارہ انکل مہر انور ہیں جن سے تعارف ہوا آپ کے بہت سے دوست اشفاق بٹ آپ کا چند دنوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ پرانے ادا لیں سے اتنا سب کی کمی بھول کر بھی نہیں آ جاتا اور دوستوں کی محفل میں بہت سارے دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ

☆ شاہد! آپ آئے ہو تو ہمارا آنچل بھی انشاء اللہ کافی بہترین ثابت ہوگا۔

☆ نیر رضا رضوی کراچی سے لکھتے ہیں محترم جناب کاشی چوہان صاحب السلام علیکم دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سچائی لکھنے والوں کو سچی کہانیوں کے تمام ممبران کو اور تمام قارئین کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) گزشتہ شمارے میں اپنی تحریر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن شعر اول کی کا افسوس بھی ہوا بہر حال بہت شکر گزار ہوں کہ میری تحریر بھی سچی کہانیاں کی زینت بنی ایک تحریر اور رسال کر رہا ہوں اس امید پر کہ جلد شائع کریں گے۔ نہایت ممنون و مشکور رہوں گا۔

☆ بھائی نیر! آپ کے خط سے آپ کی سچی کہانیاں سے محبت ثابت ہوتی ہے ۔۔۔؟؟



☆ ثمینہ بشریٰ لاہور سے اس محفل میں شریک ہیں لکھتی ہیں السلام علیکم کاشی بھائی امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا اور اللہ کریم ہمیشہ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے (آمین) رسالے کا اتنا اچھا معیار اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بہت محنت اور خلوص سے کام کر رہے ہیں اللہ آپ کی محنت میں برکت دے۔ جون کا شمارہ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ اور اگر آپ پچھلے دس سال کے ٹائٹل دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کوئی عرصے سے ٹائٹل ایک جیسا ہی آ رہا ہے۔ صرف ماڈل کا چہرہ چھاپ دیا جاتا ہے۔ بھائی پلیز ٹائٹل پر بھی توجہ دیں۔ سچی کہانیاں بھی نظر آ رہی ہے۔ تحریریں سب کی بہت عمدہ تھیں۔ اللہ پاک سب کے قلم میں اضافہ اور لکھنے میں نکھار پیدا کرے (آمین) حمایت علی شاعر کا ایک پاکیزہ بیان اور ریاض احمد کی تحریر بھی جنتی ہے "یہ سب تحریریں دل کی تھیں۔ بہترین رہا۔ عمدہ بہت مشہور اقبال کی عمدہ تحریریں تھیں۔ روحانی نمبر میں شائع ہونے والی میری کہانی "بے سہارا مہمان" کی بھائی نے جس انداز میں تعریف کی ہے اس سے میرا حوصلہ بڑھا یا ہے اس پر ان کا بہت بہت شکریہ تمام ساتھیوں کو سلام اور دعا کیں اور مجھے بھی سب اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گا۔

☆ محترمہ بشریٰ! آپ احوال میں تو آگئیں۔ بہت بہت شکریہ! آپ کی تجویز پر عمل کریں گے۔

☆ ڈاکٹر طارق محمود آکاش۔ ڈسکہ سیالکوٹ سے تشریف لائے ہیں آپ کی بزم میں کئی بار شرکت کر چکا ہوں اور یہ سب کاشی بھائی کی محبت کا نتیجہ ہے۔ کہ جون کے شمارے میں احوال پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس میں تو بہت سے جانے پہچانے اور محبت کرنے والے دوست اور ساتھی موجود ہیں۔ آپا فریدہ جاوید فری، اشفاق بٹ اور بہت محبت کرنے والے انکل عبدالعزیز کی آمد بھی آپ کی بزم میں موجود ہیں سب کو بہت بہت سلام۔ محترمہ سلام اور ادارہ "ممتاز" اور کاشی چوہان کی لکھائی باتیں پڑھ کر تبصرے کا آغاز کیا۔ سچی کہانیاں میں موجود کہانیاں پڑھ کر سمجھ نہیں آتی کہ کس کہانی کی زیادہ تعریف کی جائے کیونکہ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ عالمہ ایک سچی داستان، اور یہ زندگی کی خواہش کا ادارہ بہت اچھی تحریریں تھیں۔ سلسلہ وار تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ آپ احوال میں وہاں حسین، عفیف ریاض، مرزا یاسر، ہیپ انجمت اکرم ملک، ذاکر حسین کے کلام پسند آئے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! اب تو گلہ نہیں ہے نا کوئی اور ہاں دیکھئے ہم نے آپ کی محبت کا مان رکھا اب آپ کا فرض بنتا ہے کہ احوال میں ہر ماہ حاضر ہوں۔

☆ اشفاق شاہین کراچی سے ایک طویل عرصے بعد شامل احوال ہیں لکھتے ہیں بہت عرصے بعد دوبارہ لکھ رہا ہوں۔ اپنی کہانیاں سچی دوستوں کے کہنے پر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ دوست مجھے بھولے نہیں ہوں گے۔ کئی ایک پرانے دوست اب بھی براجمان ہیں ادبی حسین ہیں تو تعداد کم بھی ہیں عبدالعزیز کی آمد پر بھی ہیں ماہر زماں عامر ہیں تو مسز ذوہیب بھی ہیں عزیز نے اور فریدہ فری ہیں، دوستوں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ حاضری باقاعدہ ہو۔

سہیل خان! ایسا میرے ساتھ بھی ہوا اور آپکا احباب کے تاثر یاد رہنے کی وجہ سے طبیعت کی اختیار نہ ہو پڑی تھی شکریہ والا احوال ملاحظہ فرمائیں کیجیے ارشاد، گنجائش دل میں پیدا کیجیے، بیت خالی مت کیجیے گنجائش بڑھائیے۔ عبدالعزیز ملک! آپ بہت خوب لکھتے ہیں آپ، تنقی پیاری بات کی کہ تصویر ہمیشہ فریش دیتا، ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں آپ۔ خوشی عزیز منٹ! سیاست کو بار بار باقی تمام لوگ بھی تمہارے اپنے ہی ہیں ہمارا دل تو مت دکھانا، رمضان صفدر حیدری بہت خوب صورت تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ عامر زمان عامر نے بھی بہت پیارا لکھا۔ شہزادہ، تہمت اکرم، میر نسیم بہت با کمال شاعری کی آپ نے، آتے ہیں کہانیوں کی طرف آتش کا علیم قدوسی نے کمال کا لکھا۔ حالانکہ میں ساحلی کی خواہشات اور سورو ایک نئی داستان خاندان ہے زندگی کا انتقام شریک سفر خوب صورت سچی کہانیاں تھیں۔ سلونی بھی بہت بہترین مرد کہانی تھی۔ اشفاق بٹ نے بھی خوب لکھا۔ نگین اور مصطفیٰ سے کہیں ابھی انسیت نہیں ہوئی۔ شفقت سلمان تحریروں میں نصیب کی بارش اور اپنا یہ پاکباز رہی دونوں بہت خوب۔ ہینڈ اپنا پنا عابد حسین نے بہت پیارا لکھا اور پردیسی کہانیوں میں محمد رمضان کی جنت نظیر میرا کشمیر بہت خوب صورت رہی۔ کاشی بھائی! آپ اور دیگر احباب نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی ضرور حاضری دیں گے تمام احباب کو بہت سلام اور عرض اور تمام دوستوں کے لیے نیک دعائیں ایک شعر کے ساتھ۔

نفس کو آنچ پہ اور وہ بھی عمر بھر رکھنا
بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا

٭٭ اشفاق شاہین خوش آمدید! اقبال کا شعر تو یاد ہے نا تو مجبوروں پر داستانیں ہوئے، آخر ان پر نظر رکھا کریں۔ امید ہے اب باقاعدہ ہمارے ساتھ رہو گے۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

٭٭ فریدہ عالم۔ کراچی ٭٭ سعید عالم۔ کراچی ٭٭ وحید عالم۔ کراچی ٭٭ ذیشان صفدر۔ حیدرآباد ٭٭ مریم یوسف۔ بٹ خیلہ ٭٭ مصباح علی۔ مظفر گڑھ ٭٭ حلیم صدیقی۔ فیصل آباد ٭٭ ریاض صدیقی۔ میر پور خاص ٭٭ رضوانہ۔ ملتان ٭٭ امیر انیس۔ کوئٹہ ٭٭ الیاس غنی۔ سوات ٭٭ اور ولی زمان۔ پشاور

٭٭ پیارے ساتھیو! ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک کا پتہ: بیسمنٹ جعفری فلیٹ نمبر: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی

نوٹ: قارئین اور ہمارے دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے وطن سے، اپنے شہروں سے موصولہ وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

کوئی اپنا نہ رہا	وقاص حسین	زمینداری نظام کے ظلم کی شکار ایک عورت کی داستانِ الم
کسے الزام دوں؟	زرینہ جونیجو	لالچی ماں کے ستم کی ماری ایک بیٹی کی عبرت خیز کہانی
کلموہی	غزل قریشی	ایک مرد کے چنگل سے آزادی حاصل کرنیوالی عورت کی داستان
مہراں	کشور وسیم	معاشرے کے ظلم کی شکار ایک عورت کی دکھ بھری کہانی
اپنے ہی دام میں	صفدر عباس اعوان	سوتیلی ماں کے کھودے گڑھے میں گرنیوالی بیٹی کی داستان
مرد	محمد عرفان	اضطراب سے بھرا ایک مرد کی روح میں اترتی داستانِ عجب۔
زخموں کا مداوا	محمد عزیز مئے	ماں باپ کی غیرت کو تیاگ کر گھر سے بھاگنے والی عورت کی کہانی
سب جائز ہے	عبدالغفار عابد	دولت کی ہوس میں گھری ایک عورت کی عبرت خیز کہانی
حیاتِ جاوداں	محمد علی سدوزئی	دہشت گردی کا شکار ہونیوالے ایک سپاہی کی زندہ کہانی
وہ باتیں تیری	عائشہ وسیم	کراچی سے اپنے نانا کی یاد میں ایک محبت نامہ

پہلی سچ بیانی

کوئی اپنا نہ رہا

وقاص حسین

زمینداری سسٹم کی شکار ایک عورت کی داستانِ حیات

"آپی...... آپی......" میں چھوٹے بھائی کی آواز پر کمرے سے باہر نکلی۔

"کیا ہوا کیوں شور مچا رہے ہو......؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "آپی...... آپی وہ...... وہ۔" اس کا خوف سے چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

"اب بول بھی دو کیا ہوا ہے؟" میں نے زور دے کر کہا۔

"وہ...... آپی...... مریم آپی کا قتل ہو گیا ہے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب جو اس نے کہا میرا وہم ہے، پھر میں نے بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر تصدیق کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"کیا کہا تم نے۔"

وہ کہنے لگا۔ "وہ...... آپی...... مریم آپی کا قتل ہو گیا ہے۔ اس کا بھتیجا ہے نا چھوٹا، وہ پستول سے کھیل رہا تھا کہ اس سے اچانک گولی چل گئی، جو سیدھی آپی مریم کو جا لگی۔" مجھے ایسا لگا جیسے زمین گھوم رہی ہے اور آسمان ابھی میرے اوپر آ گرے گا۔ زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے تھے۔ یہ خبر سن کر تو میں ہل بھی نہ پا رہی تھی۔ میرے وجود سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی اور پھر میں اسی جگہ پر بیٹھتی چلی گئی۔

"وہ نہیں مر سکتی...... ابھی تو وہ بہت خوش لگی تھی یہاں سے، مجھے تو خوش خبری سنا کر گئی تھی وہ۔ ابھی تو اسے جینے کا سہارا ملا تھا، نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مر سکتی۔" میں بے یقینی کی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔ بھائی نے جب میری یہ حالت دیکھی تو گھڑے سے پانی بھر لایا، جسے پی کر میں کچھ سنبھلی تھی۔ جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں فوراً مریم کے گھر کی طرف بھاگی۔ میں جب حویلی کے گیٹ پر پہنچی تو پولیس کی گاڑی باہر کھڑی تھی۔ میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ سامنے صحن کے درمیان میں اپنے نازک سے وجود کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے بے جان جسم پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ جب میں اس کی طرف بڑھی تو ایک پولیس والے نے مجھ سے کہا۔ "بی بی آپ اس کے پاس نہیں جا سکتیں۔"

آنسوؤں نے میری آنکھوں کے سامنے کا منظر دھندلا دیا تھا۔ مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تو اس کی چیخیں سن رہی تھی۔

"مجھے اس کے پاس جانا ہے، مگر وہاں......" اس

[illegible]



[illegible]

کو بغاوت کی سزا موت کی صورت میں مل گئی تھی۔ آج دولت نے پھر ایک اور جان لے لی اور یہ بتا دیا تھا کہ آج بھی دولت اور جائیداد ہر رشتے اور ہر ناتے سے اونچا مرتبہ رکھتی ہے۔

مریم میری بچپن کی سہیلی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی اور گھر میں سب بہن بھائیوں سے چھوٹی بھی تھی۔ اس سے بڑے اس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ باپ اس کا ویسا ہی تھا جیسے زمیندار ہوا کرتے ہیں۔ ظالم اور مغرور تکبر والا، ہاں! اس کی ماں بہت اچھی، رحم دل اور نرم مزاج عورت تھی۔ چونکہ ہمارے گھر بھی زیادہ دور نہیں تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بہت تھا۔ وہ تین سال کی تھی، جب اس کی امی وفات پا گئی تھیں، مریم پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور وہ بہت ذہین بھی تھی۔ ہم نے گاؤں کے اسکول سے ہی مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مڈل پاس کرنے کے بعد اسے آگے پڑھنے کی اجازت ملی اور نہ ہی مجھے، کیونکہ مڈل سے آگے پڑھنے کے لیے گاؤں میں اسکول نہ تھا، بلکہ اس کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں نے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ پڑھائی سے فراغت کے بعد پہلے سے زیادہ وقت ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ ہم دونوں ہی قرآن پاک کی طالب تھیں، جب اس کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی۔ جب بارات آئی تو میں نے دیکھا تھا کہ اس کی بہن کا دولہا اس کی بہن سے دوگنی عمر کا تھا۔ میں نے جب مریم سے کہا کہ یہ تو آپی سے دوگنی عمر کا ہے تو وہ ہنس کر چپ ہو گئی تھی، اور پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔ "تم کو تو پتا ہے کہ ہم جٹ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے، چاہے لڑکی گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائے۔ تم کو میری پھوپو اللہ رکھی تو یاد ہی ہوں گی۔" وہ کہنے لگی تو میں نے کہا۔ "ہاں! مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ ہی نہ جو چھ سات سال پہلے فوت ہوگئی تھی۔" اس نے مجھے بتایا۔

"ہاں..... ہاں وہی، وہ فوت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔"

"وہ کیوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ پہلے تو ابا نے اس کا رشتہ نہ کیا، کیونکہ برادری میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ پھر پھوپو سے پندرہ بیس سال چھوٹے لڑکے سے رشتہ طے کر دیا۔ پھوپو نے بہت انکار کیا، مگر ابا نہیں مانے اور آخر تنگ آ کر انہوں نے اسپرے پی کر خودکشی کر لی۔ اس طرح کے بہت سے قصے ہیں ہماری برادری میں۔ پہلے لڑکا برادری کا ہو، پھر دولت مند ہو، پھر چاہے عمر زیادہ ہو یا وہ شرابی ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ آدمی ابو کا دوست ہے۔ اس کی پہلی بیوی فوت ہو گئی ہے، دوسرے یہ گاؤں کا زمیندار بھی ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابو نے اپی کا یہ رشتہ طے کیا ہے اور تم کو ابو کا تو پتا ہے نا.....!" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

اس دن مجھے بہت دکھ ہوا، اتنی خوب صورت آپی اور ان کے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی۔ اس دن میں نے دل سے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ہم دولت مند نہیں ہیں اور میرے والد بھی ایسے نہیں ہیں۔ اسکول چھوڑے ہوئے ہمیں چار سال ہو گئے تھے۔

جب مریم کا والد ہارٹ اٹیک میں فوت ہو گیا تو اس دن کسی کو بھی اس کے مرنے کا کوئی زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا، بلکہ گاؤں والوں نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا کہ مر گیا جان چھوٹی۔ "خس کم جہاں پاک۔"

مریم کے دونوں بھائی بھی اپنے والد کے ہی نقش قدم پر چل رہے تھے اور وہ بھی اسی طرح ہی کے تھے۔ اس کے باپ کے مرنے کے چھ مہینے بعد کی بات ہے جب اک دن وہ ہمارے گھر آئی تو بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔

"جناب خیریت تو ہے نا۔ آج تو آنکھوں میں چاند چمک رہا ہے، ستاروں کی سی روشنی بکھری ہوئی ہے دیدوں میں جناب کے۔" میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

"بولو کون ہے وہ..... بولو..... بولو..... کون ہے وہ....." میں نے گدگداتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے اس کو دیکھ کر یہ ہی لگا تھا کہ یہ لڑکی کسی کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے اور پھر اس نے بھی شرماتے ہوئے ایک نام لیا تھا۔

"سرفراز۔" یعنی کے میرا شک درست نکلا تھا۔

"یہ کب سے چل رہا ہے جناب اور مجھے آج خبر ہو رہی ہے؟" میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"چل تو بچپن سے رہا ہے مگر قول و قرار آج ہوئے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑی ہی چھپی رستم نکلی تم تو۔" میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ہے بلکہ سب سے پہلے تم کو ہی بتایا ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

سرفراز ہمارے ہی گاؤں کا تھا۔ وہ میری ہی طرح ایک نارمل گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک ذہین اور خوبصورت لڑکا تھا اور وہ شہر میں رہ کر پڑھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایف اے کر رہا تھا۔ اس لیے وہ ایک دو ماہ بعد گاؤں کا چکر لگاتا تھا اور پھر جب بھی سرفراز گاؤں آتا تھا۔ مریم سے اس کی ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس محبت کی جڑیں پھیل رہی تھیں اور اب وہ بہت گہرائی میں چلی گئی تھیں۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئی تھیں۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور پھر شاید ان کی محبت کو کسی کی نظر لگ گئی۔ محبت کا جو کام ہوتا ہے اس نے وہ شروع کر دیا۔

"آپی..... آپی۔" چھوٹے بھائی نے مجھے دو تین آوازیں دیں، پھر کہیں جا کر میں اپنے خیالوں سے باہر نکلی۔

"آپی..... وہ آپی مریم کو لے آئے ہیں۔" میں اپنے کمرے سے باہر نکلی اور پھر منہ ہاتھ دھویا اور چادر لے کر مریم کے گھر کی طرف چل پڑی۔ اب بھی سفید چادر سے اس کا وجود ڈھکا ہوا تھا۔ اسے میں دیکھ کر دیوانوں کی طرح اس کی طرف دوڑی تھی۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ ہماری دوستی کتنی پکی تھی۔ گاؤں کی عورتیں ہماری دوستی کی مثالیں دیتی تھیں۔ جب ہم اس کو نہلانے لگے تو ہم نے اس کے جسم پر نیل پڑے ہوئے دیکھے۔ کیا یہ نیل اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے؟ اس کے دل میں گولی ماری گئی تھی، مگر یہاں کوئی کیا کر سکتا تھا اور پھر مریم کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

میری جان سے پیاری میرے دکھ سکھ کی سہیلی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ.....

پہلے وہ ہمارے گھر روز آتی تھی پھر دو تین دن سے وہ نہیں آئی تھی اور مجھے بھی ٹائم نہیں ملا تھا اس کے پاس جانے کا، پھر میں چوتھے روز صبح ہی صبح اس کے گھر چلی گئی۔ اس کی دونوں بھابیاں باہر صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں، لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس کی بھابی سے پوچھا۔

"مریم کہاں ہے۔" تو انہوں نے بڑی تلخی سے کہا۔

"اندر ہوگی مری ہوئی، دیکھ لو اس کے کمرے میں، وہاں ہی ہوگی اور سمجھ میں اس کو عقل بھی دو کہ ہم اس کا برا نہیں چاہتے، اس کا بھلا ہی سوچ رہے ہیں اور اس کو یہ بھی سمجھاؤ کہ جتنا مرضی چاہے رو پیٹ لے، شادی اس کی وہاں ہی ہونی ہے جہاں....." اس کی چھوٹی بھابی نے غصے سے کہا۔ میں پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر جب میں اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اپنا بازو اس نے آنکھوں میں رکھا ہوا تھا اور سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"ارے مریم..... مریم کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو تم اور یہ تمہاری بھابی کیا کہہ رہی ہے؟" وہ مجھے دیکھ کر بیڈ سے نیچے اتری اور مجھ سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

"میں یہ شادی نہیں کر سکتی..... میں سرفراز کے بغیر مر جاؤں گی۔"

کیا ہوا ہے پہلے یہ تو بتاؤ مجھے..... اس نے پھر زور زور سے روتے ہوئے کہا۔

"میں مر جاؤں گی مجھے بچا لو۔"

"ایسا نہ کہو۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اسے روتا دیکھ کر اب میرا دل بھی گھبرا رہا تھا اور میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے تھے۔

"اچھا اب بتا بھی دو آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"چھوٹی بھابی اپنے تایا کے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی ہے۔ وہ نشہ کرتا ہے، شراب پیتا ہے، لیکن اس کے باوجود بھائی بھی شادی کے لیے مان گئے ہیں۔ انہوں نے بھی

انکار نہیں کیا یہ جانتے ہوئے بھی، بلکہ بھائیوں نے خوشی خوشی ہاں کر دی اور اگلے مہینے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی ہے، پھر مجھ پر گھر سے نکلنے پر بھی پابندی لگا دی ہے۔" وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑی۔

"تم نے سرفراز کو بتایا ہے یہ سب۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بتایا میں نے، کیسے بتاتی میں اس کو؟"

"وہ تو آپی کو بھی فون نہیں کرنے دیتے۔ تم میرا ایک کام کرو۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو..... تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"تم ایسا کرو کہ سرفراز کو یہ ساری صورت حال بتاؤ اور اس سے کہو وہ مجھے فوراً آ کے ملے۔"

میں نے گھر آ کر سرفراز کو فون کیا اور حالات کے بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگا۔ "اس کو کہہ دو کہ وہ بالکل فکر نہ کرے، میں شام تک آ رہا ہوں۔" میں نے جا کر مریم کو بتایا کہ سرفراز نے کیا جواب دیا ہے اور پھر وہ اسی شام کو آ گیا۔ اس نے آ کر مجھے فون کیا اور بتایا کہ "میں آ گیا ہوں اور مریم سے کہو کہ کل دوپہر کو وہ گنے کے کھیت کے قریب جو شہتوت کا درخت ہے وہاں آ کر مجھے ملے۔"

اگلے دن صبح کو میں اس کے گھر گئی اور اس کو سرفراز کا پیغام دے دیا۔

"ٹھیک ہے، میں دوپہر کو آؤں گی جب بھابیاں سو جائیں گی، پھر ہم اکٹھے چلیں گے۔" اس کے بعد میں اپنے گھر آ گئی اور دوپہر کا انتظار کرنے لگی، اب دیکھو مریم کیا فیصلہ کرتی ہے اور کیا کرتے ہیں اس کے گھر والے..... میں آنے والے حالات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

دوپہر کو مریم ہمارے گھر آ گئی۔ میں نے امی کو بتایا کہ میں مریم کے ساتھ جا رہی ہوں، تھوڑا سا کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک واپس آتی ہوں۔ گھر سے نکل کر ہمارا رُخ کھیتوں کی طرف ہو گیا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے کوئی بھی کھیتوں میں نہیں تھا۔ ہم چلتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں پر ہمیں ملنا تھا۔ سرفراز پہلے سے وہاں پر موجود تھا۔ مریم بھاگ کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ سرفراز نے اس کو دلاسا دیا تو وہ چپ ہو گئی پھر وہ دونوں جا کر درخت کے نیچے سائے میں بیٹھ گئے اور میں ان سے تھوڑی دور کے فاصلے پر جا کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں مریم کا فیصلہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہے؟ کل تک تو کہہ رہی تھی کہ میں سرفراز کے بغیر مر جاؤں گی اور آج کہہ رہی ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ جہاں پر میرے بھائیوں نے رشتہ کیا ہے تو میں وہاں پہ ہی شادی کروں گی۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتی مریم۔" سرفراز کہنے لگا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گا، مجھ پر کچھ تو ترس کھاؤ۔"

"میں تمہارے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔ میں اپنی محبت کی خاطر اپنے بھائیوں کی عزت نیلام نہیں کر سکتی۔ میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ سکتی ہوں، مگر اپنے بھائیوں کی عزت کا جنازہ نہیں نکال سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں تمہارا ساتھ اب مزید نہیں دے سکتی۔" مریم سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کون سے بھائیوں کی بات کر رہی ہو تم۔" سرفراز تلخ لہجے میں کہنے لگا۔

"جن کو تمہارا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ جو ایک شرابی سے تم کو بیاہ رہے ہیں، تم ان کی عزت کی بات کر رہی ہو۔ جن کو تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کو اگر واسطہ ہے تو صرف تمہارے حصے کی زمین سے۔ وہ اسی لیے تمہاری شادی ایک شرابی سے کر رہے ہیں، تاکہ وہ زمین میں سے تمہارا حصہ نہ مانگے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے صرف تم میرے ساتھ چلو ابھی اور اسی وقت۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی سرفراز، کوئی بھی وجہ ہو، کچھ بھی ہے، مگر میں مجبور ہوں۔ تم مجھے بے وفا سمجھو یا کچھ اور مگر میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، ہو سکے تو تم مجھے معاف کر دینا۔" اس نے سرفراز کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا اور اٹھ کر چل پڑی۔ سرفراز کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل رہے تھے۔ وہاں سے ہم گھر آ گئے اور پھر مریم کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد جب پہلی بار مریم سے میں ملی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیسی ہو.....؟ اور تمہارے شوہر کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"اب تک تو سب ٹھیک ہے۔" پھر کچھ رک کر وہ کہنے لگی۔

"آگے خدا بہتر جانے۔"

"اللہ پاک بہتر ہی رکھے۔" میں نے اس سے کہا۔ پھر وہ چلی گئی۔

اس کے پندرہ بیس دن بعد جب وہ پھر مجھے ملی تو جو کچھ اس نے مجھے بتایا، مجھے جان کر بڑا دکھ ہوا۔ اب اس کے شوہر نے اپنی اصلیت دکھانی شروع کر دی تھی۔ مریم نے مجھے بتایا کہ ..... "اب وہ نشہ کر کے آ جاتا ہے اور جب میں کچھ کہتی ہوں تو مجھے غلیظ قسم کی گالیاں دیتا ہے، ساس سسر بھی اسے کچھ نہیں کہتے۔ میرے پاس جتنے بھی پیسے تھے سب کے سب وہ لے گیا اور اب وہ اور بھی مانگتا ہے۔ میں جب انکار کرتی ہوں تو گالیاں اور مارتا بھی ہے۔ اب میں کہاں سے پیدا کروں اس کے لیے پیسے؟ کہاں سے دوں اس کو نشہ کرنے کے لیے روپے۔" وہ مجھے اپنے دکھ سنا سنا کر روتی رہی اور پھر واپس چلی گئی۔

تین ماہ بعد جب وہ دوبارہ مجھے ملنے کے لیے آئی تو پھر مجھے پتا چلا کہ در حقیقت ایک شرابی اور نشئی سے شادی کرنے کی اصل وجہ کیا تھی؟ سرفراز نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ سب کچھ زمین کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ نشئی سے شادی کرنے کی وجہ دراصل وہ 36 ایکڑ زمین ہی تھی، جو مریم کے حصے میں آئی تھی۔ مریم کے شوہر نے بھی اسی زمین کے لالچ میں شادی کی تھی۔

مریم کے بھائی کا خیال تھا کہ شرابی کبابی سے شادی کر دینے سے وہ حصہ نہیں مانگے گا، لیکن نتیجہ ان کی سوچ سے بالکل الٹ نکلا۔

مریم کے شوہر نے اس دفعہ یہ کہہ کر اسے گھر سے نکال دیا کہ "جاؤ اور اپنے حصے کی زمین لے کر آؤ اور جس چیز کا حصہ بنتا ہے وہ بھی لاؤ۔" مریم کے بھائیوں نے مریم کو چند ہزار روپے دے کر رخصت کر دیا۔ دس پندرہ دن سکون سے گزرے پھر جب پیسے ختم ہو گئے تو مریم کے شوہر نے اسے پھر مارا اور گھر سے نکال دیا۔

اب یہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مریم مار کھا کر گھر آ جاتی اور اس کے بھائی چند ہزار روپے اسے دیتے اور رخصت کر دیتے۔ جائیداد کا حصہ دینے کے لیے اس کے بھائی بھی تیار نہ تھے۔ مریم کے شوہر کو جب بات بنتی ہوئی نظر نہ آئی تو اس نے آخر کار مریم کو طلاق دے دی۔

مریم جب بھی ہمارے گھر آتی یا میں اس کے گھر جاتی تو وہ مجھے بتاتی کہ..... بھابیاں اس کو بات بات پر طعنے دیتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی چھوٹی چھوٹی بات پر لڑتی جھگڑتی ہیں۔ بھائیوں کے سامنے بھی وہ ایسا کرتی ہیں، لیکن بھائی بھی انہیں نہیں روکتے۔ مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کہاں اور کیا غلطی ہوئی ہے جو میرے ساتھ یہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے بھائیوں کی عزت کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم اپنا گھر نہیں بسا سکی ہو۔" بتاؤ میں انہیں کیا جواب دوں؟ میں بہت تنگ آ گئی ہوں۔ ان کی باتوں سے اور کسی دن بھی خودکشی کر لوں گی۔ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔" میں نے اس کو حوصلہ دیا اور کہا کہ "ایسی کوئی بے وقوفی مت کرنا، وقت ایک سا نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ضرور کرے گا۔ اس کی رحمت سے نا امید نہیں ہوتے، صبر کرو بس۔"

سرفراز اب گاؤں بہت کم آتا تھا۔ اب کی بار جب وہ دو مہینے بعد آیا تو اس کو پتا چلا کہ مریم کو طلاق ہو گئی ہے۔ سرفراز نے ایف اے کرنے کے بعد شہر میں ہی نوکری کر لی تھی۔ جب اسے پتا چلا تو وہ چاول دینے کے بہانے ہمارے گھر آیا اور مجھے کہنے لگا کہ "مریم سے کہو کہ مجھ سے فوراً ملے، اسی جگہ پر جہاں ہم پہلے ملے تھے۔"

سرفراز مریم کا دردناک حال سن کر رونے لگا تھا۔ جب وہ جانے لگا تب تک وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا اور پھر اس نے اپنے فیصلے سے مریم کو بھی آگاہ کر دیا۔ اس نے کہا۔ "مریم تم سوچ لو جو بھی فیصلہ تم کرو گی مجھے منظور ہوگا۔ میں پندرہ دن بعد پھر آؤں گا۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

مریم نے مجھے بتایا کہ "وہ کہہ رہا تھا، تم میرے ساتھ چلو۔ ہم یہاں سے جا کر شہر میں شادی کر لیں گے

اور پھر کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔ تم بتاؤ اب میں کیا کروں۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں اس کی بات سن کر خاموش ہوگئی، پھر اس نے کہا۔ "اگر میں گھر سے جاؤں گی تو بھائیوں کی بدنامی ہوگی۔" میں کچھ بھی نہ بولی تو وہ بھی خاموشی سے اُٹھ کر اپنے گھر کو چلی گئی۔ اس کے بعد میں جب اگلے دن اس کے گھر گئی تو وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی، وہ یہ کہ وہ سرفراز کے ساتھ ضرور جائے گی۔ اس نے کہا کہ "اگر میں کچھ دن اور اس گھر میں رہی تو اپنے ساتھ کچھ کر بیٹھوں گی، اس لیے بہتر یہی ہے تم جا کر سرفراز کو بتا دینا۔" میں نے گھر آ کر سرفراز کو فون کر کے مریم کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس میری بات سننے کے بعد کہا۔ "اس کو بتا دینا کہ میں اگلے ہفتے آؤں گا، تم تیار رہنا۔"

ایک ایک کر کے میں اس کے گھر سے تین چار جوڑے کپڑوں کے چھپا کر اپنے گھر لے آئی تھی۔ ایک ہفتہ ایسا گزرا، جیسے ایک صدی گزر رہی ہے۔ عشاء کی نماز سے ایک گھنٹہ بعد جب تسلی ہوگئی کہ سب گھر والے سو گئے ہیں، تو مریم اپنے گھر سے میرے گھر آ گئی۔ میرے گھر والے بھی سب سو چکے تھے۔ میں نے پھر سرفراز کو فون کیا تو پانچ منٹ بعد وہ آ گیا۔ جب ہم نے تسلی کر لی کہ باہر کوئی نہیں ہے تو وہ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلے گئے اور میں ان کے حق میں دعا کرنے لگی۔

اگلے دن شام کو ان کا فون آیا کہ ہم نے شادی کر لی ہے اور ہم دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ جہاں سرفراز نے آنے سے پہلے کرائے پر ایک گھر لے لیا تھا۔ گاؤں میں ابھی تک کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ مریم گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میں صبح کے وقت مریم کے گھر گئی تو مریم کی بھابی نے مجھے بتایا کہ "مریم اپنے ماموں کے گھر گئی ہے۔"

"کب تک واپس آئے گی۔" میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"پتا نہیں۔" میں مریم کے گھر اس لیے گئی تھی تا کہ مجھ پر یہ لوگ کوئی شک نہ کریں کہ مریم کے بھاگنے میں میرا بھی کوئی ہاتھ ہے۔

دو ہفتے گزر چکے تھے، مگر ابھی تک گاؤں والوں کو کیا خبر ہوتی تھی، خود مریم کے گھر والوں کو بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

ڈیڑھ مہینے بعد کی بات ہے، جب ایک دن میں نے پولیس کی گاڑی کو سرفراز کے گھر کے سامنے کھڑے دیکھا۔ میرا دل کسی انہونی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور پھر دوسرے دن سارے گاؤں کو پتا چل گیا کہ سرفراز مریم کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ پتا نہیں ان لوگوں کو کیسے پتا چلا تھا۔ اب سارے گاؤں والوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ "اگر وہ مل گئے تو چوہدری ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔" میں جب بھی یہ سب سنتی تو میری جان لبوں پر آ جاتی کہ "اب کیا ہوگا......؟"

میں نے ان کو فون کیا تو وہ کہنے لگا کہ ہمیں پتا چل گیا ہے۔ اب گھر والے ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ واپس آ جاؤ۔"

"تو کیا تم لوگ واپس آ رہے ہو۔" میں نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے۔ "جب تک یہ ہم کو یقین نہیں دلاتے کہ ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا، تب تک ہم واپس نہیں آئیں گے۔" اس دن کے بعد ہماری بات دوبارہ نہیں ہوئی، کیونکہ انہوں نے اپنا نمبر بند کر دیا تھا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ چوہدری ان کو واپس بلانے کے لیے بہت زور لگا رہے ہیں اور انہیں بہت تلاش کر رہے ہیں، مگر ان کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا ہے۔ مریم کے بھائی اور اس کا باپ پولیس کے ذریعے سرفراز کے گھر والوں کو تنگ کروا رہے تھے لیکن جب طرف سے چوہدری ناکام ہو گیا تو اس نے پنچائیت کے ذریعے فیصلہ کروانے کا سوچا۔ میں نے جب کھوج لگایا تو پھر مجھے پتا چلا کہ کل شام کو پنچائیت ہے اور پھر پنچائیت میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرفراز اور مریم کو کسی صورت بھی واپس بلایا جائے۔ مریم کے بڑے بھائی نے اس بات کی گارنٹی دی کہ ان دونوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور ہم عزت کے ساتھ مریم کی رخصتی کر دیں گے، جو ان سے غلطی ہو گئی...... سو ہو گئی۔

فیصلے کے ایک ہفتے بعد سرفراز اور مریم گاؤں واپس

آ گئے۔ مریم اپنے بھائیوں کے گھر چلی گئی اور سرفراز اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے بعد مریم کے بھائیوں نے کہا کہ ہم رخصتی ابھی نہیں کریں گے، بلکہ ہمیں اس کام میں تین سے چار ماہ تک لگیں گے۔

سرفراز چوہدری کی بات پر اطمینان کر کے واپس کام پر شہر چلا گیا تھا اب گاؤں میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ مریم کے بھائی بھی خاموش تھے۔ انہوں نے بھی کچھ ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ خاموشی ایک روز بہت بڑا طوفان لے کر آئے گی، اس کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔

"مریم سے اب میری بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ جب کبھی ہوئی بھی تو وہ اپنی بھابیوں کے سلوک کے بارے میں بتاتی کہ اچھا نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر بھائیوں سے شکایتیں لگاتی ہیں اور مجھ پر ڈانٹ پڑواتی ہیں۔"

مریم کے آنے کے دو ہفتے کے بعد کی بات ہے۔ جب ایک شام گاؤں میں بہت زیادہ شور اور رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھیجا کہ دیکھ کر آؤ کیا بات ہے۔ پانچ منٹ بعد جب وہ آیا اور کہنے لگا۔

"آپی وہ سرفراز بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ فوت ہو گیا ہے۔" خبر جان لیوا تھی۔ میں نے جلدی سے امی کو بتایا اور خود مریم کے گھر کی طرف بھاگی۔ اس کے گھر پہنچی تو وہ رو رہی تھی اور مجھے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ رونے لگی۔ میں نے مریم کو دلاسا دیا۔" مریم خود کو سنبھالو۔" اس کی بہت بری حالت ہو رہی تھی اور پھر وہ میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اس کو بیڈ پر لٹایا، پھر میں باہر سے پانی لے کر آئی اور اس کے منہ پر چھڑکا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور مجھے اس وقت کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ میں بھاگتی ہوئی اس کی بھابی کے کمرے کی طرف گئی اور اس کو بتایا تو وہ کہنے لگی۔" مرتی ہے تو مر جائے وہ میری بلا سے۔" میں واپس مریم کے کمرے میں آ گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ بے ہوش پڑی رہی جب وہ ہوش میں آئی تو پھر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میں نے اس کو بہت تسلی دی، مگر میری تسلی کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہو رہا تھا ہوتا بھی تو کیسے......؟

اس کا تو گلشن ہی اجڑ گیا تھا۔ وہ شجر ہی سوکھ گیا تھا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں اس کا بسیرا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سرفراز کو رات کو ہی دفن کر دیا تھا، کیونکہ میت کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ایکسیڈنٹ کے چار دن بعد پتا چلا کہ وہ حادثہ نہیں تھا بلکہ قتل تھا، جس کو حادثے کا روپ دیا گیا تھا۔ سرفراز شہر سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ گاؤں کی طرف آنے والے روڈ پر آیا تو پیچھے سے کار نے ٹکر ماردی اور کار سرفراز کے پیٹ کے اوپر سے گزر گئی اور اس کی موقع پر ہی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت سڑک بالکل سنسان تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب کیا دھرا چوہدری کا ہی ہے مگر بولا کوئی بھی نہیں۔

مریم کی طبیعت اب خراب رہنے لگی تھی۔ سرفراز جب سے فوت ہوا تھا تب سے تو وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب اس کو چکر اور ابکائیاں بھی آنے لگی تھیں۔ دو تین دفعہ میں اس کو گاؤں کی ڈسپنسری پر بھی لے کر گئی تھی اور دوا بھی لے کر آئی تھی۔ آج لیڈی ڈاکٹر نے آنا تھا گاؤں میں۔ مریم کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک تھی، اس لیے وہ اکیلی ہی چلی گئی تھی۔ چیک اپ کروانے کے بعد وہ سیدھی میرے پاس آئی تھی اور آتے ہی اس نے مجھے خوش خبری سنائی تھی۔ بہت عرصے بعد میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی، وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔" مجھے آج جینے کا سہارا مل گیا ہے۔ اب میری زندگی بڑے سکون سے گزرے گی۔"

میں نے دل کی گہرائی سے اسے دعا دی تھی کہ اے اللہ پاک اب کی بار اس کو خوشی راس آ جائے۔ مگر کہاں......؟ میری باقی دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی......!!! اور خوشیوں کی آرزو لیے مریم منوں مٹی تلے جا سوئی۔ شاید قدرت بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ جھوٹی انا کے حصار میں قید انسانوں کی اس دنیا میں زندہ رہے۔ جہاں جیتے جاگتے انسان کو تا عمر اذیت کی سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

☆......☆

کسے الزام دوں



زرینہ جونیجو

اپنی ماں کے غم کی ماری ایک بیٹی کی عبرت خیز کہانی

"دیکھو عزیز! اس دفعہ میں چپ نہیں رہوں گی۔ فصل سے جو بھی پیسے آتے ہیں، ان پر زیادہ حق ہمارا بنتا ہے۔ ارے سارا سارا دن تم کھیتوں میں کام کرتے ہو اور جب فصل کٹائی ہوتی ہے تو تمہارے پیسے رفیق بھائی لے جاتا ہے اور تمہاری محنت کے پیسوں پر وہ پورا سال عیش کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگتا۔"

"اس مرتبہ مجھے بھی سونے کے جھمکے بنوا کے دو۔" میں نے اپنے شوہر عزیز کو سمجھاتے ہوئے کہا تو عزیز نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"صبر میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پیسے تو رفیق بھائی کے پاس ہیں۔ کل میں نے اس سے مانگے بھی تھے، مگر وہ کہتا ہے کہ فصل کے سارے پیسے قرضے کی نذر ہو گئے۔ رفیق بڑا بھائی ہے میرا، اگر نہیں دے رہا تو میں لڑ تو نہیں سکتا نا، بڑا بھائی ہے۔"

"اچھا جی، ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی قرضے کا بہانہ۔ پہلے تو وہ خود عیش کرتا تھا۔ اب بیوی کی ہر فرمائش پوری کرنے لگا ہے۔" میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں نئی نئی شادی ہے نا اس لیے۔" عزیز نے کہا۔

"نئی شادی تو میری بھی ہوئی تھی۔ یہ چھٹا سال ہے مگر آج تک مجھے تو نے کچھ لے کے نہیں دیا۔ میری ضروریات تو جیسے غیب سے پوری ہوں گی اور اس نئی نویلی دلہن کے نخرے تو دیکھو، گھر کا کوئی کام ہی نہیں کرتی، روزانہ اپنے لیے الگ سے لوازمات بناتی ہے۔ خود بھی کھاتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی کھلاتی ہے۔ ابھی ابھی شادی پر اتنا سارا سامان اور کپڑے ملے ہیں، پھر بھی آئے دن کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہے۔ عزیز مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ چونکہ محنت کرو تم اور عیش اڑائیں تمہارے بھیا بھابی۔ ارے میں پوچھتی ہوں، تجھے کیا نصیب ہوتا ہے۔ روکھی روٹی اور پرائے گھر کی لسی۔"

میں نے اپنے بڑے دیور رفیق اور اس کی بیوی نبیلا، جو رشتے میں میری ماموں زاد بہن بھی لگتی ہے، کی بھرپور شکایت لگائی۔ ہماری یہ گفتگو رفیق بھائی نے سن لی تھی اور پھر جیسے میری شامت ہی آ گئی۔

"خاموش گندی عورت، بکواس کرتی ہے۔ جلتی ہے میری نئی نویلی دلہن سے۔ کیا تو نے اسے اپنے جیسا سمجھا ہے۔ تو تو پرایا بچہ پیٹ میں لیے ہمارے گھر آ پہنچی تھی۔ اگر اس وقت پتا ہوتا نا، تو میں تجھے کلہاڑیوں سے چیر کے رکھ دیتا، بات کرتی ہے بڑی بڑی......"

میرے دیور رفیق نے جب مجھے بچے کا طعنہ دیا



تو میرے صبر کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میں روتی ہوئی اپنی چھوٹی جیٹھانی کے پاس گئی تاکہ اپنے جلتے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ میں نے جیٹھانی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سن رہی ہو نا باجی نرگس، چھ برس سے مجھے اس گھر میں، پھر بھی ان طعنوں سے میری جان نہیں چھوٹ رہی۔ آج بھی رفیق بھائی نے مجھے اس بچے کا طعنہ دیا ہے۔ میں بھی آج اپنی جھولی پھیلا کے خدا کے حضور اس رفیق کو بددعا دیتی ہوں کہ اس کی بیوی کا بھی پیر پھسلے گا، اس سے بھی ایسی غلطی سرزد ہوگی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ باجی تم تو جانتی ہو نا کہ میں نے جان بوجھ کر تو گناہ نہیں کیا تھا، پھر بھی یہ سب مجھے طعنے دیتے رہتے ہیں۔"

باجی نرگس نے میری بات کو سن کر صرف اثبات میں سر ہلایا تھا اور میں آنسوؤں کا سیلاب بہا کر واپس اپنے کچن میں آ گئی تھی، کیونکہ ابھی مجھے رات کا کھانا بھی بنانا تھا اور منی کے لیے دودھ بھی تیار کرنا تھا، جس میں میں تین حصے پانی اور ایک چھٹانک مصری ڈالتی ہوں۔

قارئین! انسان غریب ہی سہی مگر اللہ عزوجل کسی کی عزت کو کالک نہ لگائے۔ اگر غلطی سے ایک دفعہ یہ کالک لگ جائے تو دنیا کا کوئی صابن اسے صاف نہیں کرسکتا، انسان مر بھی جائے پھر بھی یہ داغ تا قیامت قائم رہتا ہے۔

مجھے بھی الھڑپن میں ایسی ہی کالک لگ گئی تھی جو تا قیامت اب مٹ نہ سکے گی۔ مجھ سے بھی ایک ایسی غلطی ہوگئی تھی، جو میں کرنا نہیں چاہتی تھی، مگر میری ماں نے مجھے اس غلطی میں ڈبونے کے لیے اہم کردار ادا کیا تھا۔

قارئین! میں جو کچھ بھی آپ کو سنا رہی ہوں، شاید آپ لوگوں کو اس پر یقین آجائے کہ دنیا میں ایسی مائیں بھی ہیں جو خود اپنی بیٹیوں کو ذلت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

میرا تعلق معاشرے کے انتہائی نچلے طبقے سے ہے۔ جہاں لوگوں کو سانس کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے سخت، محنت اور صبر، مشقت کرنا پڑتی ہے۔

میرے ماں باپ، بھائی، بہنیں چٹی ان پڑھ ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں خدا نے عقل نام کی کوئی چیز نہیں ڈالی، اس لیے ہمارا دماغ ہمیشہ خلاؤں میں گھومتا رہتا ہے۔ گھر میں لڑنا جھگڑنا ہم لوگوں کا بہترین مشغلہ ہے۔ ہم لوگ آپس میں تو بھیڑ بکریوں کی طرح لڑتے رہتے تھے، مگر ایک دن بھائی نے ایسا ڈنڈا گھمایا کہ اماں کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ کئی دنوں تک بھائی کو بددعائیں اور گالیوں کا راگ سناتی رہی تھی۔

بھائی اور ابا جو کچھ بھی کماتے وہ آٹا دانا خرچ ہوجاتا تھا۔ مجھ سے جو بڑی بہن تھی، اس کی شادی کردی گئی تھی اور پھر شادی کے دوسرے دن تھا ہماری بہن کا دماغ آؤٹ ہوگیا تھا۔ وہ خود تو پاگل ہوگئی تھی مگر دولہا بھائی (یعنی میری بہن کا شوہر) کو بھی ساتھ میں پاگل کر ڈالا تھا اور آج تک اُن دونوں میاں بیوی کا دماغ چلتا پھرتا رہتا ہے۔

جب میری عمر صرف بارہ سال کی ہوئی تھی تو اماں، ابا اور بھائی نے امیر ہونے کے لیے مجھے پچاس ہزار روپے میں بیچ ڈالا تھا اور ان روپوں کے عوض میری منگنی ہمارے ہی خاندان کے عزیز نامی لڑکے سے کردی گئی تھی۔

مجھے نہ تو منگنی کی خوشی ہوئی تھی اور نہ ہی مجھے شادی کی خواہش تھی۔ وقت اپنی ڈگر پہ چلتا رہا اور میں بالغ ہوئی تو میرے سسرال والوں نے شادی کا مطالبہ کیا، مگر میرے بھائی نے ان لوگوں سے چند سالوں کی مہلت مانگ لی تھی۔

ایک دن میرا بھائی امجد ایک ادھیڑ عمر شخص کو ہمارے گھر لے آیا، جس کا نام شرافت بتایا تھا۔ میں نے شرافت کا نام تو سنا تھا، مگر اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"امبر..... شرافت سے میری دوستی ہوگئی ہے۔ اس لیے میں اسے گھر لے آیا ہوں، تم اچھا سا شربت بنا کر اسے پلاؤ۔"

بھائی نے آرڈر جاری کیا تو میں شربت بنانے چلی گئی تھی۔ دوسرے دن شرافت واپس چلا گیا تھا۔ تو میں نے چین کا سانس لیا تھا، لیکن چند دنوں بعد پھر شرافت صاحب تشریف لے آئے تھے۔ وہ بھی سیدھے گھر میں۔ شرافت نے ہمارے گھر کو اپنی ملکیت سمجھ رکھا تھا، لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب گھر والوں نے شرافت کو سر پہ چڑھا رکھا تھا۔

جب شرافت کا یوں بے حجابی سے ہمارے گھر آنے کا سلسلہ شدت اختیار کر گیا تو ہمارے رشتہ داروں نے بھائی، اماں اور ابا کو بہت سمجھایا کہ غیر مرد کو ہاتھ کا چھالا مت بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہتھیلی کا چھالا کینسر بن جائے اور پھر ہاتھ ہی کاٹنا پڑے۔

رشتے داروں کی اس نصیحت کو اماں، ابا اور بھائی نے ایک کان سے سننے اور دوسرے سے نکالنے والا معاملہ بنا ڈالا، جبکہ شرافت کا ہمارے گھر آنا تیزی پکڑتا گیا۔

گرمیوں کا موسم تھا اور دوپہر کے وقت ہم لوگ آرام کر رہے تھے کہ ایک دم شرافت کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اماں اس کے ہاتھ میں آموں کا شاپر دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی، جبکہ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے دیوار کی طرف منہ کر لیا تھا کہ اچانک اماں نے مجھے پکارا۔

"امبر! اٹھ جا بھی شرافت بھائی کے لیے پانی بھر کے لاؤ، بہت گرمی ہے بے چارہ نہا دھو لے۔" اماں کی اس بات پر شرافت کا چہرہ مجھے اور شریف دکھائی دیا تھا اور میں جلدی سے اٹھی تھی اور پانی کی بڑی بالٹی بھر کے آنگن میں رکھ دی تھی۔

شرافت نہا کر تیار ہوا تو اماں اسے کافی دیر تکتی رہی تھی، اس کے بعد شرافت باہر چلا گیا تھا۔

"امبر، دیکھو یہ شرافت ہمارا مہمان ہے۔ پیسے والا آدمی ہے۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھا کرو۔" ماں نے مجھ سے کہا تھا۔

"مگر اماں اس کا روز یہاں آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" میں نے اماں سے کہا تھا۔ رات ہوئی تو اماں نے کہا۔

"امبر آج آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دو اور چارپائی پر بستر لگا دو۔"

میں نے ماں کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ پہلے آنگن میں جھاڑو پھیرا، پھر چھڑکاؤ کیا اور اماں کی چارپائی کے بائیں طرف چارپائی رکھ کر اس پر شرافت کے لیے بستر لگا دیا تھا۔

پانی کے چھڑکاؤ سے مٹی کی بھینی بھینی خوشبو اور فلک پر ہلکے ہلکے بادلوں کے بیچ جگمگاتے ستارے اور ٹھنڈی ہوا نے ماحول کو اور بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میں نے اپنا بازو اپنے چہرے پہ کچھ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ سامنے والا یوں سمجھے کہ میں گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں، مگر میں جاگ رہی تھی، بازو کی اوٹ سے میں نے دیکھا کہ اماں آ کے شرافت کے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور پھر دونوں کوئی خفیہ گفتگو کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس مجھے جھنجھوڑ رہی تھی کہ آج رات ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے آج نہ جانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹ بدلتے بدلتے رات کا دوسرا پہر بھی ختم ہونے کو تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ شرافت میرے سرہانے کھڑا تھا، پھر اس نے اپنا ہاتھ دھیرے سے میرے جسم پر پھیرا تو میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"ششش...... خاموش اندر چلو۔" شرافت نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے میں چلی گئی تھی۔ جب ہم کمرے میں داخل ہو چکے تو شرافت نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

خوف سے میرا رواں رواں لرزنے لگا تھا، پھر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"امبر میں نے بارہا کوشش کی، پر تم نے کبھی مجھے گھاس تک نہیں ڈالی، مگر آج میں ناکام نہیں لوٹوں گا۔ یہ پچاس روپے لے لو۔ میں تمہارے لیے ریشمی کپڑے، سلک، کاٹن کے سوٹ لاؤں گا۔ میں تجھے عیش کرواؤں گا، بس تم میری خواہش پوری کر دو۔ دیکھو میں کئی مہینوں سے تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔" وہ اپنی دھن میں

بولے جا رہا تھا۔

"نہیں شرافت میں نے آج تک تجھے ماما جیسا درجہ دیا ہوا تھا۔ پر تیری یہ حرکت۔" میں نے خود کو اس کے بانہوں بازوؤں سے چھڑا کر دروازے کی کنڈی کھولی دی تھی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا تھا۔

"اماں اٹھو اماں۔" میں نے اماں کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"کیا ہے کلموہی آدھی رات کو تجھے کیا تکلیف ہو گئی ہے۔" اماں نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"اماں وہ شرافت میرے، وہ مجھے....." بات میرے حلق میں ہی اٹک گئی تھی۔ اماں نے جماہی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"تو جاؤ جیسا شرافت کہتا ہے ویسا کرو اور ہاں پیسے ضرور لے لینا۔"

اس وقت شرافت کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ مجھے اماں پر بہت غصہ آیا، پل بھر کو میں نے سوچا کہ ابا اور بھائی کو جگا دوں، مگر شرافت کی چنگی دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سارے گھر والے شرافت کے اسیر بن چکے ہیں۔ اس لیے خاموشی سے میں نے اپنا آپ شرافت کے حوالے کر دیا تھا۔

سورج کی تیز شعاعیں میرے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا مگر میں شرم کے مارے بستر میں دبکی رہی تھی تو اماں نے میری جسم سے چادر کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"اٹھ جا اسیرو دیکھ نہیں رہی سورج سر کو چڑھ آیا ہے۔ تجھے کام کاج نہیں کرنا ہے کیا؟"

ایک مرتبہ میں نے جلالی نگاہوں سے اماں کو گھور کے دیکھا اور کمرے میں چلی گئی تھی۔ تو اماں ٹہلتی ہوئی میرے پیچھے اندر آئی اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ تو سہی رات کو کیا ہوا تھا؟"

"وہی جو شرافت اور تیری مرضی تھی۔" میں نے غصے میں کہا تھا۔

"پھر کچھ ہزار بھی یا خالی ہاتھ۔" اماں نے بھی بے شرمائی سے کہا تھا۔

"پچاس روپے دیے ہیں۔"

میں نے پلو میں باندھے نوٹ کو اپنی مٹھی میں بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا وہ روپے تم خود رکھو باقی مجھے دے دو۔ کھانے کو کچھ منگوا دوں، گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔"

اماں نے میرے دوپٹے کے پلو سے بندھے نوٹ کی گرہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ اس وقت مجھے پچاس کا نوٹ ہزار کا دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

"سنو لڑکی..... اگلی بار پچاس سے کام نہیں چلے گا زیادہ لینا ہوگا۔" اماں باہر جاتے ہوئے مجھے ہدایات دے گئی تھیں اور میں اس اگلی بار کا سوچنے لگی تھی۔

"کیا اگلی بار بھی.....؟"

وقت پھر آگے سرکا اور وہ اگلی بار بھی آ گئی۔ اس دفعہ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔

جب وہ مہینے گزر گئے تو میری طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہو رہا تھا۔ چونکہ میں انجان تھی اور مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ اس اگلی بار کا ردعمل کیا ہوگا۔ جب طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو میں نے اس ساری صورت حال کا ذکر اماں سے کر دیا تو اماں ایک رشتے دار عورت خاتون کو جسے سب دائی کہتے ہیں کو لے کر آ گئی۔ اس عورت نے میرے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اماں سے کہا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔

یہ الفاظ سنتے ہی میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ مگر اماں کو ذرا بھر بھی شرم نہیں آئی تھی۔ اگر اماں کی جگہ کوئی غیرت مند عورت ہوتی تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتی۔

اماں نے میری طبیعت کا ذکر شرافت سمیت ان سب لوگوں سے کیا تھا، جن کو وہ اپنا محسن جانتی تھی۔ اب یوں ہمارے گھر میں اس حوالے سے ایک میٹنگ ہوئی تھی کہ کیا کیا جائے۔

"ارے تم لوگ فکر کیوں کرتے ہو۔ میں تم لوگوں کو ایسا مشورہ دیتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

دوران میٹنگ چاچی نادرہ نے عقل استعمال کرتے

ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں! بولو چاچی، میں جانتا ہوں، تم ہمیشہ پکے مشورے دیتی ہو۔" بھائی نے ایک دم جوش میں آ کر کہا تھا۔

"بیٹا ایسا کر کہ امبر کی جلد سے جلد شادی کروا دو۔ منگنی تو پہلے ہو چکی ہے۔ شادی ہو جائے گی تو تم لوگوں کے سر سے بلائیں جائے گی۔"

"مگر چاچی! اس طرح تو ان لوگوں کو پتا چل جائے گا۔" یہ میرے بھائی نے کہا تھا۔

"ارے نہیں پتا چلتا، امبر کا منگیتر بدھو ہے بدھو۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اگر ان لوگوں نے شور مچایا تو، ہم یہ الزام امبر کے منگیتر کے سر پر تھوپ دیں گے۔" چاچی نے منہ میں نسوار ڈالتے ہوئے کہا۔

چاچی کے اس مشورے پر ہم سب گھر والے تو بہت خوش ہوئے، لیکن اس وقت شرافت کی خوشی دیدنی تھی۔

بھائی امجد نے میرے سسرال والوں کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ اس ماہ آ کے امبر کی شادی کی تاریخ پکی کر جاؤ۔ پہلے تو میرے سسرال والے فکر مند ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب ہم نے شادی کی بات کی تھی تو چند برسوں کے لیے ہمیں ٹالتے رہے تھے اور اب اچانک......

دوسرے مہینے میری شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور بڑے ہی عجلت سے میری شادی ہو گئی۔

صبح ہوئی تو میری طبیعت پھر خراب ہونی شروع ہو گئی۔ جب میری حالت میرے دیور نے دیکھی تو وہ ڈاکٹر کو لے آیا۔

"بی بی! آپ نے رات کو کھانا کھایا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے جواباً کہا۔

"اور ناشتا؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے شرم کے مارے آنکھوں کے اوپر دوپٹا رکھ لیا تھا۔ اب میں منتظر تھی کہ ڈاکٹر کسی بھی لمحے میرا بھانڈا پھوڑنے والا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے

میرے دونوں بازوؤں میں تین عدد انجکشن ٹھونسے اور رخصت ہو گئے۔

مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ کیسا ڈاکٹر ہے جو مرض کی تشخیص ہی نہیں کر پایا، پھر مجھے چاچی نادرہ کا وہ مشورہ یاد آیا جو میرے شوہر اور ڈاکٹر پر فٹ لگ رہا تھا۔

دوائیوں کے استعمال سے میری طبیعت بحال ہو گئی تھی اور اس بات پر میں بہت خوش بھی تھی کہ میری ذلت، عزت میں بدل گئی تھی۔

"امبر کل شام کو گاؤں میں شادی کا فنکشن ہے، تم ہمارے ساتھ چلنا اور ہاں خود کو خوب اچھی طرح بنا سنوار لینا، کیونکہ تم لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی رہو گی، نئی نویلی دلہن ہو نا اس لیے۔ ہمارے ہاں دلہن کو بڑی توجہ سے دیکھا جاتا ہے، سمجھ رہی ہو نہ میری بات۔" میری نند نے مجھ سے کہا۔

"جی میں ضرور چلوں گی۔" میں نے اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے کہا تھا۔

دوسرے دن شام کو میں بن ٹھن کے دلہن کے روپ میں نند کے ساتھ شادی کے فنکشن میں چلی گئی تھی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میری حالت اچانک سے خراب ہو گئی اور سر چکرانے لگا میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی نند کا سہارا لیا میری حالت کا جائزہ لیتے ہوئے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی میری نند کے کان میں ایک عورت نے کچھ سرگوشی میں کہا تھا۔

"چلو بھابی گھر چلتے ہیں۔" میری نند نے آرڈر جاری کیا تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ گھر چلی آئی تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا اور پیدل چلنے سے مجھے شدت کی پیاس لگی تھی، لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں خود اٹھ کر پانی پیتی، اس لیے میں چارپائی پر لیٹ گئی اور میں نے اپنے شوہر عزیز کو پانی پلانے کا حکم دیا تھا، لیکن چند ہی لمحوں میں پانی کے بجائے میرے گرد سسرال والوں کا مجمع کھڑا تھا۔

"اے گندی عورت اٹھ، نکل جا ہمارے گھر سے، پوری برادری میں ہماری ناک کٹوا دی تو نے۔

میرے دیور رفیق نے با آواز بلند کہا۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم لوگ ٹھہرو میں ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔"

میرا شوہر گھسیٹتے ہوئے مجھے کمرے کے اندر لے گیا تھا۔

"اب مجھے سچ سچ بتاؤ۔ یہ سب کیسے ہوا، کس کا ہے یہ گناہ؟ بتاؤ ورنہ سب مل کے تیرا قیمہ بنا ڈالیں گے۔"

میرا شوہر بولنے کے ساتھ ساتھ مجھے لاتیں بھی مار رہا تھا۔

"بتاتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو تو سہی۔" میں نے اس سے روتے ہوئے کہا تھا۔

جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ میں کیا بتاتی تمہیں، تم لوگ تو عقل کے اندھے ہو..... مگر میں نے یہ نہیں کہا تھا، بلکہ تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ عزیز میں جو کچھ بتا رہی ہوں، وہ سب سچ ہے۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" اس گناہ کے لیے مجھے اماں نے اکسایا تھا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ دیکھنے میں کتنی معصوم لگتی ہے تیری اماں۔ اگر تیرا عاشق شرافت تھا تو تو نے مجھ سے شادی کیوں کی، ہم شریف لوگوں کو بدنام کیوں کیا؟"

عزیز کی سسکیاں بندھ گئی تھیں اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے بعد میرے دیور رفیق نے مجھے گھر سے نکلنے کا حکم صادر کیا اور میں دو جوڑے کپڑوں کے گٹھڑے میں باندھ کر پڑوس کے بچے کے ساتھ اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔

اس عمر میں، میں کتنی کم عقل تھی کہ یہ تک نہیں جان پا رہی تھی کہ یہ معاملہ سنگین رخ اختیار کرلے گا اور اس کا مزا مجھے تاحیات چکھنا ہوگا۔ میرے لیے تو یہ سب کھیل تماشا ہی تھا۔

چار دن بعد میرا بھائی امجد میرے سسرال والوں سے معافی مانگنے گیا تو ان لوگوں نے معاف نہ کیا اور بھائی سے کہا کہ آج رات تمہاری بہن کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا تم لوگ اگر سننا چاہتے ہو تو فیصلے کے وقت آجانا۔ برادری والوں نے جو بھی فیصلہ سنایا، وہ تم لوگوں کو ماننا پڑے گا۔

رات ہوئی تو اماں اور بھائی فیصلہ سننے چلے گئے۔ فیصلے میں ہمارے خاندان کے چند اہم لوگ موجود تھے۔

"عزیز ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ اسی طرح ہماری عزت بچ سکے گی۔" میرے دیور نے کہا۔

"نہیں بھائی، ہم مزدور لوگ ہیں جو بھی جمع پونجی تھی، وہ ہم نے امجد کو دے کے امبر کو خریدا ہے۔ اگر میں نے امبر کو طلاق دے دی تو میں دوبارہ بیوی کہاں سے لاؤں گا۔" عزیز بجھے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

لعنت ہو تجھ پر۔ اتنے تو کیسا بے غیرت ہے، بیوی کو چھوڑ بچے کا کیا کرے گا؟ کیا اس گندگی کو تو پالے گا؟

رفیق نے عزیز کا گریباں پکڑتے ہوئے کہا تھا اور پھر دونوں بھائی آپس میں لڑ پڑے تھے۔ فیصلے میں موجود سیٹھ فاروق احمد نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو رفیق' عزیز اور امجد تم سب لوگ مجھے بڑا تسلیم کرتے ہو نا۔" تینوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا تو پھر بڑے ہونے کے ناتے میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں اور جو بھی میں فیصلہ کروں گا وہ دونوں فریقین کو ماننا پڑے گا۔

"جی سیٹھ صاحب آپ جو بھی کہیں گے، وہ ہمیں قبول ہوگا۔" رفیق، عزیز اور امجد نے یک زبان کہا تھا۔

"دیکھو بھائی..... جان بوجھ کے لڑکی کی ماں اور بھائی امجد نے رفیق اور عزیز والوں کو رسوا کیا ہے۔ اس لیے امجد کے گھر والوں کو سزا دینا لازم ٹھہرا۔ ان کے لیے سزا یہ ہے کہ امجد کی چھوٹی بہن کی شادی رفیق کے چھوٹے بھائی سے کروی جائے گی اور انہیں ساٹھ ہزار روپے نقد جرمانہ کی صورت میں ایک مہینے کے اندر دینا ہوگا۔ امجد، اس کا باپ اور اس کی ماں عزیز کے گھر والوں سے معافی مانگیں گے اور ایک ہفتے کے اندر اندر امبر کی ڈلیوری کروا کے صرف امبر کو اس کے شوہر عزیز کے حوالے کرنا ہوگا، باقی رہا معاملہ بچے کا، سو بچہ زندہ ہو یا مردہ اب بچے کو اس دنیا میں

پیراسائٹ وہ طفیلی کیڑا یا حشرہ ہوتا ہے جو اپنے طور پر زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ کسی دوسرے جاندار کا خون چوس کر گزارہ کرتا ہے۔ انسانوں کے علاج معالجے میں اس قسم کا سب سے مفید پیراسائٹ یا طفیلی کیڑا ایک خاص قسم کی جونک ہے جسے Hirudo Medicinalis کہتے ہیں۔ اس جونک کے لعاب میں ایسی چیزیں شامل ہوتی ہیں جس سے جسم کا زخمی حصہ سن ہو جاتا ہے اور خون جمتا نہیں ہے۔ 1991ء میں ڈاکٹر زین وہلس کی قیادت میں کینیڈا کے سرجنوں کی ایک ٹیم نے جونک کے لعاب میں پائے جانے والے ان مخصوص اجزاء (Anticoagulants) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مریض کی کھوپڑی کو جوڑنے کے لیے کیے جانے والے آپریشن کے دوران خون باہر نکالنے اور اسے جمنے سے بچانے کے لیے جونک کا استعمال کیا تھا۔ طبی طور پر سب سے مفید اس پیراسائٹ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ یہ 27 سال تک زندہ رہتا ہے جو کسی بھی طفیلی کیڑے کی سب سے طویل زندگی سمجھی جاتی ہے۔

آنا چاہیے یا نہیں آنا چاہیے۔ یہ سب کیسے ہوگا، یہ مسئلہ امبر کے بھائی امجد اور ماں کا ہوگا، کیونکہ یہ سب کیا دھرا ان دونوں کا ہے، لہٰذا یہ سزا امجد اور اس کی ماں کے لیے کافی ہوگی کہ ایک جیتے جاگتے پھول جیسے بچے کا اپنے ہاتھوں قتل کردیں۔"

یہ فیصلہ دونوں فریقین نے بخوشی قبول کیا تھا۔

اب ایک ہفتے کے اندر میری ڈلیوری ہونی تھی۔ کئی لیڈی ڈاکٹرز سے بھائی نے بات کی، مگر میرا کیس کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں لے رہی تھی، کیونکہ ہم جاہل لوگوں کا کسی پڑھے لکھے آدم زاد سے مراسم تو تھے نہیں۔ اسی بھاگ دوڑ میں چار دن گزر گئے تھے۔ میری بدنامی کی خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

ہمارے گاؤں میں ایک ایسی عورت تھی جو چوبیس گھنٹے ڈاکٹرز کے رابطے میں رہتی تھی۔ بھائی نے جا کر اس عورت سے بات کی تو اس نے اُمید بندھائی کہ ہمارا کام ہو جائے گا، مگر اس کے لیے ہمیں دس ہزار روپے کا فی الوقت انتظام کرنا ہوگا۔

ہمارے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں۔" سنا تم نے امبر۔ بھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

بھائی کا غصہ میں ضبط نہ کر سکی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بھائی سے کہا تھا۔

"بھائی امجد تم مجھ پر غصہ کیوں ہوتے ہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے تو اماں نے کہا تھا ورنہ وہ شرافت اس کو تو ماما کہنے کو دل کرتا تھا میرا۔"

"تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو، یہ پیسے میں شرافت سے لے لوں گی۔" اماں نے برتن پٹختے ہوئے کہا تھا۔

دوسرے دن اماں شرافت سے دس ہزار روپے لے کر آ گئی تھی۔ دوسرے دن صبح کو بھائی میں اور اماں اس عورت کے ساتھ شہر چلے گئے تھے، جس نے پہلے ہی سے لیڈی ڈاکٹر سے بات طے کر رکھی تھی۔ شہر جاتے وقت میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ میں آزاد ہونے جا رہی ہوں، اس وجود سے جس نے میرے نفس کو گندہ کر ڈالا ہے۔ جس نے میرا شوہر مجھ سے چھین لیا ہے، جس نے مجھے رسوا کر رکھا ہے۔

جب ہم لیڈی ڈاکٹر کی کلینک پر گئے تو ہمیں علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا چہرہ کراتے ہوئے ماڈرن گالیوں سے ہمارا استقبال کیا تھا، پھر نرس کو چھ آٹھ انجکشن اور ڈرپس میں ڈرپ لگانے کی ہدایات فرما گئی تھیں۔

"اسے لیٹ جاؤ۔" نرس نے لات مارتے ہوئے کہا تو میں رونے لگی تھی۔

"ارے کاہے کو روتی ہے، اس وقت تو رونا نہیں آیا

ہوگا جب.....

مڈوائف نے میری ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا تو میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ میں کئی گھنٹوں تک آنکھیں بند کرکے لیٹی رہی۔ مسلسل سیدھا لیٹنے سے میری کمر آگ کا گولا بن چکی تھی۔ میں نے اٹھ کے بیٹھنا چاہا، ابھی آدھا جسم اوپر کیا ہی تھا کہ ٹھاہ، کی آواز کے ساتھ لیٹتی چلی گئی تھی۔ یہ ٹھاہ کی آواز اس تھپڑ کی تھی جو مڈوائف نے مجھے رسید کیا تھا۔ صبح سے لے کر رات تک، ڈاکٹر کے بعد ترس، نرس کے بعد مڈ وائف مجھے چیختے وار گالیاں سناتی رہیں اور ساتھ مجھے انجکشن بھی چبھوتی رہی تھی، پھر اچانک درد ایسا بڑھا کہ میری چیخ نکل گئی تھی۔ شدت درد سے میری دوسری چیخ نکلی تو اماں نے میرے منہ میں میرا ہی دوپٹے کا پلو ٹھونس دیا۔ یہ وہی پلو تھا جس میں میں نے شرافت کے دیے ہوئے پچاس روپے باندھے تھے۔ میری کمر کی ٹیس نے مجھے بے قرار کر ڈالا تھا۔ میں نے دوسری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تو لیڈی ڈاکٹر نے اپنے نرم و گداز ہاتھ سے کھینچ کر تھپڑ مارا تھا۔ اس وقت وہ نرم گداز ہاتھ مجھے لوہے کا محسوس ہوا تھا۔ ایک تو درد زہ تھی اور دوسرے زوردار تھپڑ نے مجھے ادھ موا کر ڈالا تھا اور میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب میرے کانوں نے سنا۔

"ماشاء اللہ بیٹا ہوا ہے۔"

یہ اُس عورت کی آواز تھی جس کو ہم ساتھ لے گئے تھے۔

بیٹے کا سنتے ہی میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میری نظر سیدھی جا کے بچے پر ٹھہر گئی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی اور میں اس وقت اپنا سارا درد و غم بھول گئی تھی۔

اس کا گلابی رنگ، کالے گھنے بال، وہ کسی معصوم شہزادے سے کم نہ تھا۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے اس کے نرم جسم کو چھوا تو اس نے میری طرف دیکھا بھی تھا۔

میں نے اسے گود میں لینا چاہا کیونکہ میں اس کی ماں تھی اور میں نے اسے اپنے پیٹ میں سنبھالا تھا۔ اس وقت میں بھول گئی تھی کہ یہ شرافت کے گندے خون سے بنا ہے، یہ حرام و ناپاک ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہی تھا کہ اچانک کسی مرد کے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں سے اسے چھین لیا۔ میں نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ مجھے اپنا نظر آیا، میرا بھائی امجد......

"بھائی اسے کہاں لے جا رہے ہو۔" میں نے اسے روکنے والے انداز میں کہا تھا۔

بھائی نے مڑ کے میری طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا تھا "چپ"

اس "چپ" کے ایک لفظ نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی تھی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ مجھے شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی اولاد کو خود سے جدا کرنا ضروری ہے۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد بھائی خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا تو میں نے اپنے زندہ وجود کو خالی خالی محسوس کیا تھا۔

"چلو اب میں تمہیں تمہارے شوہر عزیز کے پاس چھوڑ آؤں۔"

بھائی نے مجھے سہارا دیتے ہوئے کہا تھا۔ عزیز کا نام سنتے ہی میری جان میں جان آ گئی تھی۔

جب میں سسرال پہنچی تو سب نے جی بھر کے گالیوں سے اپنی بھڑاس نکالی مگر میری حیرت کدہ سے اس وقت باہر نکل گئی، جب عزیز نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

"کیسی ہو امبر، کیا کھاؤ گی۔"

☆......☆......☆

آج میں عزیز کے چار بچوں کی ماں ہوں۔ میرا شوہر مجھے کبھی طعنہ نہیں دیتا، وہ میری بہت عزت کرتا ہے۔ جبھی تو میں کہتی ہوں کہ میرا شوہر اللہ میاں کی گائے ہے۔

ہاں! مگر مجھے وہ گلابی چہرہ اور معصوم آنکھیں نہیں بھولتیں جو ایک لمحے کو میری طرف اٹھی تھیں اور پھر کچرے کے کسی ڈھیر میں گم ہو گئیں۔

☆......☆......☆

تیسری سچ بیانی

کلموہی

غزل قریشی

ایک مرد کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے والی عورت کی داستان

میرا نام انیلہ ہے۔ میں ضلع ایبٹ آباد کے ایک خوب صورت گاؤں کی رہنے والی ہوں، جہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ پہاڑ ہر طرف ہریالی کی چادر اوڑھے ہیں اور میدانوں میں کھیتوں نے سبزے کی چادر بچھائی ہوئی ہے۔

ہم سات بہنیں ہیں، جبکہ ہمارا بھائی کوئی نہیں ہے۔ میری امی کو لڑکے کی شدید خواہش تھی۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی پیر فقیر اور کوئی دم درود والا نہیں چھوڑا مگر خدا کو شاید منظور نہیں تھا۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے ہم بہنوں پر ہی ساری توجہ مرکوز کر لی۔

ہمارے بابا سعودیہ کے ایک پیارے سے شہر میں ہمارے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ ہمارے بابا نے کبھی ہمیں لڑکوں سے کمتر نہیں سمجھا اور ہماری ہر خواہش پوری کی اور کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ میں اپنی بہنوں میں سب سے بڑی ہوں، مجھ سے چھوٹی چھ بہنیں ہیں۔

میں اپنی بہنوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت اور خوب سیرت ہوں، مگر میں نے اس بات پر کبھی غرور نہیں کیا، بلکہ ہر اپنے اور غیر سے بہت اخلاق اور محبت سے ملتی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسی لیے ہر چھوٹا بڑا میرے اخلاق کا گرویدہ تھا۔ بڑی بوڑھیوں سے ہمیشہ بہت دعائیں لیتی ہے۔ کبھی کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا۔ اگر کوئی مجھ سے ایسی چیز بھی مانگ لیتا جو اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہوتی تھی، تو میں کسی اور سے ادھار مانگ کر اس کو دے دیتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھ سے کبھی انکار نہیں ہوتا تھا۔ اس بات پر میری امی ہمیشہ مجھے باتیں سنایا کرتیں، کیوں کہ اکثر لوگ میرے اس خلوص کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کے نزدیک میری یہ خوبی ہی میری سب سے بڑی ناکامی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی مجھ میں لوگوں کو برتنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ میں ہمیشہ لوگوں کی چالاکی اور ان کی اداکاری کو ان کی سادگی اور معصومیت سمجھ کر ہمیشہ ان کے دھوکے میں آجاتی تھی اور اپنی نئی نئی غیر استعمال شدہ قیمتی اشیا، بنا سوچے سمجھے ان کے حوالے کر دیتی تھی اور شاید اپنی اسی بڑی خامی کی وجہ سے میں اپنے سسرال والوں کی مکاری اور فریب کاری کو نہیں سمجھ پائی۔ اپنی سادہ طبیعت کے پیش نظر میں سمجھتی رہی کہ وہ مجھے اپنا سمجھ کر میری غیر استعمال شدہ قیمتی اشیا استعمال کرتے ہیں۔

یہ عقدہ تو مجھ پر بعد میں کھلا کہ وہ تو مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر مجھے تہی دامن کر کے واپس مجھے میری

دلبر پر پہنچانے کے چکروں میں ہیں مگر میری بدنصیبی کہ مجھے یہ بات اس وقت سمجھ آئی جب کمان کا آخری تیر اپنے وار کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنی بدنصیبی کی داستان سناؤں میں آپ کو اپنے ماضی میں لے جاتی ہوں جہاں سے میری بدنصیبی کا آغاز ہوا۔

ہم چاروں کی سات بہنیں تھیں، ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے میری امی نے اپنے ایک بھانجے کو اپنی بہن سے لے کر کاغذوں پر لکھوا کر عدالت کے ذریعے اپنا منہ بولا بیٹا اور وارث بنا لیا۔ میرا وہ کزن اعجاز احمد عرف جازی بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سب پر اپنا رعب جمانا شروع کر دیا اور ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے لگا جیسے کہ وہی تو ہمارا سرپرست اور ہمارے گھر کا اصل وارث ہو۔ امی سے بھی وہ اپنے لاڈ اور نخرے اٹھواتا اور امی بھی سگے بیٹوں کی طرح اس کے ناز نخرے اٹھاتی تھیں۔

وہ ہر وقت فرمائشیں کر کے امی کے ناک میں دم کیے رکھتا اور فرمائشیں بھی ایسی کہ امی کا شوگر اور بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا۔ مگر امی تھیں کہ پھر بھی ہر وقت اس کے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔

جازی چوں کہ میری عمر کا تھا سو امی کا ارادہ تھا کہ جازی کو بیٹا بنانے کے ساتھ ساتھ اسے میرا شوہر اور گھر داماد بھی بنا دیا جائے اور یہ بات جازی کو شروع ہی سے معلوم تھی۔ جازی اس فیصلے پر کچھ خاص خوش نہیں تھا۔ مگر میں نے والدین کی رضا پر خاموشی سے سر جھکا دیا تھا۔

جازی اچھا لڑکا تھا، اس میں سوائے نک چڑھے پن کے کوئی خاص خامی نہیں تھی۔ وہ ہمارے گھر دو سال رہا اور پھر ایک دن وہ ہم سب کو چھوڑ کر اور ہمارے تعلق رشتے ناتے توڑ کر اپنے والدین کے پاس واپس چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ہوتے ہوئے دوسروں کو کیسے اپنا ماں باپ تسلیم کر لے۔ اسے تو میرے اور اپنے رشتے پر بھی اعتراض تھا اس لیے اس نے اس تعلق سے بچنے کے لیے سارے رشتے ہی ختم کر دیے اور گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ میری والدہ جنہوں نے ہمیشہ جازی کو اپنی سگی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہا تھا اس کی اس بے اعتنائی پر ہلکان ہو کر رہ گئیں۔ صدمہ تو میرے والد صاحب کو بھی بہت



تھا، مگر وہ مروت تھے، باہمت تھے۔ دل ہی دل میں بہت کڑھتے رہے مگر زبان سے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔

مجھے بھی اس رشتے کے ختم ہونے پر بہت افسوس ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو ہم سب لوگ جازی کے لیے اداس رہے، مگر پھر آہستہ آہستہ سب ہی اس کے بغیر رہنے کے عادی ہوگئے۔

اب میں نے بھی اپنی تعلیم مکمل کرکے سلائی، کڑھائی، کھانا پکانا اور دیگر امور خانہ داری وغیرہ بھی سیکھ لیے تھے اس لیے امی مجھے بیاہنے کی فکر میں تھیں۔ وہ جلد سے جلد میرے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں، کیوں کہ میرے بعد میری باقی بہنیں بھی شادی کی مناسب عمر تک پہنچ چکی تھیں۔ یوں تو رشتے بہت آرہے تھے، مگر امی کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھیں۔ آخر کار ایک چند خواتین جو کئی ماہ سے رشتے کے لیے مصر تھیں، امی نے انہیں ہاں کر ہی دی۔ لڑکا ہماری ذات برادری کا تھا۔ اچھا، خوب صورت، پڑھا لکھا اور برسر روزگار۔ امی کو اور کیا چاہیے تھا۔ امی نے تھوڑی سی چھان بین کے بعد باقاعدہ رشتہ پکا کر دیا۔ دعائے خیر کے چند دن بعد دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ لڑکے کی والدہ نے میرے دائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور کئی ہزار ہزار کے نوٹ میرے دوسرے ہاتھ میں تھما دیے۔ لڑکے کی دونوں بہنوں نے بھی دو، دو ہزار مجھے مبارک کے طور پر دیے۔ جاتے ہوئے لڑکے کی ماں اور بہنیں بہت دیر تک اپنے بیٹے اور بھائی کے ساتھ خوش رہنے کی دعائیں دے کر گئیں۔

ہمارے محلے کی کچھ عورتیں اور لڑکیاں میری اتنی اچھی ساس نندوں کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کرنے لگیں اور کچھ تو حسد کے مارے الٹی سیدھی باتیں بھی کرنے لگیں، مگر ہم گھر والوں میں سے کسی نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرے کہ زمانہ تو ہمیشہ سے دوسروں کی خوشیوں پر جلتا اور حسد کرتا آیا ہے۔ مگر اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ خوشیاں، خوش نصیبی صرف چند دنوں کی مہمان تھیں اور لوگوں کی نظر تو پیرے کو بھی راکھ کر دیتی ہے اور پھر میری خوشیوں کو بھی لوگوں کی نظر کھا گئی۔ حسد کرنے والوں کا دلی ارمان پورا ہوگیا اور دوسری مرتبہ پھر میری یہ نسبت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ ہوا کچھ

یوں کہ منگنی کے کچھ دنوں بعد ہمارے گھر ایک انجانے نمبر سے کال آئی، فون میں نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔ دوسری جانب کوئی لڑکی بات کر رہی تھی۔

اس نے اپنا تعارف میرے دوسرے منگیتر کی منکوحہ کے حوالے سے کرایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "میں اور تمہارا منگیتر شاہ زیب کورٹ میرج کر چکے ہیں، مگر شاہ زیب اپنے مکان کی تیاری تک (جو کہ میرے نام پر بن رہا تھا) اس شادی کو راز رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے والدین چوں کہ اس کی اپنی پسند سے شادی کرانا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے تمہارا انتخاب کیا، مگر یاد رکھنا شاہ زیب تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ مجھ سے شادی کر چکا ہے اور جلد ہی وہ مجھے اپنے والدین سے ملوائے گا۔ اگر وہ والدین کی زور زبردستی کی وجہ سے تمہیں بیاہ کر گھر لے بھی آیا تو تمہاری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی اور ویسے بھی جس کی دل میں جگہ نہ ہو اس کی گھر میں جگہ ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔ اگر تمہیں اپنی زندگی کی خوشیاں اور عزت چاہیے تو شاہ زیب سے تعلق ختم کرلو ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پچھتاوے تمہارا مقدر بن جائیں گے۔ ویسے تو شاہ زیب بھی جلد اپنے والدین سے بات کرنے والا ہے، مگر بہتر ہے کہ انکار تمہاری طرف سے ہو۔ میری ان باتوں کو جھوٹ مت سمجھنا۔ اگر یقین نہ آئے تو شاہ زیب سے خود بات کرلو اور تسلی کرلینا وکے۔" اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جو ریسیور تھامے کھڑی تھی، اس کی باتیں سن کر گویا میں پتھر کا بت بن گئی تھی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے، مگر دکھ، صدمے اور بے یقینی نے گویا میری قوت گویائی سلب کرلی تھی۔ میں حواس باختہ ہوکر گویا زمین پر بیج کی طرح گر گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میری آہوں پر امی سمیت تمام بہنیں اپنے اپنے کمروں سے بھاگتی ہوئی آئیں اور میرے رونے کی وجہ دریافت کرنے لگیں۔

روتے روتے میں نے بڑی مشکل سے امی کو فون والی لڑکی کی تمام گفتگو بتادی، پہلے تو امی کو یقین نہیں آیا۔ امی اسے کسی دشمن کی چال کہتی رہیں، مگر جب تھوڑی دیر

بعد امی نے شاہ زیب کے نمبر پر شاہ زیب سے بات کی تو پہلے تو شاہ زیب انکار کرتا رہا، مگر جب امی نے فون والی لڑکی کا نام پتا بتایا تو شاہ زیب کچھ بوکھلانے لگا۔

امی نے شاہ زیب کو کھری کھری سنائیں اور فون پر ہی رشتہ ختم کر دیا۔ شاہ زیب کی تو مشکل ختم ہو گئی تھی، مگر مجھ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور میں خود کو منحوس سمجھنے لگی تھی۔ پتا نہیں میرا نصیب مجھ سے کیوں روٹھ گیا تھا۔ مجھے اپنی بدنصیبی سے ڈر لگنے لگا اور میں ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ "کہیں میری نحوست کا سایہ میری بہنوں پر نہ پڑ جائے۔ کہیں ان کے لیے آنے والے رشتے میری وجہ سے واپس نہ لوٹ جائیں، کہیں میری بدنصیبی کی سزا انہیں نہ ملے۔

کبھی کبھی میں سوچتی پتا نہیں مجھ سے ایسا کون سا بڑا گناہ ہو گیا ہے کہ جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔ میں نے تو آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا تھا، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، پھر مجھے یہ سزا کیوں؟

دوسری منگنی کے ٹوٹنے سے میں بہت دل برداشتہ اور غمگین ہو گئی تھی اور تنہائی پسند بھی۔ اب گھر سے باہر نکلنا عذاب لگتا تھا۔ عورتوں کی عجیب و غریب باتیں، مجھے دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنا، میرا جی چاہتا لوگوں کی نظروں سے کہیں دور چلی جاؤں، مگر میں جتنا لوگوں سے بچتی لوگ اتنا ہی مجھے احساس دلاتے کہ میں وہ منحوس لڑکی ہوں جو اپنے گھر کی دہلیز پر سانپ بن کر بیٹھی ہوئی ہوں۔

مجھے تو لگتا تھا لوگوں کی باتیں اور طنزیہ نظریں ایک دن مجھے زندہ درگور کر دیں گی۔ اب تو میرے اپنوں کے رویوں کی تبدیلی نے بھی مجھے بہت حساس بنا دیا تھا۔ تین سال تقریباً اسی عذاب میں گزرے، اس دوران رشتوں والے تو آتے جاتے رہے، مگر وہ کہتے ہیں نہ کہ "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔" اس محاورے کی مصداق ابھی میرے والدین کوئی فیصلہ کرنے سے گھبرا رہے تھے، مگر تقدیر ایک مرتبہ پھر میری دہلیز پر ایک نئے کھیل کے لیے دستک دے رہی تھی۔

دکھ ختم نہیں ہوتے، ہاں البتہ کم یا مدھم ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان کی کسک ہمیشہ بجھی ان بجھی راکھ کی طرح دل میں ہلکی سی تپش ضرور زندہ رکھتی ہے۔ ہم اگر بھول بھی جائیں تو لوگ ہمیں بھولنے نہیں دیتے، بلکہ ہر قصہ، ہر واقعہ اپنی آنے والی نسلوں تک منتقل کرتے جاتے ہیں۔

تیسری مرتبہ پھر جب قسمت نے میرے دروازے پر دستک دی تو کچھ حیل و حجت کے بعد میں نے بند دروازہ کھول ہی دیا اور آنے والے کو خوشی سے خوش آمدید کہا صرف اس لیے کہ شاید اس بار قسمت مجھ پر کوئی عنایت کر ہی ڈالے، شاید تقدیر اس شخص کے ہاتھوں میرے پرانے دکھوں کا مداوا کر دے اور شاید میری خزاں بھری زندگی میں پھر سے بہار آ جائے۔

آنے والا پاک فوج یعنی آرمی کا خوب صورت کڑیل جوان تھا، جیسی خوب صورت شخصیت ویسا ہی پیارا نام۔ میری بہنیں اور میری کزنز تو کہنے والی دوستیں بھی کہتی تھیں کہ "ندیم احمد اس دنیا کا نہیں پرستان کا شہزادہ ہے یا ایسا شہزادہ جو راستہ بھول کر زمین پر آ گیا ہو۔"

میں تو یہ سب سن کر نازاں ہوتی اپنی تقدیر پر۔ بھول گئی وہ سارے گلے شکوے جو مجھے اپنے نصیب سے تھے۔ جسے ندیم احمد جیسا شخص مل جائے اسے تو گویا ساری کائنات مل جاتی ہے۔ کہانیوں، قصوں اور ڈراموں کے ہیرو تو سب ہی اس کے سامنے زیرو تھے، ہیرو تھا تو صرف ندیم احمد۔ (یہ میرا اس وقت کا خیال تھا)۔

ندیم کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ماں تھی، سسر تھے یعنی کے ندیم کے والد، مگر ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا، کیوں کہ سارا اختیار تو ندیم کی ماں اور بہنوں کا تھا۔

ندیم کی ماں اور بہنیں بہت تیز اور شاطر تھیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ہم سب سمیت گھر کا ایسے جائزہ لینیں جیسے انہیں کسی نے ہماری جاسوسی پر لگا رکھا ہو۔ ہمارے اٹھنے بیٹھنے کے انداز، چلنے پھرنے، باتیں کرنے کا انداز، ہماری چال ڈھال ہر ایک پر خاص نظر ہوتی۔

مجھے تو انہیں کچھ خاص ہی توقعات تھیں۔ ماں سے بھی بیٹیاں زیادہ تیز تھیں، مگر مجھے کچھ خاص پروا نہیں تھی، کیوں کہ ندیم کے تصور نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔

بالآخر ڈیڑھ دو ماہ میں میری اور ندیم کی منگنی طے پا گئی، ہم لوگوں نے ندیم کے گھر والوں سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ پچھلی دونوں منگنیوں کے ٹوٹنے کی وجوہات سب سچ سچ بتا دیں تاکہ بعد میں انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس مرتبہ بھی منگنی دھوم دھام سے ہوئی

بلکہ اب کی بار تو میں بہت خوش تھی کہ اتنا خوب صورت نوجوان میرا ہمسفر بن رہا تھا (میں یہاں اعتراف کرتی ہوں کہ ہماری تینوں کی مرتبہ سب سے بڑی خطا یہ تھی کہ ہم نے صرف خوب صورتی کو دیکھا اور اسی پر مر مٹے)۔

منگنی کے بعد ندیم کئی مرتبہ ہمارے گھر بھی آیا۔ وہ مجھے اکثر فون کرتا تھا اور اکثر مجھے بہت خوب صورت رومانس بھری شاعری سے پُر خط بھی لکھتا تھا، جن کے ذریعے مجھے وہ احساس دلاتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم گھنٹوں فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے اور جب روبرو ملتے تب بھی ہمارے درمیان خاموشی کا وقفہ بہت کم ہوتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ گفٹ کے طور پر دیا تھا۔ میری طرف سے دی گئی ہر چیز میں تو میرے احساسات، میرے جذبات اور میری محبت شامل تھی، مگر اس کے دل میں لالچ، خود غرضی، مکاری اور عیاری تھی۔ یہ مجھے سات برس بعد معلوم ہوا۔ خیر منگنی کے دو تین ماہ بعد ہماری شادی ہوگئی۔ میرے والدین نے مجھے لاکھوں کا جہیز دیا۔ کئی تولے سونا، علیحدہ سے پانچ لاکھ کیش، اس کے علاوہ استعمال کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز۔ ابا تو گھر دینے کو بھی تیار تھے، مگر کچھ لوگوں نے ابا کو سمجھایا کہ یہ غلطی مت کرنا۔ تمہاری سات بیٹیاں ہیں، کل کلاں سب بیٹیوں کے سسرال والوں نے ایسی فرمائش کر دی تو تم کیا کرو گے؟ یہ بات ابا کو پریشان کر گئی۔ سو انھوں نے گھر دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ جس دن میں ایک سے مسز ایک بنی وہ لمحہ میری زندگی کا حسین ترین لمحہ تھا۔ میں اپنی قسمت پر بے انتہا خوش تھی۔ من کی اصل خوشی کی وجہ سے مجھ پر ٹوٹ کر روپ آیا۔ سب کہہ رہے تھے کہ یہ دلہن تو پرستان کی کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔ میری اور ندیم کی جوڑی کو لوگوں نے چاند سورج کی جوڑی سے تشبیہ دی۔

وہ رات بھی میری زندگی کی سب سے بہترین اور خوب صورت رات تھی۔ ندیم نے منہ دکھائی میں مجھے گولڈن رنگ گفٹ کی۔ ہم ساری رات ایک دوسرے کے ساتھ مستقبل کے سہانے سپنے دیکھتے رہے اور اپنی آنے والی زندگی کے متعلق منصوبے بناتے رہے۔ شروع کے دنوں میں میری ساس نندوں نے بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا، جہاں میں پاؤں رکھتی وہاں وہ ہتھیلی رکھنے کو تیار دکھائی دیتیں۔ شادی کی دعوتوں کے بعد ہم دونوں ہنی مون منانے اسلام آباد بھی گئے۔ وہاں سے خوب صورت لمحات اور یادوں کو ہم اپنے کیمرے میں مقید کر کے ساتھ لے آئے۔ چوں کہ ندیم کی پوسٹنگ آج کل اسلام آباد ہی میں تھی اس لیے ندیم نے مجھے اپنے کئی دوستوں سے بھی ملوایا۔ ان کے سب ہی دوستوں اور ان کی بیگمات نے میری بہت تعریف کی اور مجھ سے بہت متاثر ہوئیں۔ تقسیم اعزازات کی ایک تقریب میں بھی ندیم مجھے ساتھ لے کر گئے، وہاں پر بھی بہت سے لوگوں نے ہماری جوڑی کو بہت سراہا۔ ایک ماہ کی چھٹی کب ختم ہوئی، ہمیں پتا ہی نہ چلا۔ دونوں ہی اداس ہو گئے، مگر ندیم نے مجھے کچھ حوصلہ بھی دیا کہ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ ہر ہفتے کی شام کو گھر آجایا کریں گے، مگر اسے قسمت کی خرابی کہیے یا میرے سسرال والوں کا منصوبہ کہ جلد ہی ندیم نے مجھے یہ خبر دی کہ وہ ڈیوٹی سخت ہونے کی وجہ سے اب مہینے دو مہینوں بعد ہی گھر کا چکر لگا سکے گا، وہ بھی دو تین دن کے لیے۔ میں اس خبر سے سخت اداس ہوئی، مگر میری سادہ دلی کہ میں آنکھیں بند کیے ہر بات پر یقین کرتی چلی گئی، بغیر کسی احتجاج کے، پھر یہیں سے میری بدنصیبی کا آغاز ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری ساس نندوں کے رویے بدلنے لگے۔ میری غیر استعمال شدہ اشیاء پر میری نندیں قبضہ کرنے لگیں، میرا زیور چوری کر لیا۔ ندیم کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا گیا کہ وہ فون پر بھی میری بات سننے کا روادار نہ تھا۔

ڈیڑھ ماہ بعد جب دو تین دن کے لیے ندیم گھر آیا تو وہ بالکل بدلا تھا۔ میری طرف تو اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، سارا دن ماں بہنوں کے پاس بیٹھ کر ان کی سازشوں میں شریک رہا۔

رات کو جب اپنے کمرے میں آیا تو میری ہر بات پر الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق مجھ پر برستا رہا۔ اس نے میری کوئی بات نہیں سنی، بلکہ مجھے ہی ہر معاملے میں قصوروار ٹھہراتا رہا۔ میں اس کے اتنی جلدی اور اس قدر بدل جانے پر سخت متعجب تھی۔

اپنی غرض کے لیے کچھ وقت اس کا موڈ ٹھیک ہوا،

اس نے مجھے منایا، ہم دونوں ہنسے مسکرائے اور صبح پھر وہی منظر اور پھر ہمیشہ کے لیے یہی وہ منظر میری زندگی بن گیا۔ میں آپ کو یہ بات بتانا بھول گئی کہ ندیم کے گھر والے کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے، کیوں کہ ان کا ذاتی گھر ایک دور کے گاؤں میں تھا۔ شہری سہولتوں کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ قبل ہی یہاں آ کر رہنے لگے تھے۔ بقول میری ساس کے یہاں مکان بنانا اس قدر مشکل تھا کہ فی الحال وہ کچھ عرصے کے لیے کرائے کے مکان میں رہنے پر مجبور تھے۔

گھر بھی ایسا تنگ کہ گویا مرغیوں کا ڈربا۔ میرے جہیز کا سارا سامان کباڑ کی صورت اوپر تلے چڑھا دیا گیا تھا۔ کوئی بھی چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ کمرے کی اس ابتر حالت سے تو مجھے سخت کوفت ہوئی، ہاں البتہ الیکٹرونکس کی تمام چیزیں میری ساس نندوں نے اپنے مشترکہ کمرے میں رکھ لی تھیں۔ فریج، ٹی وی، واشنگ مشین، ٹیپ، ایئر کولر اور باقی کچھ دوسری اشیاء باہر برآمدے میں رکھ دی گئی۔ استری اسٹینڈ جو آئرن سمیت برآمدے میں دو ماہ بعد ہی دونوں چیزیں بے کار پڑی تھیں۔ چوں کہ میری ساس نندیں ہر چیز کو بڑی بے دردی سے استعمال کرنے کی عادی تھیں۔ (صرف دوسروں کی چیزوں کو) سو بجلی کے آنے جانے کی پروا کیے بغیر ہر چیز آن رہتی۔ فریج کا اسٹیپلائزر بھی کچھ عرصے میں ہی ری پلیسمنٹ کروانا پڑا۔ بجلی کی آنکھ مچولی کی وجہ سے فریج کے خراب ہونے کا خدشہ تھا، مگر وہاں پروا کسے تھی۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے شادی کے ابتدائی شروعات ہی میں نے اپنی ساس نندوں کی برائیاں شروع کر دیں۔

قارئین کرام! جب میں ندیم احمد کی دلہن بن کر اس گھر میں آ گئی تب مجھے پتا چلا ندیم احمد تو اپنی ماں اور بہنوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہے، ایسی کٹھ پتلی جس کے تمام اختیارات کی ڈور اس کی ماں بہنوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگرچہ وہ مجھے بڑی چاہ سے اس گھر میں بیاہ کر لے گئیں، مگر ان کی دلچسپی میری ذات کے بجائے میرے قیمتی جہیز میں تھی۔ وہ سب کچھ حاصل ہوتے ہی انہیں میرا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا، سو وہ مجھے ہر طریقے سے زیر کرنے کی کوشش کرنے لگیں، حالاں کہ میں تو اس گھر میں اُن سب کی خدمت کا جذبہ ہی لے کر گئی تھی۔

شروع کے کچھ دن تو ندیم کا رویہ بہت اچھا رہا۔ مجھے اس کی موجودگی میں ہر پل یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا کوئی جنت ہے، میں کوئی حور ہوں اور وہ میرا دیوتا۔ خوشیاں میرے قدموں تلے زمین کی طرح بچھی تھیں، مگر جلد ہی ان خوشیوں کو حسد رقابت کی ازلی آگ نے جلا کر کوئلہ کر دیا۔

مجھ سے تو جو برتاؤ ہوتا سو ہوتا، مگر میری قیمتی اشیاء کا ضرورت سے زیادہ استعمال مجھے سخت تکلیف دیتا۔ یعنی جو ڈھیر سارے کپڑوں کے لیے واشنگ مشین تھی تو کمری ساری رات گئے تک لگی رہتی، آخر میں مٹی دھول اور ریت سے اٹی ساقیاں اور گندے پوچھے بھی مشین میں ڈال دیے جاتے۔ ایئر کولر جو گرمیوں کے آغاز ہی سے ساس نے کمرے سے نکال کر باہر برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ساس نندوں نے اس پر بھی قبضہ جما رکھا تھا۔ ندیم تو زیادہ تر ڈیوٹی پر رہتے اور میں اکیلی کمرے میں گرمی میں جھلستی رہتی، جبکہ ایئر کولر کے سامنے ساس، نندیں اپنی چارپائیاں بچھا کر پڑ جاتیں۔ ٹی وی، ٹیپ، جیپر ورلڈ غرض ہر چیز کا بے دریغ اور بے دردی استعمال ان لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اگر کوئی چیز خراب ہو جاتی تو وہ میرے حوالے کر دی جاتی کہ یہاں کون ٹھیک کروائے تم اپنی ماں سے کہو کر ٹھیک کروا دیں۔ اور اس "ٹھیک" پر جو خرچہ آتا، وہ میری ماں کی طرف سے ہوتا۔

ندیم سے بات کرتی تو وہ کہتا کہ "میں کیا کروں، گھر کے اخراجات، تمام بلز کی ادائیگی، مکان کا کرایہ میں کیسے مینج کروں، ابھی میرے سر پر جوان بہنوں کا فرض دھرا ہے۔ تمہاری فضول خرچیوں کے لیے کہاں سے پیسے لاؤں۔ تمہارا باپ لاکھوں کماتا ہے، اگر تم بیٹیوں پر کچھ تھوڑا بہت خرچ کر دیتا ہے تو کیا حرج ہے؟" اس کے جواب میں اگر میں کوئی جملہ کہنے کے لیے زبان کھولنا ہی چاہتی تو اس کی ماں بہنیں اس کی حمایت کرنے کے لیے موجود ہوتیں۔ پھر ایسے ایسے دلائل دیے جاتے کہ مجھ غریب کو خاموش ہونا پڑتا۔ میری اس چپ اور ان کی ہر موقع بے موقع مدد کی وجہ سے ان لوگوں کو اور شہ مل گئی۔

ندیم اور اس کے گھر والے میرا خرچ تو کیا اٹھاتے، الٹا میرے اور میری ماں کے محتاج بن کر رہ گئے۔

حق مہر تک ندیم نے نہیں ادا کیا، الٹا پانچ لاکھ کا جو میرے والدین نے جہیز میں مجھے کیش دیا تھا وہ اور میرا سونا بھی مجھ سے اس بہانے سے لے لیا کہ آنے جانے کے لیے لوکل گاڑیوں پر جانے کے بجائے ہم کیوں نہ اپنی ذاتی گاڑی لے لیں، پھر چھٹیوں میں بے کار پھرنے کے بجائے بجٹ سے کچھ نہ کچھ آمدن بھی مل جایا کرے گی۔

یہ جہیز کیش کوئی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے بھی فوراً کیش اور سونا اس کے حوالے کر دیا، مگر کافی دن انتظار کے بعد جب ندیم سے باز پرس کی تو پہلے تو وہ ٹال گیا کہ ڈیلر کوئی اچھی گاڑی کے انتظار میں ہے۔ لیکن گاڑی کہ کچھ عرصہ اس پر کوئی خرچ وغیرہ نہ کرنا پڑے، مگر ایک ماہ بعد بھی گاڑی نہ آئی تو میں ندیم سے لڑ پڑی کہ آخر وہ مجھے کب تک ٹالتا رہے گا، میری کافی دیر تک اس سے بحث جاری رہی۔ اس کے بعد جو اس نے بات بتائی وہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکالنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ رقم اور وہ زیور جو وہ گاڑی کے لیے لے گیا تھا، وہ راستے میں کچھ نقاب پوشوں نے اس سے لوٹ لی، کیوں کہ ان کے پاس ہتھیار وغیرہ تھے، اس لیے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

یہ سن کر میں اپنے حواس میں نہیں رہی۔ میں نے اس مکار اور فریبی کی بات پر یقین نہیں کیا اور اس سے خوب لڑی اور رقم اور زیور کی واپسی کا مطالبہ کیا، مگر اب سب کچھ بے کار اور بے سود تھا۔

میری امی کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے سخت برا بھلا کہا۔ ان کے نزدیک میں ایک انتہائی بے وقوف لڑکی تھی جس نے اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ انتہائی بے وقوفانہ حرکت کی تھی۔ امی نے ندیم سے باز پرس کی تو اس نے امی کو بھی یہی کہا اور جب امی نے اسے پولیس کی دھمکی دی تو وہ اچھل پڑا کہ امی اسے جھوٹا اور فریبی کیوں سمجھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ یہ سب کر کے خود اپنی بیٹی کی بدنامی کروائیں گی۔ امی بضد تھیں کہ وہ پولیس کی مدد ضرور لیں گی، مگر میں نے بڑی مشکل سے امی کو اس حرکت سے روکا۔ بقول ندیم کے رقم اور زیور تو ہاتھ سے گئے مگر عزت ہاتھ سے نہیں جانی چاہیے کہ عزت کے بغیر جینا کیا جینا، پھر عزیز رشتے داروں کی باتوں کا خوف۔ تھانے کچہریوں کے چکر ذلت و بدنامیوں کا باعث بنتے۔

امی کو ندیم کی اس حرکت اور میری اس بے وقوفی پر سخت صدمہ تھا۔ انہوں نے ابو کو بھی اس واقعے کی خبر کر دی تھی۔ ابو فون پر مجھ سے سخت ناراض ہوئے کہ کم از کم مجھے زیور تو ندیم کے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھے۔ ہاں واقعی یہ میری بہت بڑی حماقت تھی۔

ندیم تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اس لیے اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی خوشامدانہ رہتا، مگر میں اتنی بڑی بات اتنی جلدی کیسے بھول سکتی تھی۔ سو ندیم کی اتنی (مصنوعی) لگاوٹ کے باوجود بھی میرا دل اب اس کی طرف سے بہت خراب ہو چکا تھا۔

دو تین دن بعد ندیم تو اسلام آباد واپس چلا گیا، مگر میری طبیعت اور مزاج بدستور خراب رہے۔ ایک تو ٹینشن اوپر سے متلی، بار بار کی قے سے سخت نقاہت ہو رہی تھی، مگر میرے سسرال والوں کا رواج تھا کہ چاہے جتنی بھی طبیعت خراب ہو جائے، مگر ڈاکٹر کے پاس ہرگز نہیں جانا۔ آخر انہوں نے بھی تو اتنے بچے پیدا کیے تھے۔ بقول میری ساس کے اس حالت میں اتنی طبیعت تو خراب ہوتی ہے سو مسئلے مسائل ہو جاتے ہیں۔ اب چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا فضول خرچی کے سوا کیا ہے؟ جہاں خرچ ہوتا ہو، وہاں فضول خرچی کا بھلا کیا سوال۔"

مرتے جیتے یہ نو ماہ جانے کیوں نو سال کے برابر ہو گئے اور ان نو ماہ میں میری ساس نے مجھے کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جانے دیا، بلکہ ایک دو مرتبہ امی کے گھر سے میں اپنی بہنوں کے ساتھ سول اسپتال کی ایک قابل لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی۔ لیڈی ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق مجھے اس وقت اچھی خوراک، آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی اور میرا کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ نارمل زچگی کسی صورت ممکن نہیں تھی۔

جب میری امی نے میری ساس سے بات کی تو وہ بگڑ ہی گئی اور کہنے لگی کہ "ڈاکٹرز وغیرہ اپنے پیسوں کے

لیے زیبا کہتے ہیں اور وہ ہرگز میرا کیس اسپتال میں نہیں کروائے گی اور نہ ہی وہ پہلے بچے کی پیدائش ماں کے گھر ہونے دے گی۔"

ندیم میرا شوہر اور آنے والے بچے کا باپ بننے کے باوجود کچھ زیادہ خوش نہیں تھا، اگر میں اس موضوع پر کوئی بات کرتی تب بھی وہ کچھ خاص خوشی کا تاثر نہیں دیتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے کہا کہ اب تو وہ مجھے کچھ نہ کچھ اضافی خرچ دے کہ اب ہم دونوں کو اچھی خوراک اور علاج معالجے کی ضرورت ہے، مگر ندیم نے اس کے جواب میں یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں اپنی ساری تنخواہ امی کی ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں، تم امی سے مانگ لیا کرو۔ میں امی سے کہہ دوں گا۔ حالاں کہ وہ بخوبی واقف تھا کہ اس کی ماں خرچ کے نام پر کبھی مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گی اور میں بھی اس کی ماں سے بات نہیں کرسکوں گی۔

میں تو گویا شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ تھی۔ سارا سارا دن اس حالت میں بھی میں صبح سے رات گئے تک کام کرتی رہتی، نقاہت اور تھکن سے بُرا حال ہو جاتا تو ذرا سا بستر پر لیٹتی تو اٹھنے کو بالکل دل نہ کرتا، مگر ساس نندوں کی باتوں اور طعنوں کے ڈر سے جلدی اٹھ جاتی۔ میں نے تو اس گھر میں ہر ممکن گزارہ کرنے کی کوشش کی، حالاں کہ اس گھر میں میرے جانے کے بعد ہر طرح کی تکلیف کا سامان کیا گیا تھا۔ کوئی آنے کا کنستر خالی رہتا۔ صابن، واشنگ پاؤڈر، تیل، پاؤڈر اور چھوٹی موٹی ضرورت کی تمام اشیاء میری ماں پورا کرتی رہتی۔ اکثر میں کئی کئی وقت بھوکی رہتی۔ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو میں کسی بہانے سے ماں کے گھر آکر ایک دو وقت کا کھانا کھاتی اور خشک میوہ جات یا بسکٹ وغیرہ کے ایک دو پیکٹ امی سے منگوا کر ساتھ لے جاتی۔ اس کے باوجود میری ساس نندیں آئے دن خود تو میرے ساتھ جھگڑا کرتی ہی تھیں، ندیم کے بھی کان بھرتی رہتیں۔ یہاں تک وہ اب گالی گلوچ کے علاوہ ہاتھا پائی پر بھی اتر آتا تھا۔ لیکن اس بات کا ذکر میں نے کبھی اپنی امی سے نہیں کیا تھا۔ البتہ میری پڑوسن جو مجھے اس طرح پٹتے نہیں دیکھ سکتی تھیں آکر میری ماں کو اطلاع کردیتی۔ ان

کی اطلاع پر اگلے دن ہی امی ہمارے گھر پہنچ آتیں، پھر امی اور میری ساس نندوں کی لڑائی شروع ہو جاتی۔ امی مجھے کھینچتیں کہ "میرے ساتھ چلو کیوں اس جہنم میں رہ رہی ہو۔" مگر میں ہمیشہ انکار کردیتی کہ میں کسی طور پر اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

امی مجھے بھی بُرا بھلا کہہ کر واپس لوٹ آتیں۔

انہی لڑائی جھگڑوں میں میری زچگی کا وقت آن پہنچا۔ زچگی میں کچھ ہی دن باقی تھے کہ ندیم کی طرف سے مجھے ایک شدید صدمہ پہنچا، ندیم نے فون پر مجھے ایسی خبر سنائی کہ جسے سنتے ہی میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ پاسکی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ مجھے کافی دیر بعد ہوش آیا، مگر میں ابھی شاک کی کیفیت میں تھی، یہ خبر تو کافی عرصے سے ہمارے اردگرد گردش کررہی تھی کہ ندیم اپنے دوست کی بہن ثانیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر اپنی ماں کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا، لیکن اب بھی ان دونوں کا ملنا جلنا پہلے جیسا ہی تھا۔ میں تو اس خبر کو افواہ ہی سمجھتی رہی، مگر آج ندیم نے خود مجھے اطلاع دی کہ وہ ابھی ابھی ثانیہ سے کورٹ میرج کر کے آیا ہے، تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس خبر نے مجھے اچانک ہی ذہنی طور پر مفلوج کردیا۔ ندیم بے شک بہت بُرا سہی مگر مجھے ہرگز اس سے یہ توقع نہیں تھی، میں تو دو سالوں میں ہی اتنے بڑے ظلم کا شکار ہوچکی تھی کہ میں کس سے فریاد کرتی اور کس پر الزام لگاتی کہ میری تقدیر ہی مجھے برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اس خبر کے دو دن بعد رات کو اچانک مجھے پیٹ کے نچلے حصے میں ہلکا سا درد محسوس ہوا جو بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میری بلند آوازیں سن کر میری ساس نندیں بھاگ کر میرے کمرے میں آئیں۔ میری ساس میری یہ کیفیت بھانپ گئی اور فوراً ہی الٹے پاؤں باہر نکل کر اسی دائی کو بلا لائی۔ چوں کہ میرا کیس کافی پیچیدہ تھا، سو تکلیف بھی اتنی ہی شدید تھی۔ میں نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور منتیں کیں کہ مجھے اسپتال لے جاؤ، مگر میری ساس ذرا نہ مانی اور دس بارہ گھنٹوں کے بعد جب عبید یعنی میرا پہلا بیٹا اس دنیا میں آیا، تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ گویا مجھ میں جان ہی باقی نہیں بچی

ہے۔ مجھے بیٹے کی پیدائش کے بعد بھی ویسی ہی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

عباد کی پیدائش کی اطلاع میرے میکے والوں کو ملی تو خوشی خوشی میری امی اور بہنیں مٹھائیوں، فروٹ اور دیگر لوازمات سمیت اسی وقت آن پہنچیں، مگر جب انہوں نے میرا اجڑا ہوا روپ دیکھا تو پریشان ہو گئیں اور میری زچگی کے متعلق میری ساس سے باز پرس کرنے لگیں۔ میری ساس اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ میری امی کو سب ہاتھ کے ہاتھ بتا دیتی، مگر امی پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں اور میری ساس کے باہر جاتے ہی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگیں۔ ابھی میں امی کو تسلی آمیز الفاظ کہنا ہی چاہتی تھی کہ مجھے پھر موت جیسی سخت تکلیف محسوس ہوئی اور فوراً ہی میں کراہنے لگی۔ امی میری اس کیفیت پر گھبرا اٹھیں اور میری بہن سے ڈاکٹر سعدیہ کا نمبر ملانے کو کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر سعدیہ میرے پاس میرے چیک اپ کے لیے موجود تھیں۔ میری ساس نے اس پورے واقعے پر خوب ہنگامہ کیا۔ ڈاکٹر سعدیہ کے ساتھ بھی کافی بدتمیزی کی، مگر ڈاکٹر سعدیہ نے اس جاہل عورت کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی اور میرا معائنہ کرنے لگی۔

جوں ہی ڈاکٹر سعدیہ نے مجھے دیکھا اس کے ایک آہ کے ساتھ دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور جلدی سے چادر مجھ پر اوڑھاتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"آئی ایم سوری میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی حالت تو بہت خراب ہو چکی ہے۔ یہ کیس تو اب کوئی نہیں لے گا۔ آپ نے اس کے ساتھ کیا جانوروں والا سلوک کروایا ہے۔ کیا آپ کو نہیں پتا تھا اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا؟ میں تو حیران ہوں یہ بچی کیسے گئی۔" ڈاکٹر سعدیہ میری ساس سے مخاطب تھیں۔ ڈاکٹر سعدیہ کی باتوں نے میری ساس کو شرمندہ کیا تھا یا نہیں، مجھے کچھ خبر نہیں، مگر ان کی باتوں نے میری اور میری امی کی جان ضرور نکال دی تھی اور واقعی ڈاکٹر سعدیہ کی بات سچ تھی۔ میری امی نے مجھے کئی لیڈی ڈاکٹرز کو دکھایا۔ مجھ پر بھاری خرچ کیا، مگر میری حالت میں کوئی بہتری نہ آئی۔ مجھے تین مرتبہ ٹانکے لگائے گئے مگر ہر مرتبہ تکلیف سہنے کے باوجود کچھ ہی دنوں میں ٹانکے ادھڑ جاتے۔ اب تو ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد ہی صحیح طرح سے میرا علاج ہو سکے گا، لیکن دوسرے بچے کی پیدائش تین چار سال سے پہلے نہیں ہونی چاہیے۔

مجھے قدرت نے چاند سا بیٹا تو دیا مگر میرا بیٹا بھی میری طرح کوئی اچھے نصیب لے کر نہ آ سکا، بلکہ دن بہ دن ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میری ساس یعنی عباد کی دادی نے کبھی عباد سے پیار نہیں کیا، کبھی اسے گود میں نہیں کھلایا، نہ ہی ندیم اور اس کی بہنوں نے کبھی عباد سے محبت جتائی۔ عباد اس قدر پیارا تھا کہ کوئی غیر بھی اسے دیکھتا تو پیار کیے بغیر نہ رہتا۔ عباد تھا بھی اتنا خوب صورت، بالکل ندیم کی کاپی۔ میں بہت کمزور تھی اس لیے میں اسے فیڈر سے ہی دودھ پلایا کرتی۔ یہ سارا خرچہ بھی میری والدہ ہی اٹھایا کرتی تھیں۔ پیمپرز اور دوائیں وغیرہ بھی کے لیے مجھے امی کی محتاج ہونا پڑا۔

امی لگاتار مجھے سمجھاتی رہیں کہ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا تم ندیم سے طلاق لے کر گھر آ جاؤ، ابھی تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ ایسے شوہر کا کیا فائدہ جو اپنی خواہش کے تعلق کے علاوہ کوئی رشتہ ہی نہ رکھے، جو تمہاری ضرورت بھی نہ پوری کر سکے، الٹا ہر وقت تمہیں ذلیل کرتا رہے۔"

امی کا کہنا بجا تھا مگر میں جانتی تھی ندیم جیسا بھی ہے، میرے سر پر سائبان کی طرح ہے، بے شک میں بہت خوب صورت تھی، جوان تھی، مجھے کوئی بھی شخص با رضا و رغبت اپنا لیتا، مگر مجھے اب عباد کے لیے سوچنا تھا۔ میں اسے کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے امید تھی ندیم ایک نہ ایک ضرور اپنے خون کی طرف کھنچا چلا آئے گا، سو میں برداشت کرتی رہی، یہاں تک کہ میرے وجود میں ایک مرتبہ پھر ندیم کی وقتی محبت کی نشانی ظاہر ہونے لگی۔ ان پانچ سالوں میں ندیم نے صرف مجھ سے اتنا رابطہ رکھا کہ وہ جب گھر آتا تھا، نقاہت کے باوجود مجھے بھی سونپ رہتا تھا، جبکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اس کے موبائل کی بیپ اسے ثانیہ کے احکامات یاد دلاتی رہتی۔ ثانیہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی سائے کی طرح ہمارے ساتھ تھی۔

ندیم نے ثانیہ کے کہنے پر کئی مرتبہ مجھے طلاق دینے کی کوشش کی، لیکن میں ہی ہر مرتبہ اس کے پاؤں پڑ جاتی تھی، اسے عباد کے واسطے دے کر خاموش کرا دیتی تھی۔ اسے یقین دلاتی تھی مجھے اس کے نام کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے، میں اپنا اور عباد کا سارا خرچ اپنی ماں سے لے لوں گی، لیکن ندیم مجھے کسی طرح رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس پر ثانیہ اور اس کے بھائی کا بہت دباؤ تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری شادی کے اس طوق کو گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا مگر میری منت سماجت اسے وقت طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ کاشف ندیم یعنی میرا دوسرا بیٹا بھی انہی کٹھن اور مشکل لمحوں کی پیداوار تھا۔

کاشف تو عباد سے بھی زیادہ بدقسمتی پیدا ہوا۔ مجھے اس مرتبہ بھی زچہ والی کے آگے بھیڑ بکریوں کی طرح ڈال دیا گیا اور اس مرتبہ تو میری وہ حالت ہوئی کہ میں آئندہ کے لیے بالکل بیکار ہو کر رہ گئی۔ ان لوگوں کو مجھ سے ویسے بھی اب کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ مجھ سے تو کیا میرے پھول جیسے بچوں سے بھی انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جب ہی تو تیسرے دن مجھے میرے چھوٹے بیٹے سمیت گھر سے نکال دیا گیا۔ میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی، میں ان کے پاؤں پڑی، ان کی منتیں کیں، فریاد کرتی رہی کہ مجھے کہیں نہیں جانا، مگر میری ظالم ساس نے میری ایک نہ سنی اور گھسیٹتے ہوئے مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ میرے بڑے لڑکے عباد کو زبردستی گھر میں رکھ لیا۔ وہ روتے ہوئے ممّا ممّا کی پکار کر رہا تھا، مگر ان ظالموں نے اس معصوم کی آہ و بکا پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں لٹی پٹی گھر آ گئی۔ ہمارا سارا خاندان جمع ہو گیا۔ میرے ماموں نے مجھے تسلیاں دیں کہ میں کوئی غم نہ کروں۔ میرے ماموں بہت اصول پسند تھے۔ اس کے علاوہ عادت کے بھی بہت سخت تھے۔ ہمارے پورے خاندان میں ان کا رعب تھا۔

میرے ماموں نے میرے سسرال والوں سے بات کی اور انہیں ڈرایا دھمکایا، انہیں وارننگ دی کہ اب اگر انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ ان کا ایسا حشر کریں گے کہ ان کی سات نسلیں یاد کریں گی۔ وہ تو اس سے پہلے میں نے سسرال والوں کا پردہ رکھا ہوا تھا ورنہ ماموں تو کب کا انہیں مزہ چکھا چکے ہوتے۔ ماموں کی خبر گیری اور دھمکیوں کے بعد میری ساس مجھے آ کر لے گئی، ندیم نے بھی ایک دو مرتبہ گھر کا چکر لگایا اور مجھے کچھ معمولی رقم بھی خرچ کے لیے دی۔

کچھ دن تو وہ لوگ میرے ساتھ ٹھیک رہے، مگر ماموں کے مسقط جاتے ہی میری ساس نندوں نے مجھ سے لڑائیاں شروع کر دیں۔ ندیم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور بغیر کچھ کہے سنے ایک دن اچانک مجھے فون پر طلاق دے دی۔ میں روتی پیٹتی گھر آ گئی۔ اب کی مرتبہ بھی میری ساس نے میرے بڑے بیٹے عباد کو زبردستی مجھ سے چھین لیا اور کاشف چوں کہ تین ماہ کا تھا، اس لیے اسے میرے ساتھ بھجوا دیا۔ عباد میرے ساتھ آنا چاہتا تھا، مگر میری ساس نندوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔

میرے ماموں کو جب میری طلاق کی خبر ملی تو وہ سخت رنجیدہ ہوئے، انہیں میرے سسرال والوں پر سخت غصہ تھا۔ اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو نجانے ان لوگوں کا کیا حال کرتے، پھر ماموں نے وہیں سے فون پر اپنے ایک وکیل دوست سے رابطہ کیا۔ میرے حق مہر اور بچوں کے لیے کیس لڑنے کو کہا اور پھر ان وکیل انکل نے کچھ ہی دنوں میں ندیم پر کیس دائر کر دیا۔

کیس کافی عرصہ چلتا رہا، آخر ڈیڑھ سال بعد ندیم نے مجھے عدالت کے ذریعے کاشف کو دے دیا، اس نے وہاں یہ شرط رکھی کہ اگر میں ساری زندگی شادی نہ کروں تب وہ مجھے کاشف کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دے دے گا، جبکہ عباد سے میں کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ مجھے فی الحال کاشف کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاصل کرنا تھا اور دل سے میں نے یہ گواہی دی کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی، ویسے بھی اتنی ذلتیں اٹھانے کے بعد مرد کے اتنے فریب کھانے کے بعد مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ میری اس رضا مندی نے مجھے میرا چھوٹا بیٹا دلا دیا مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ عباد کے ملتے ہی میں نے کاشف کو بھی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ندیم نے چوں کہ شادی کر لی تھی اور اب اس

عورت سے بھی اس کا لڑکا تھا، اس لیے میرے خیال میں ندیم کو مجھے عباد لوٹانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے بھی ان کو بن ماں کے بچے سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ سوائے اپنی انا کی تسکین کے، جبکہ میں ماں تھی، اسے اتنی تکلیفوں سے جنا تھا، اس کے لیے اتنی مار پیٹ اور گالم گلوچ برداشت کیا تھا، اب اسے حاصل کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ میں کسی طور اسے سوتیلی ماں اور ظالم باپ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں دن کو چھپ چھپ کر راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے لیے روتی تھی۔ اس کی جدائی میرے لیے اتنی اذیت ناک تھی کہ مجھے لگتا میں اس کے غم میں پاگل ہو جاؤں گی اور جب سے ندیم اسے مجھ سے بہت دور کہیں ہوسٹل لے گیا تھا، میں اور بے چین ہوگئی تھی۔

میں نے سنا تھا عباد سے ندیم کی دوسری بیوی بہت برا سلوک کرتی تھی۔ وہ اسے کھانے کے لیے بہت کم کھانا دیتی تھی۔ گھر کے اکثر کام عباد سے کرواتی، یہاں تک کہ جھاڑو پوچھا، آٹا گوندھنا، برتن دھونا اور اپنے لیے روٹی ڈالنا سارے کام عباد اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کرتا تھا اور جب ندیم نے اسے ہوسٹل بھجوایا تو کئی ماہ تک پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی تھی۔

میرے ماموں دو سال بعد وطن واپس لوٹے تو سیدھا میرے پاس آئے اور مجھے سینے سے لگا لیا اور رونے لگے، کافی دیر بعد جب ماموں کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا، تو ماموں مجھ سے کہنے لگے۔ ''انیلا تمہیں کبھی بھی کسی بھی وقت کسی چیز کی، کسی بھی طرح کی مدد درکار ہو، تو تم بلا خوف وجھجک مجھے کہنا، میں اپنی بھانجی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میں مسقط کیوں گیا۔۔ اگر یہاں ہوتا تو دیکھتا ندیم تمہیں کیسے طلاق دے سکتا تھا۔ کاش میں یہاں ہوتا۔'' ماموں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ماموں کے جذبات کا اندازہ تھا۔ وہ واقعی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے، مگر تقدیر کے آگے کس کی چلتی ہے، وہ مجھے دنیا کی ہر نعمت لا کر دے سکتے تھے، مگر تقدیر سے لڑنا ان کے بس کی بات کہاں تھی۔ میں نے ماموں سے بھی یہی کہا تھا کہ ''آپ مجھے سب کچھ دے سکتے ہیں، مگر اچھی تقدیر دینا آپ کے بس سے باہر تھا۔'' اچانک مجھے خیال آیا کہ میں کیوں نہ عباد کو حاصل کرنے کی بات ماموں سے کروں۔ شاید وہ میرا ساتھ دیں۔ باقی سب لوگ تو منہ پر مجھے تسلی دے رہے تھے، مگر پیٹھ پیچھے یہی کہتے۔ ''شکر کرے جو شوہر نے ایک بچی دے دیا، اپنی اولاد کون کسی کو دیتا ہے۔'' کوئی کہتا۔ ''بچوں کو لے کر کیا کرے گی، کل کو بڑے ہو کر واپس باپ کے پاس چلے جائیں گے، جیسا باپ ویسے بیٹے۔ اپنی جوانی خراب کرے گی۔''

غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں، مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ہر صورت عباد چاہیے تھا۔ میں نے ماموں سے بات کی، تو ماموں نے وکیل سے میرے کیس کے سلسلے میں بات کی۔ وکیل نے کہا کہ ''کیس کافی کمزور ہے، مگر میں کوشش کروں گا۔'' ماموں نے وکیل کو بھاری معاوضے کی پیشکش کی۔ وکیل نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی، مگر یہ کیس زیادہ عرصے تک نہ چل سکا، یہ مقدمہ تین بار ندیم جیتتا رہا۔

میں نے کئی وظائف کیے، بہت سے ختم پڑھے اور پڑھوائے، ہر ایک سے دعائیں کرواتی رہی، منتیں مانیں، مزاروں پر گئی، ہر غریب فقیر کو راضی کیا، ہمت نہیں ہاری اور کیس پہ کیس کرواتی رہی۔

میرے لیے ماموں نے پیسے کو پانی کی طرح بہایا، اچھے سے اچھا وکیل کیا۔ ہم سب سے بڑی عدالت میں گئے۔ ندیم کے پاس ہمارے مقابلے میں اچھا وکیل نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے اس کے پاس اتنا پیسا جو نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے پاس ماں کی ممتا نہیں تھی۔ جج تاریخ پر تاریخ بڑھا کر ہماری بے چینی میں اضافہ کر رہا تھا۔ سب کہتے تھے ہم یہ کیس کبھی نہیں جیت سکتے، مگر میرا دل گواہی دیتا تھا۔ میں اپنے بیٹے کو ضرور حاصل کرلوں گی۔

شاید یہ میری ممتا کی تڑپ تھی یا کسی غریب کی دعا یا پھر قدرت کا کوئی معجزہ کہ ہم کیس جیت گئے تھے۔ عباد ہمیشہ کے لیے مجھے مل گیا تھا

وہ لمحہ میری زندگی کا یادگار ترین لمحہ تھا جب عدالت

سے میرے کزن علی ایاز نے مجھے فون کر کے کہا۔ ”مبارک ہو انیلہ ہم کیس جیت گئے ہیں۔“ ہم کیس تو جیت گئے تھے مگر کاغذی کارروائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ ندیم عباد کو کہیں غائب نہ کر دے، مگر سب نے مجھے تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ندیم ایسا کچھ نہیں کر سکتا، پھر وہ مسرت کا دن بھی آ پہنچا جب پانچ سال کے بعد عباد مجھے واپس مل گیا، وہ دن ہمارے لیے عید سے کم نہیں تھا۔

عباد کے ملتے ہی ہم سب نے خوشیوں سے بھرپور جشن منایا۔ مٹھائیاں بانٹیں، دیگیں پکوائیں، نوافل ادا کیے، چادریں چڑھائیں۔ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ امی اور بہنوں کے چہرے بھی اندرونی خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ سات سالہ عباد کو سب ہی گود میں لیے پھرتے رہے۔ کبھی ایک اپنی طرف کھینچتا، کبھی دوسرا جو مبارک دینے آتا عباد کے لیے تحفہ لے کر آتا۔ جس دن عباد ہمیں ملا اسی دن شام کو میرے ماموں بینڈ باجوں سمیت آگئے اور خوب تماشا کروایا، سارے محلے والے اکٹھے ہو گئے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سب ہی ڈانس کرنے اور بھنگڑا ڈالنے لگے۔ ہمارے گھر میں تو گویا شادی کا سماں تھا۔ سب کے چہروں سے مسکراہٹ روشنیوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ندیم نے عباد کو واپس تو کر دیا، مگر ہماری طرف سے اس کے ذہن میں اتنا خوف اور شکوک و شبہات ڈال دیے کہ وہ ہر وقت ڈرا سہما رہتا، ہر وقت انجانا سا خوف اس کے چہرے سے جھلکتا رہتا، اگر کوئی ذرا سا اسے ڈانٹ ڈپٹ دیتا، تو وہ لرزنے لگتا۔ چھری، چاقو، سگریٹ اور ماچس سے تو وہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اگر کسی کو اپنے سامنے پکڑے دیکھتا تو چیخیں مارنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ جب اس کا خوف کچھ دور ہوا تو اس نے بتایا کہ ”ندیم اور اس کی بیوی دونوں اسے ہر وقت یہی کہتے رہتے تھے کہ تم مما کے پاس مت جانا وہ تمہیں مار دیں گی، تمہیں اندھیرے کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیں گے، تم اکیلے رہ جاؤ گے اور ایسی بہت سی خوفزدہ کر دینے والی باتیں جو اس معصوم ذہن پر اب بھی نقش تھیں، جنہیں ہم انتہائی محبت اور یقین سے مٹانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

عباد کو حاصل کیے ہوئے مجھے سات ماہ بیت گئے ہیں۔ طلاق سے لے کر اب تک میرے لیے اچھے سے اچھا رشتہ آیا، کچھ تو میرے بیٹوں کو بھی اپنانے کو تیار تھے، مگر اب مجھے کسی بھی مرد سے کوئی دلچسپی نہیں، اب میرے لیے میرے دونوں بیٹے ہی میری کل کائنات ہیں اور ان کی بہترین تعلیم و تربیت میری زندگی کا نصب العین۔

میں اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ہمہ وقت تیار کیے ہوئے ہوں۔ میری بھرپور کوشش ہے کہ وہ دونوں خوب پڑھ لکھ کر مستقبل کے بہت اچھے اور عظیم انسان بنیں۔ میں نے ان دونوں کو دینی اور دنیاوی دونوں علوم سے آراستہ کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ عباد کو میں نے اپنے ہی علاقے کے ایک بہت اچھے پرائیویٹ اسکول میں داخل کروایا ہے۔ عباد ماشاء اللہ بہت ذہین اور محنتی بچہ ہے، اس نے تینوں ٹرمز میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ باقی ایکٹویٹیز میں بھی اس کے فل مارکس آتے ہیں۔ عباد دین کی طرف بھی مائل ہے۔ ابھی سے وہ صبح سویرے نماز کو جاتا ہے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرتا ہے، اسکول کی چھٹی کے بعد مدرسے جاتا ہے اور پھر ٹیوشن کے لیے۔ رات کو سونے سے پہلے عباد ہمیشہ نماز، کلمے اور مسنون دعائیں دہرا کر سوتا ہے۔ گھر اور اسکول میں بھی وہ سب کا فرمانبردار اور تابعدار ہے۔ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور مجھے یقین ہے، میری محنت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی اور میرے دونوں بیٹے بڑے ہو کر معاشرے کے بہترین شہری ثابت ہوں گے۔

مجھے امید ہے میرے بیٹے مجھے کبھی مایوس نہیں کریں گے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے کیا، اس کی قدر کریں گے۔ میرا یقین اور ایمان سلامت ہے۔ آپ دعا کریں میرا یہ یقین اور ایمان ہمیشہ سلامت رہے۔ آمین

☆.....☆

چوتھی سچ بیانی

مہراں

گشور وسیم

معاشرے کے ظلم کی شکار ایک عورت کی دکھ بھری کہانی

جب میں شادی ہو کر کراچی سے "خان پور کٹورہ" گئی تو میرے سسرال میں ایک کردار "مہراں" کا بھی تھا، جسے سب لوگ (ماسی مہراں) کے نام سے پکارتے تھے۔ اس عورت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی بے چین روح ہو۔ سارا دن کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا اور ساتھ میں اپنے آپ سے باتیں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔

شروع شروع میں تو مجھے سچ مچ اس سے کچھ کراہت ہوتی تھی۔ ایک وجہ تو اس کی یہ تھی کہ وہ بولتی ٹھیٹ سرائیکی تھی اور میں ٹھہری کراچی والی۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی، جس سے ظاہر ہے مجھے جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہاں رہتے ہوئے میں نہ صرف سرائیکی کو سمجھنے لگی، بلکہ کافی حد تک بولنے بھی لگ گئی تھی۔ مہراں شروع سے ہی میرے سسرال میں گھر کا کام کاج کیا کرتی تھی اور اب اس کی عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ تھی۔

ایک دن جب ہم سب دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میری جیٹھانی کے بیٹے احمد نے جا کر دروازہ کھولا تو دروازے پر کوئی مانگنے والی عورت تھی۔ احمد نے آ کر مجھ سے کہا کہ چاچی دروازے پر "گاماں" آئی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ گاماں کون ہے۔ لیکن جیسے ہی مہراں نے یہ سنا کہ دروازے پر "گاماں" ہے تو اس نے فوراً اپنی روٹی کے اوپر سالن رکھ کر احمد سے جانے کو کہا کہ وہ روٹی جا کر گاماں کو دے آئے۔ اس پر میں نے کہا کہ مہراں تم خود جا کر دے آؤ تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں حیران رہ گئی کہ اسے کیا ہوا ہے، جو وہ انکار کر رہی ہے۔ خیر اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی جیٹھانی سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مانگنے والی عورت مہراں کی بہن ہے۔ یہ سن کر میں حیران ہوئی کہ مہراں کی بہن مانگنے والی کیسے؟

ایک دن جب مہراں گھر کے کام کاج سے فارغ ہوئی تو میں نے مہراں کو کرید ا۔ آخر کار وہ بڑی مشکلوں سے اپنی آپ بیتی سنانے پر راضی ہوئی، پھر اس نے دور کہیں خلا میں تکتے ہوئے یوں کہنا شروع کیا۔

"مہراں کا جنم خان پور کے گاؤں قاضی بستی پورہ میں ہوا۔ مہراں کے بعد مہراں کی ایک بہن گاماں اور ایک بھائی پیدا ہوا۔ بھائی کی پیدائش کے بعد اس کی ماں کچھ دن بیمار رہنے کے بعد اس دنیا سے چل بسی۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ مہراں جب سولہ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے بھائی کے وٹے میں اس کی شادی کر دی۔ بھائی کی شادی کچھ سال بعد ہونا قرار پائی۔ مہراں کی شادی جس شخص سے ہوئی،



اوپر سے اس کا تایا شرابی اور جواری تھا۔ وہ شراب پی کر آتا اور میراں کو تشدد کا نشانہ بناتا۔ جب تک اس کا سسر زندہ رہا اس کی زندگی میں پھر بھی سکون تھا۔ سسر کے مرتے ہی اس کے برے دن شروع ہو گئے۔ ان ہی دنوں میراں امید سے ہوئی لیکن اس کے شوہر نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ میراں اس حال میں بھی کھیتوں میں کام کرتی اور اپنا پیٹ پالتی رہی۔ اس کے بیٹے کی پیدائش کے چھ دن بعد ہی اس کے شوہر نے مار پیٹ کر دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔

اس عرصے میں میراں کی بہن گلاں بھی جوان ہو چکی تھی۔ جوان ہو کر اس نے ایسا رنگ روپ نکالا کہ جو بھی اسے دیکھتا دنگ رہ جاتا۔ گاؤں میں اس کی خوب صورتی کے خوب چرچے ہونے لگے تھے۔ ایک روز جب سب گاؤں والے گہری نیند سو رہے تھے تو گاؤں میں ڈاکو آ گئے اور میراں کے بھائی کے گھر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے اس کے جانوروں کو چرانے کی کوشش کی۔ جانوروں کا شور سن کر گھر والوں کی آنکھ کھل گئی اور سب لوگ کمروں سے باہر آ گئے۔ ڈاکوؤں نے جب گلاں کو دیکھا تو انہوں نے جانوروں کو چھوڑ کر گلاں کو اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر فرار ہو گئے اور پھر یہاں سے میراں کی بربادی کا آغاز ہوا۔ ڈاکو اس کی بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے اور بے چاری میراں ایک پولیس اسٹیشن سے دوسرے پولیس اسٹیشن اس کی بازیابی کے لیے چکر لگاتی رہی لیکن اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اس کا بھائی بھی تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔

وہاں سب جانتے تھے کہ ڈاکو کسی انسان یا جانور کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تو تاوان کی رقم وصول کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی تاوان کا مطالبہ کر دیا تھا۔ میراں بے چاری نے اپنے [illegible]

بندوبست کیا تھا، لیکن اس کے بھائی نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ مہراں بے چاری پڑھی لکھی تو نہ تھی، جو اسے پولیس والوں کی چالاکیوں اور ان کی عیاریوں کا علم ہوتا۔

دراصل وہ بھی ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے مہراں سے پیسے لے کر اس سے کہا کہ وہ تاوان کی رقم ڈاکوؤں تک پہنچا کر اس کی بہن کو برآمد کروائیں گے۔ اس چکر میں مہراں سڑک پر آ گئی تھی اور پولیس انسپکٹر نے اس کی رقم بھی ہضم کر لی تھی اور آرام سے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد آخر کار ڈاکوؤں نے اس کی بہن کو خود ہی چھوڑ دیا، لیکن اس کی بہن کے ساتھ انہوں نے اتنی درندگی کا ثبوت دیا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ان بے حسوں نے اس کی زبان کاٹ دی تھی تاکہ وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہ رہے۔ بھائی نے اس حال میں دونوں بہنوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور مہراں بے چاری محنت مزدوری کر کے اور گھر کی چیزیں بیچ کر اپنی بہن کا علاج کروا رہی تھی۔ کچھ عرصہ علاج معالجے کے بعد گلاں کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو دنیا دکھاوے کو بھائی کو بھی بہنوں کا خیال آ گیا اور وہ بہنوں کو گھر لے جانے کے لیے آ گیا، لیکن مہراں نے جانے سے انکار کر دیا تو بھائی نے گلاں کو شیشے میں اتار لیا اور وہ بھائی کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ مہراں کو اس بات کا نہایت دکھ ہوا کہ جس کے لیے اس نے اتنا دکھ درد اٹھایا تھا، اب اسی بہن نے اس سے نظریں پھیر لی تھیں۔

بھائی تو اپنے مطلب سے آیا تھا۔ گلاں کو گھر لانے کے بعد اس کی بیوی بچوں نے اسے نوکرانی بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ وہ دوبارہ نیم دیوانی ہو گئی۔ وہ بول تو سکتی نہیں تھی، ڈاکوؤں نے اس کی زبان جو کاٹ دی تھی اور پھر جب اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو اس کے بھائی نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، گلاں گاؤں میں گھر گھر بھیک مانگ کر گزارا کر رہی ہے اور مہراں گھر گھر میں کام کر کے۔

مہراں کی یہ آپ بیتی سن کر میرا دل دکھ سے بھر آیا۔ آخر کب تک عورت ہمارے معاشرے میں ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہے گی، یہ سوچ کر میری بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆.....☆

پانچویں سچ بیانی

اپنے ہی دام میں



صفدر عباس اعوان

سوتیلی ماں کے کھودے گڑھے میں گرنیوالی بیٹی کی داستان

روحی آج کالج آ تو گئی تھی، مگر اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے تو اس نے صرف پہلا انگلش کا پیریڈ پڑھا اور پھر باہر گراؤنڈ میں ایک بنچ پر آ بیٹھی تھی۔ باہر کا موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ سرمئی رنگ کے بادلوں نے آسمان کو پوری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھی ساتھ چلتی ہوئی بہت خوشگوار احساس کا تاثر دے رہی تھی۔ حالانکہ ساون کا مہینہ تھا۔ ساون کے حبس زدہ مہینے میں ایسا موسم تو جیسے رحمت کا اشارہ ہوتا ہے۔

موسم بہت زیادہ رومینٹک اور پیارا ہو رہا تھا۔ کالج میں کئی لڑکیاں انجوائے کی غرض سے کالج کی چھت پر چڑھ دوڑی تھیں۔ بریک ٹائم تھا۔ پیریڈ تو کوئی تھا نہیں، اس لیے لڑکیاں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

روحی کو بھی اس کی دو کلاس فیلوز چھت پر لے جانے کے لیے آئیں، مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ اگر دل کا موسم اچھا نہ ہو تو باہر کا موسم بھلے کتنا ہی خوب صورت اور سہانا ہو سب بے فائدہ لگتا ہے۔ اس وقت روحی کا بھی یہی حال تھا وہ اکیلی بنچ پر چپ چاپ بیٹھی۔ اپنی سوچ کے دھاگوں کی گانٹھیں کھولنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوش شکل، جاذب نظر نقوش کی مالک لڑکی تھی۔ مگر وہ اس وقت کسی پریشانی میں گھری ہوئی لگ رہی تھی۔ ایسی پریشانی جس نے اس کے دل کا سکون چین تک غارت کر دیا تھا۔ وہ تو

بچپن سے ہی اکیلی تھی۔ ماں کی ممتا سے محروم روحی وہ بن ماں کی بچی جو ایک سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی ماں ایک دن اس کو روتا ہوا چھوڑ کر دوسرے جہاں چلی گئی تھی۔ اس کا باپ نوردین سبزی کی ریڑھی لگا کر گزر بسر کرتا تھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے نکلتا اور شام کو واپس لوٹتا۔ نوردین سے اس کی پرورش مشکل تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سنبھالتا یا پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے نکلتا۔ نوردین کا آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں، سوائے چند ایک رشتے داروں کے جو اس کی بیوی کے قل تک اس کے گھر رہے، پھر پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی۔ نوردین کی سالی جو اس کے گھر کی دو گلیاں چھوڑ کر رہتی تھی، اس مشکل گھڑی میں اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئی۔ پھر نوردین کی سالی اپنی مرحومہ بہن کی آخری نشانی اپنی بھانجی سے پیار بھی بہت کرتی تھی۔ ایک سال کی روحی کی دیکھ بھال تو وہ کر لی ہی تھی۔ نوردین کے لیے صبح و شام کی روٹی سالن کا کرنا اور گھر کی صفائی ستھرائی بھی وہ بخوشی کرتی تھی۔ نوردین صبح سویرے ریڑھی لے کر کام پر نکل جاتا تو وہ ننھی روحی کو اپنے گھر لے آتی۔ سارا دن وہ اسے اپنے پاس رکھتی اور پھر جب شام ڈھلے نوردین واپس آتا تو اسے اس کے حوالے کر جاتی۔ زندگی شاید اسی طرح گزرتی تو کتنا اچھا تھا، لیکن نوردین نے دوسری شادی کر لی۔ اس کی دوسری بیوی رضیہ اپنے رنگ

روپ کی طرح دل کی بھی بڑی کالی تھی۔ وہ بہت کام چور اور پھوہڑ ثابت ہوئی۔ حالانکہ نورین کی پہلی بیوی بہت ہنرمند اور سلیقہ مند تھی۔ بیوی نئی آئی تو اس نے اپنی بیٹی کو اس کے حوالے کر دیا۔

"رضیہ میری یہ معصوم بچی ذرا سی عمر میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئی ہے۔ آج سے یہ تیرے حوالے ہے۔ تو اس کو اتنا پیار دینا کہ یہ تجھ کو ہی اپنی ماں سمجھے۔" نورین اتنی بچی میں بولا۔ دوسری بیوی آنے کے بعد وہ اپنی پہلی بیوی کو ابھی تک بھول نہیں پایا تھا۔

"ہونہہ! دوسروں کی اولاد میرے سر تھوپ دی جا رہی ہے۔" رضیہ نے حقارت سے منہ بنا کر۔ "پالنی ... بھی کسی بات کی تو تمیز نہ تھی۔

"میری اولاد ہوئی تو وہ میری اپنی ہوگی نورین۔ تیری بیٹی کی میں تھوڑا پرورش تو کر دوں گی مگر اس سے زیادہ مجھ سے امید مت رکھنا۔"

رضیہ کالی سخت مزاج کی عورت تھی۔ نورین کو یہ بات شادی کے بعد پتہ لگی تھی۔ وہ بھی تو آخر مجبور تھا۔ بنا کسی عورت کے گھر کون چلاتا۔ اس کی سال کا بچہ گھر بار تھا، وہ کب تک اپنی ساس پر بوجھ بنا رہتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کی خاطر ہی تو پہلی بیٹی کے لیے دوسری شادی کی تھی تاکہ اس کی بچی کو ماں کا پیار مل سکے! ماں تو ... ایک



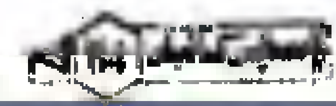
اپنی ہوتی ہے بھلا... نورین!"

رضیہ کے ان تلخ جوابات کا نورین کو بڑا دکھ ہوا۔

"رضیہ تم سے یہ امید نہ تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم نئی آئی ہو آج سے یہ تیری نہیں بلکہ میری بیٹی بھی ہے۔ میں اس کو بھی دل کی طرح پالوں گی مگر تو بڑی ہی چھوٹے دل کی تنگ دل عورت نکلی۔ کل کو تیری اولاد بھی ہوئی۔ یا اس سے بھی اسی طرح کا سلوک کرے گی۔"

نورین کو ایک دم غصہ آ گیا۔ رضیہ سے نورین کو

بچی نے جنم لیا۔ ایک اور بچی کی نورین کو خوشی تو ہوئی مگر وہ بیٹے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ جو بڑا ہو کر اس کا سہارا بنتا۔ اس نے اپنی دوسری بچی کا نام ... رکھا۔ جو وہ ماں پر گئی تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی سیاہ کالا رنگ روپ۔ بالکل نورین اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک جیسا پیار دیتا تھا مگر رضیہ کے دل میں کھوٹ ہو ... شادی کے دن سے ... ہوا تھا۔ ... یہ بات اس نے ... کہ ماں کی بیٹی سے ... کی ...



بیٹی روحی حد سے زیادہ خوب صورت اور پیاری تھی۔ اس لیے وہ اپنے دل کی بھڑاس معصوم روحی کو مار کر نکالتی تھی۔ بعض اوقات تو رضیہ کا دل کرتا کہ اس ننھی جان کو مار کر اس کی ماں تک ہی پہنچا دے۔ بچی کی پیدائش کے بعد تو رضیہ اور بھی چڑچڑی اور بدزبان ہو گئی تھی۔ بات بات پر وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اس کے زہر بھرے لہجے سے نور دین بھی نہیں بچ پاتا تھا تو روحی بن ماں کی بچی کیسے بچ پاتی۔ اپنی معصوم حرکتوں پر وہ روئی کی طرح دھنک دی جاتی۔ سوتیلی ماں کا خوف، ڈر اس سے اس کا بچپن کب چھین کے لے گیا اسے خبر تک نہ ہوئی۔ اس نے ہنسنا، شرارتیں کرنا چھوڑ دیں۔ سوتیلی ماں کے ڈر سے روحی گھر میں چارپائی کے نیچے ہی دبکی بیٹھی رہتی۔ گھر میں اس کا اگر آسرا کوئی تھا تو اپنے باپ کا۔ شام کو اس کا باپ نور دین تھکا ہارا لوٹتا تو وہ لپک کر اس کی گود میں جا بیٹھتی، مگر رضیہ اس کو ڈانٹ کر پیچھے کر دیتی۔

"اے ہٹ...... دیکھتی نہیں باپ تھکا ہارا آیا ہے۔ آ گئی ہے لاڈ کرنے۔" وہ رونی سی صورت بنا کر اپنے باپ کی طرف دیکھتی۔

"نہ رضیہ میری پھول جیسی بچی کو کچھ نہ کہا کر۔ اس کو دیکھ کر تو میں اپنے سارے دکھ درد بھول جاتا ہوں۔" نور دین اس کو بانہوں میں بھر لیتا۔

"ہاں ایک ہی تو تیری بچی ہے۔ دوسری تو تیری کچھ لگتی ہی نہیں ہے نا۔" رضیہ غصے سے کھا جانے والی نظروں سے اس کو گھورتی، گویا روحی کی جان ہی نکل جاتی۔

"ارے یہ کیا کہہ دیا، مجھے تو اپنی دونوں بچیوں سے بہت پیار ہے۔ ہاں البتہ تو ہی فرق رکھتی ہے۔" نور دین اپنے دل کی بات کبھی کبھار اس کو کہہ ہی دیتا تھا اور رضیہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بس جل بھن کر رہ جاتی تھی۔

روحی کچھ بڑی ہوئی تو نور دین نے اس کو اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس بات پر رضیہ نے بہت شور مچایا۔ وہ اس کو اسکول میں داخل کروانے کے حق میں نہیں تھی، مگر رضیہ کی ایک نہ چلی۔

وہ پہلے دن اسکول گئی تو وہاں کا ماحول اس کو بہت اچھا لگا۔ اس کو پہلی بار سکون و راحت کا احساس ہوا، جو اس کے گھر میں کوسوں دور تھا۔ اس کا بچپن بھی کسی بہار کی طرف واپس اس پر لوٹ آیا۔ وہ دن بھر اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی۔ اسکول میں لڑکے بھی پڑھتے تھے، مگر اس نے کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنایا سوائے ایک کے جو اس کا خالہ زاد کزن وقار تھا۔ گندمی رنگت، کالی آنکھوں والا وقار اس کا اتنا گہرا دوست ساتھی بن گیا کہ وہ باقی سب دوستوں کو جیسے بھول ہی گئی۔ وہ وقار کے ساتھ ہی کھیلتی، پڑھتی اور دونوں اکٹھے اسکول جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے تھے۔ وقار بھی اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ اسکول سے چھٹی والے دن بھی اس کے گھر کھیلنے کے لیے آ جاتا تھا تو اس کی آمد پر روحی پھولے نہ سماتی۔ برتن دھونا اور جھاڑو لگانے والا کام تو رضیہ نے اس کی کم عمری میں ہی اس کے ذمے لگا دیا تھا۔ وقار کی آمد پر وہ اپنا سارا کام جلدی جلدی کرنے لگتی تاکہ وہ جلد فارغ ہو کر اس کے ساتھ کھیل سکے۔ اس کو وہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ ایک دفعہ چھٹی والے دن برتن دھونے کے دوران اس سے ایک چائے کا کپ بے دھیانی میں ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا، تو رضیہ اس کی سوتیلی ماں نے دو تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے تھے۔ حد سے زیادہ روحی کا خیال رکھنے والے وقار کو یہ برداشت نہ ہوا تو اس نے زمین پر پڑا ڈنڈا اٹھا کر زور سے رضیہ کے سر پر دے مارا تھا۔ وقار کا یہ اقدام خود اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ دونوں کے گھروں میں بہت تکرار، لڑائی جھگڑا ہوا اور وقار کا روحی کے گھر آنا بند ہو گیا، مگر اسکول میں وہ پہلے کی طرح روز ہی ملتے تھے۔ ان دونوں کو پتا ہی نہ چل سکا کہ کب بچپن کی رات ڈھل گئی اور جوانی کا سورج سر پہ آن کھڑا ہوا۔

وقار بڑا کڑیل جوان بنا اور روحی پر تو ٹوٹ کر ایسا حسن آیا کہ ہر دیکھنے والے کی نظریں خیرہ ہو جاتیں۔

وقت نے ان دونوں کے جذبوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ڈالا، بلکہ اب تو ان دونوں کے دلوں میں محبت کی چاشنی اس کی ملاوٹ اور تیز ہو گئی تھی۔

روحی اسکول چھوڑ کر اب کالج میں پڑھنے لگی تھی، جبکہ اس کی سوتیلی بہن کوثر تو پانچ جماعتیں پڑھ کر ہی گھر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح بڑی کند ذہن ثابت ہوئی تھی۔ حد سے زیادہ ذہین اور خوب صورت روحی رضیہ کی آنکھوں میں تو پہلے ہی کھٹکتی تھی، مگر اس نے یہ نفرت کا بیج اپنی بیٹی کوثر کے

دل میں ایسا ہوا کہ اب وہ کوثر کے دل میں بھی تناور درخت بن چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دونوں ماں بیٹی کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ کر اس کے خلاف محاذ کھول کر بیٹھ جاتیں۔ روحی کیا جوان ہوئی کہ رضیہ نے گھر کی تمام ذمے داری اس کے حوالے کردی۔ وہ صبح سویرے اٹھتی، جھاڑو لگاتی، ناشتا تیار کر کے وہ کالج جاتی اور کالج سے واپسی پر وہ شام تک پھر گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ کالج کی پڑھائی کو وقت صرف اس کو رات میں ہی ملتا تھا۔ اس کی سوتیلی بہن کوثر تو کسی کام کو ہاتھ لگانا گویا گناہ کبیرہ سمجھتی تھی۔ سارا دن ماں بیٹی چارپائی پر بیٹھی ہوئی آرام کرتی تھیں اور نوردین کا زیادہ بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو سمجھا سکے پر رضیہ کب سمجھنے والی تھی اس لیے نوردین نے بھی اب اس معاملے پر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اب وہ اپنی پیاری بیٹی روحی کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

روحی کو بھی اپنے باپ کا بہت آسرا تھا اور پھر اپنے بچپن کے ساتھی وقار کا بھی ساتھ تھا۔ وقار بی کام کر چکا تھا اب وہ شہر میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اب دونوں کا روز ملنا تو ناممکن ہوگیا تھا۔ کیونکہ جوانی کی دیوار دونوں کے بیچ حائل ہوچکی تھی، مگر وقار روحی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کبھی نہ کبھی اس کے گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔ بچپن گزرا تو اس کی غلطی کو بھی درگزر کردیا گیا تھا، جو روحی کے پیار میں اس کے ہاتھوں سرزد ہوئی تھی، بلکہ اب تو رضیہ اس کے گھر آنے پر اس کی بلائیں لیتی نہیں تھکتی تھی۔ وہ تو اس پر واری صدقے جاتی تھی اور اوپر سے کوثر بھی اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ اس وقت تک جب تک وہ روحی کے گھر سے چلا نہ جاتا۔ وقار بھی اس وقت تک وہیں براجمان رہتا جب تک وہ روحی کی ایک جھلک نہ دیکھ لیتا۔ بات کرنے کا تو آپس میں موقع تو شاذ و نادر ہی ملتا، مگر وقار کے لیے روحی کا دیدار ہی کچھ نہ کچھ غنیمت تو ہوتا ہی تھا۔ ایک دن وقار روحی کے گھر آیا تو رضیہ اور کوثر گھر پر موجود نہیں تھیں۔ نوردین صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

"السلام علیکم خالو جان.....!" وہ نوردین کی طرف بڑھا۔

"وعلیکم السلام۔ ارے وقار بیٹا کیا حال ہے، بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔" نوردین نے اسے اپنے ساتھ ہی چارپائی پر بٹھالیا۔

"اور سنا تیری ماں کا حال کیسا ہے؟ اس نے تو ہمارے گھر آنا ہی جیسے چھوڑ دیا ہے۔"

"نہیں خالو، آج کل اماں کی طبیعت ناساز رہتی ہے نا اس لیے وہ گھر سے نہیں نکلتیں۔"

"اچھا...... اللہ تعالیٰ اس کو شفا دے۔" نوردین آہستگی سے بولا۔

"خالو آج آپ کام پر نہیں گئے خیریت تو ہے......؟"

"ہاں بیٹا میری طبیعت بھی آج کچھ اچھی نہیں تھی۔ بخار سا ہورہا تھا، سوچا آرام کرلوں۔" نوردین دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

"رضیہ خالہ نظر نہیں آرہی ہے، کہیں گئی ہے کیا......؟" وقار نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ خالہ کا تو بس بہانہ تھا۔ وہ تو روحی کا پوچھنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں...... رضیہ کوثر کے ساتھ بازار گئی ہے۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ گھر پر صرف روحی ہے۔ اندر کمرے میں پڑھ رہی ہوگی۔"

یہ سن کر وقار نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ چلو آج روحی سے چند باتیں ہی ہو جائیں گی۔

تھوڑی دیر تو وہ نوردین کے پاس بیٹھا رہا، پھر موقع پاکر وہ اندر کمرے میں آگیا جہاں روحی کتاب کو گود میں رکھے پڑھ رہی تھی۔

وہ پڑھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے وقار کے کمرے میں آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اس نے جلدی سے روحی کی گود سے کتاب اچک لی۔

روحی نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وقار کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوگئی۔

"تم کب آئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کب نازل ہوئے، لاؤ ادھر میری کتاب واپس کرو۔" وہ کتاب لینے کے لیے آگے بڑھی تو وقار نے کتاب کو پشت کے پیچھے چھپالیا۔

"میں تو کب کا آیا بیٹھا ہوں، مگر جناب کو پڑھائی سے فرصت ملے تب نا، وہ تو شکر ہے کہ تمہاری سوتیلی ماں اور بہن گھر میں موجود نہیں ہیں۔ چلو تم سے دو گھڑی بیٹھ کر بات ہی ہو جائے گی۔" وقار مسکرایا۔

"اچھا...... میری سوتیلی ماں اور بہن تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں یا نہیں، کم از کم احترام میں خالہ ہی کہہ دیا کرو۔

بڑوں کا ادب بھی کچھ ہوتا ہے نا۔"

روحی کو پتا تھا کہ وقار اس کی سوتیلی ماں رضیہ اور بہن کوثر کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اور پھر روحی پر جتنا ماں بیٹی ظلم و ستم کرتی تھیں، وقار اس سے باخبر تھا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو..... کیا بور باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو تم بھی۔ چلو اپنی بات کرو۔ میری بات کرو میں تو تم سے بات کرنے کو بھی ترس گیا تھا تم سے۔"

وہ روحی کے سامنے آ کر پلنگ پر بیٹھا۔ تو روحی نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

"ایک تم روحی ہو کہ تمہیں میری کوئی فکر ہی نہیں ہے، فکر ہے تو صرف اپنی پڑھائی کی۔"

"وقار پڑھائی بھی تو کرنی ہے، میرے لیے پڑھائی بہت اہمیت رکھتی ہے۔"

"اچھا تو میں.....؟" وقار نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم..... تم بھی کچھ نا کچھ اہمیت رکھتے ہی ہو مگر.....!"

روحی بھولے سے مسکرا دی۔ وہ اس کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔

"اچھا یہ بات ہے تو آج کے بعد میں کبھی تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔"

ناراض ہو کر وقار پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تم میں تو اتنی بھی برداشت نہیں ہے وقار۔" وہ زور سے ہنس دی۔

"ہاں..... تمہارے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں ہے۔ تم مجھ سے بے رخی کرو میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا روحی، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، اپنی جان سے بھی زیادہ۔ تمہارے بغیر میں ایک پل نہ جیوں۔"

"میں بھی تم سے بے انتہا پیار کرتی ہوں وقار۔ اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ مگر..... مجھے اکثر یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی تم کو مجھ سے چھین نہ لے۔ مجھ سے دور نہ کر دے۔ میں اکثر اسی بات پر پریشان ہو جاتی ہوں۔"

وقار نے روحی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیوں تم کو یہ خیال کیوں آتا ہے.....؟"

"بس ہر دم کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

روحی اپنی سوتیلی ماں کی وقار پر بے تحاشا نچھاور ہونے والی محبت اور اپنی سوتیلی بہن کوثر کی آنکھوں میں انجانا چھپا پیغام جو وہ وقار کو پڑھانا چاہتی تھی۔ اس سے بخوبی آگاہ تھی۔ وہ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں کوثر کی شادی وقار سے کرنے کے حق میں ہے، مگر وہ وقار کو آخر کس طرح سمجھائے۔

"تم کو تو روحی کوئی وہم ہو گیا ہے....."

اب تو شاید ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں "تم" صاف نظر آتے ہو

وقار نے موقع کی مناسبت سے شعر پڑھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"تم سے تو کوئی بات کرنا فضول ہے وقار۔ آخر کسی بات کو سنجیدہ بھی لے لیا کرو۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ خالہ کو ہمارے ہی گھر بھیج دو اور ہماری بات ہی طے ہو جائے مگر تمہارے کان پر تو جوں تک نہیں رینگتی۔"

روحی نے شکوہ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"روحی تم کو تو پتا ہے کہ میں نوکری کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ اماں کی بھی بڑی خواہش ہے میرے سر پر سہرا دیکھنے کی۔ وہ تو کب کی تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں، میرے لیے تمہارا ہاتھ مانگنے مگر میں نے ان کو روک رکھا ہے۔ روحی میں چاہتا ہوں کہ میری نوکری لگ جائے اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں، پھر میں تم کو اپنی دلہن بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے آؤں گا۔" وقار نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں آخر وہ وقت کب آئے گا۔" روحی بے دلی سے بولی۔

انشاءاللہ بہت جلد..... تم ناامید تو نہ ہو۔ کل ایک جگہ انٹرویو دینے جانا ہے۔ اچھی نوکری ہے، دعا کرو کہ وہ مل جائے۔ پھر اماں کو بھیجتا ہوں تمہارے گھر۔" وقار اس کو خوش کرنے کی غرض سے بولا۔

"میری تو دعا ہے کہ تم کو جلد از جلد کوئی نوکری مل جائے۔ اچھا کیا پیو گے؟ چائے بناؤں۔" روحی پلنگ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"چائے کیا تمہارے ہاتھ سے تو زہر تک پینے کو تیار ہوں۔" وقار جلد ہی شوخ ہو گیا۔

"تم بھی نا بس...... بالکل ہی پاگل ہو پاگل۔"
روحی بھی ہنس پڑی۔

"ہاں پاگل تو ہوں، مگر صرف تمہارے پیار میں......؟" وقار اس کے قریب آیا تو روحی نے شرما کر اس کو دھکے سے پرے کیا اور کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔
وقار بھی اس کو اس طرح بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑا۔

دو تین دن تو خیر خیریت سے گزر گئے۔ وہ جمعہ کا دن تھا کہ روحی کالج سے جلدی لوٹ آئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو سامنے برآمدے میں اپنی سوتیلی ماں رضیہ کے ساتھ ادھیڑ عمر سفید بالوں والی عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس عورت کا نام ثریا تھا۔ وہ رشتے وغیرہ کراتی تھی۔ روحی اس کو جانتی تھی۔ وہ عورت اس محلے میں دو بار پہلے بھی آئی تھی۔ وہ پہلے بھی اس کے گھر آ چکی تھی۔

روحی کے اندر آنے پر ادھیڑ عمر عورت ثریا نے غور سے اسے دیکھا۔ روحی بس سلام کر کے اندر کمرے میں چلی گئی۔

"اچھا بہن رضیہ میں پھر آؤں گی، ایک دو جگہ اور بھی جانا ہے۔" ثریا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چل ٹھیک ہے۔" رضیہ بولی۔ "لیکن پھر آنا ہوگا، دیکھ بھول نہ جانا سارے آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ تو بے فکر رہ۔"

اس کے جانے کے بعد رضیہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ روحی جو تھکن کی وجہ سے پلنگ پر لیٹی تھوڑا آرام کرنے کی کوشش میں تھی۔ اپنی سوتیلی ماں رضیہ کو آتے دیکھ کر سنبھل کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ارے روحی میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اچھا کیا کہ آج تو کالج سے جلدی آ گئی۔ روحی بیٹا مجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سوتیلی ماں کے منہ سے پہلی دفعہ بیٹی کا لفظ سن کر روحی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔
اس نے اپنی زندگی میں رضیہ کے منہ میں اتنی مٹھاس اور شائستگی پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ اس پر روحی کا حیران ہونا لازم تھا۔

"دیکھ روحی۔ تو مجھے بے شک اپنی ماں سمجھ یا نہ سمجھ پر میں تجھے شروع دن سے ہی بیٹی سمجھتی ہوں بلکہ مانتی بھی ہوں۔ دنیا جو مرضی مجھے سوتیلی ماں جانے، مگر میں تیری ماں تو ہوں۔ اگرچہ سگی نہیں تو سوتیلی ہی سہی۔ میرے سینے میں بھی ماں کا دل ہے، کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" رضیہ نے بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا۔
"نہیں اماں! میں تجھے اپنی سگی ماں کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔" روحی آہستگی سے بولی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر اس کی ماں رضیہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔
"دیکھ تیرے باپ کو تو تیری کوئی فکر ہے نہیں۔ صبح کا گیا شام کو لوٹتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ بڑی بیٹی کی عمر نکلے جا رہی ہے۔ ماشاء اللہ اب تو 20 سال کی ہوگئی ہے۔ اب ساری زندگی تجھے پڑھنا یا گھر بٹھانا تھوڑی ہی ہے۔ تیرا بیاہ بھی تو کرنا ہے۔

اب تیرے بارے میں میں نہ سوچوں گی تو بھلا اور کون سوچے گا۔ میں تیرا خیال نہیں کروں گی تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ سوتیلی تھی اس لیے بیٹی کو گھر بٹھایا ہوا ہے۔ اب دنیا والوں کی زبان تو تھوڑی کوئی پکڑ سکتا ہے۔ تو سمجھ رہی ہے نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟"
روحی تو اب تک سمجھ نہ سمجھی کی کیفیت میں تھی۔ بس اس نے تو سر ہلا دیا تھا۔
"وہ ابھی تو نے دیکھا ہے نا رشتے کرانے والی ثریا آئی ہوئی تھی۔ تیرے لیے کافی دن پہلے اچھا رشتہ کا کہا تھا۔ آج وہ بتا رہی تھی کہ ایک رشتہ اس کی نظر میں ہے۔ لڑکا اگرچہ تھوڑا پڑھا لکھا ہے۔ مگر اس کا اپنا کاروبار ہے۔ کار کوٹھی کیا نہیں ہے اس کے پاس۔ بس پہلے سے شادی شدہ تھا، لیکن بیوی کو مرے تین سال گزر چکے ہیں۔ عمر کا ذرا بڑا ہے، مگر مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔ اس کا تو پیسا دیکھے جاتا ہے۔"
رضیہ نے اپنا اصل مدعا بیان کیا کہ روحی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی سوتیلی ماں اس لیے اس سے پیار بھرے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ایک عمر رسیدہ شادی شدہ مرد کے پلو سے اس کو باندھنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔
"کیوں تجھے اعتراض تو نہیں ہے۔ تیرے باپ سے میں بات خود کر لوں گی۔" رضیہ نے اس کی طرف دیکھا۔
"اماں...... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنی خود غرض اور بے حس بھی ہو سکتی ہیں۔ ظالم تو آپ پہلے بھی تھیں، مگر اتنا بڑا ظلم...... خود کو ماں کہتی ہو لیکن ماں بن کر نہیں سوچتی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک میں آپ کے ظلم و ستم سہتی رہی، مگر کبھی اف تک نہ کی، مگر اب...... نہیں اور نہیں۔ میں اپنی زندگی بے حس کو کھیلنے نہیں دوں گی۔ سن

لو تم۔ میں وقار سے محبت کرتی ہوں اور شادی بھی اُسی سے کروں گی۔" روحی جیسے چیخ اٹھی تھی۔

رضیہ کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ روحی اس کے سامنے بھی کبھی بول سکتی ہے۔ اس نے غصے اور نفرت سے روحی کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔

"کمینی، بے حیا، بے غیرت میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔ تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔" رضیہ اس کو پکڑ کر بالوں سے کھینچتے ہوئے زور زور سے مارنے لگی کہ شور سن کر کوثر بھی کمرے میں آن دھمکی۔

کیا ہوا اماں۔ کیا بات ہوئی ہے۔ اس طرح کیوں مار رہی ہو روحی کو؟" کوثر حیران تھی کہ اچانک ہو کیا گیا ہے۔

"ارے یہ کمینی تیرے حق پر ڈاکہ ڈالنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے کہ وقار سے محبت کرتی ہوں۔ شادی بھی اسی سے کروں گی۔" رضیہ برابر اس کو مار رہی تھی۔

"ہائے میں مرگئی اماں۔" کوثر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے تو اس کے کرتوتوں پر شروع دن سے ہی شک تھا اور پڑھائے ابا اس کو۔ کالج جانے کے بہانے نجانے کیا گل کھلاتی پھر رہی ہوگی۔" کوثر کی بھی قینچی کی طرح زبان چلنے لگی۔

"ارے میں کب اس کی پڑھائی کے حق میں تھی۔" رضیہ نے زور کا دھکا دے کر روحی کو پلنگ پر گرا دیا۔

"آنے دے تیرے ابا کو آج ہی بتاتی ہوں۔ اس کی چہیتی کے کرتوت دیکھتی ہوں کیسے رشتے سے انکار کرتی ہے۔"

رضیہ کمرے سے باہر نکلی تو کوثر بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

"میں بتا رہی ہوں تجھے اماں۔ اگر میری شادی وقار سے نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ سن لے تو۔"

"ارے مریں تیرے دشمن، تو کیوں ایسا سوچ رہی ہے۔ موت تو آئے اس ذلیل حرام زادی کو، جان چھوٹے ہماری اس سے۔ تو فکر نہ کر کوثر، تیری شادی ہوگی تو صرف وقار سے۔"

"میری پیاری اماں۔" کوثر نے مسکرا کر رضیہ کو گلے سے لگا لیا۔ لیکن دیکھ وقار والی بات تیرے باپ کو پتا نہیں لگنی چاہیے نہیں تو وہ ہمارا نہیں اپنی بیٹی کا ہی ساتھ دے گا۔

شام کو نور دین تھکا ہارا گھر لوٹا تو رضیہ کسی آندھی طوفان کی طرح اس پر چڑھ دوڑی۔

"میں نا کہتی تھی کہ بیٹی کو زیادہ نہ پڑھا لکھا نور دین، تو اس کا دماغ خراب کر دے گا۔ پر تو میری کب مانتا۔"

"ہوا کیا ہے آخر، پھر اس بے چاری نے کیا کر دیا، جو تو اتنا تپ رہی ہے رضیہ۔" نور دین ریڑھی کو ایک سائیڈ پر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

"تو تو ہاتھ دھو کر میری بچی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ خدا سے ڈر رضیہ خدا سے ڈر، بن ماں کی بچی ہے۔ تجھے ترس نہیں آتا اس پر۔"

"ہائے ہائے میں خدا سے ڈروں، اس کلموہی کو کچھ نہیں سمجھاتے۔" رضیہ ہاتھ ملتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"تو صاف صاف بتائے گی یا یونہی پہیلیاں بجھواتی رہے گی۔ میرے بھی آخر کچھ پلے پڑے کہ بات کیا ہے۔" نور دین جھنجلا کر بولا۔

"غضب خدا کا...... میں تو ہاں بن کر اس کے بھلے کا سوچ رہی تھی۔ وہ رشتے کرانے والی ثریا اتنا اچھا رشتہ لے کر آئی تھی مگر تیری پڑھی لکھی نواب زادی نے جھٹ سے انکار کر دیا۔ زمین، جائیداد، روپیہ، پیسہ سب کچھ تو ہے۔ کیا ہوا عمر رسیدہ اور رنڈوا ہے۔ ارے اس کے تو بھاگ کھل جاتے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" نور دین نے گہرا سانس لیا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی آفت آن پڑی ہے۔ تجھ سے رضیہ یہی اُمید تھی۔ سوتیلی ماں تھی، سوتیلی ہی رہی نا۔ میری پھول جیسی بچی کو اس بوڑھے رنڈوے کے حوالے کر دینا چاہتی ہے۔ یہ سب کرتے ہوئے تیرا دل نہیں کانپا۔

یہ تو نے ظلم کر لیے میری بچی پر۔ رضیہ آج آخری بار بتائے دیتا ہوں، اب اور نہیں...... تو اس کی فکر کرنا چھوڑ دے، بس اپنی بیٹی کی فکر کر۔" نور دین اک دم غصے میں آ گیا۔

"تم دونوں باپ بیٹی جاؤ بھاڑ میں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔" رضیہ بھی غصے سے بولتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نور دین اندر کمرے میں گیا کہ اس کو اپنی بیٹی روحی پلنگ پر روتی ہوئی ملی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی نور دین کو

اندازہ ہو گیا کہ رضیہ نے اس کو بلاوجہ روی سے مارا ہے۔

"نہ..... روحی نہ۔ میری بچی نہ رو۔" اس نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی روحی کو گلے سے لگا لیا۔

"مجھے پتا چل گیا ہے کہ رضیہ نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ بڑی ظالم و جابر عورت ہے۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ پتھر کا دل ہے اس کے سینے میں..... کاش میں اس کے ساتھ شادی ہی نہ کرتا۔ اب پچھتا رہا ہوں۔ اس بدبخت عورت نے کوثر کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔" نوردین نے پیار سے روحی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"صبر کر میری پیاری بچی۔ اللہ اجر دینے والا ہے۔"

"ابا..... میں اس بڈھے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" روحی روتی ہوئی ہچکیاں لے کر بولی۔

"تو فکر نہ کر روحی بچی۔ تیرا باپ ابھی زندہ ہے۔ تجھ پر یہ ظلم نہیں ہونے دے گا۔ تو نے ٹھیک کیا کہ رضیہ کے منہ پر انکار کر دیا۔

اب رضیہ نے تجھ پر انگلی بھی اٹھائی نہ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہاتھ توڑ دوں گا اس کے میں۔

نوردین کتنی دیر تک اس کو دلاسے اور تسلیاں دیتا رہا۔

روحی نے وہ رات جیسے کانٹوں پر گزاری۔ نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ خوف اور ڈر جو شروع دن سے اس کے دل میں تھا۔ اب حقیقت بن کر اس پر جیسے آشکار ہو چکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی سوتیلی ماں رضیہ کسی طرح بھی اس کی شادی وقار سے نہیں ہونے دے گی، حالانکہ روحی کو اپنے باپ کا آسرا تو تھا لیکن اگر اس کا باپ بھی سوتیلی ماں کے آگے بے بس و مجبور ہو گیا تو.....؟

اس کے آگے سوچنے کی روحی میں ہمت ہی نہیں تھی، پھر کوثر بھی تو اس کے باپ کی بیٹی تھی۔ شاید کوثر کے ساتھ وقار کی شادی پر اس کے باپ نوردین کو اعتراض ہی نہ ہو۔ ایسی کئی باتوں نے ساری رات روحی کے دل کو دہلائے رکھا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو وہ بغیر ناشتے کے ہی کالج چلی گئی۔ نیند کی طرح بھوک بھی جیسے اس کی اڑ گئی تھی۔ کالج میں وہ اکیلی بینچ پر بیٹھی اپنی ماضی کی راکھ کرید رہی تھی، پھر راکھ میں موجود دبی یادوں کے انگاروں نے اب اس کے دل کو جلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو ویسے ہی خاموش چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے

اس کو پکارا تو اس نے اپنی نم آنکھوں سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ کالج کا چپڑاسی تھا۔

"اوہو..... وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اپنے آپ میں وہ ایسی کھوئی کہ اس کو ارد گرد کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے بینچ سے اٹھی اور بیگ کاندھے پر ڈالے کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ باقی کالج کی سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ اکا دکا لڑکی کھڑی تھی، جو اپنے گھر سے کسی لینے والے کی منتظر تھیں۔ روحی گیٹ سے باہر نکلی تو سامنے سڑک کے پاس اس کو وقار موٹر سائیکل پر سوار کھڑا ہوا نظر آیا۔ وقار نے بھی اس کو دیکھ لیا تھا۔ تو وہ اس کی طرف بڑھا۔ روحی سیاہ برقعے میں ملبوس تھی۔

"روحی میں کب سے کھڑا تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ میں تو اب جانے کو تھا۔ میں تو سمجھا کہ تم آج کالج آئی ہی نہیں ہو۔" وہ اس کی طرف مسکرا کر بولا۔ مگر روحی کچھ نہ بولی، بس چپ چاپ وقار کی طرف دیکھتی رہی۔

"خیریت تو ہے روحی..... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔" اس کی اجڑی اجڑی حالت کو دیکھ کر وقار کو تشویش سی ہونے لگی تھی۔ اب اس کی نم روتی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"تم کو میری کوئی پروا ہے وقار یا نہیں.....؟" روحی نے سوالیہ نظروں سے وقار کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولا۔ میں سمجھا نہیں۔ وقار واقعی ہی نہیں سمجھا تھا۔

"تم اس وقت سمجھو گے جب میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔ تم تو پھر بس تماشا دیکھتے رہنا۔" روحی روہانسی ہو گئی۔

"کیوں ہوا کیا ہے؟ صاف صاف بتاؤ روحی پلیز مجھے پریشان مت کرو۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

"میں تو کل رات سے پریشان ہوں۔ ایک ایک پل جینا مشکل ہے وقار، اس کا کیا کرو گے۔" روحی نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سن کر وقار کو شدید حیرانگی ہوئی۔

"ارے میں نے کوثر کے متعلق ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔ کوثر کو تو میں اپنی منہ بولی بہن سمجھتا ہوں۔"

لیکن وہ تو شادی کا پلان بنا چکی ہے تمہاری ساتھ۔ تم جو کچھ مرضی سمجھتے رہو۔ میری سوتیلی ماں مجھے تمہارا بھی

"نہیں ہونے دے گی وقار۔" روحی سسک پڑی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا روحی۔ بہت ہو گیا تم پر ظلم و ستم اب اور نہیں اب ایک پل بھی تمہیں اس گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ اس ظالم عورت کے چنگل سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال لاؤں گا۔" وقار کو غصہ سا آ گیا۔

روحی نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا واقعی.....؟"

"ہاں..... کل تم سے میں ایک جگہ انٹرویو دینے کی بات کر رہا تھا نا۔ وہاں مجھے نوکری مل گئی ہے روحی۔ اب کل ہی اماں کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔ تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے۔ تو فکر نہ کر اب ہماری ساری پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں۔"

"کیا سچ وقار.....!" روحی خوشی سے چلا اٹھی۔

"ہاں..... یہ خوشخبری دینے ہی تو میں یہاں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" روحی کو لگا جیسے یک دم ہی اس کی ساری پریشانیاں ہی اڑن چھو ہو گئی ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا اور پرسکون محسوس کیا تھا۔

"چل اس خوشی کے موقع پر کہیں آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" وقار نے اس کو موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں رہنے دو..... کوئی دیکھ لے گا تو پھر.....؟"

"ارے میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔ تمہارا کزن ہوں اور اب ہونے والا شوہر....." وقار نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "چل جلدی بیٹھ دیکھو موسم بھی کتنا اچھا ہو رہا ہے۔"

اس کی بات پر روحی بھی ہنس پڑی۔ موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھی وہ جھومتی گنگناتی ہواؤں میں اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آدھا گھنٹہ وہ ادھر ادھر پھرتے رہے۔ ٹھنڈی آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے ایک دوسرے سے پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ واپسی پر وقار روحی کو اس کے گھر کی گلی کے نکڑ پر اتار کر چلا گیا۔

روحی گھر پہنچی تو آج پھر رشتے کرانے والی ثریا کو اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ آہستہ آہستہ کچھ کھسر پھسر کرتے پایا۔ وہ کوئی راز و نیاز کی باتوں میں مصروف تھیں۔ روحی کا دل جیسے بیٹھ گیا کہ آج کوئی پھر رشتے والا معاملہ ہے۔

روحی کے اندر آنے پر رضیہ نے حقارت و نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بنایا تھا۔ مگر روحی بغیر کوئی بات کیے یا سنے چپ چاپ اندر کمرے میں چلی گئی۔

گھر کے سارے کام اس کے منتظر پڑے تھے۔ اس نے پہلے باورچی خانے میں پڑے سارے گندے برتنوں کو دھویا اور پھر آٹا گوندھ کر سالن چڑھا دیا۔ وہ روٹیاں پکانے لگی تھی کہ باہر صحن سے اس کی سوتیلی ماں رضیہ کی آواز آئی۔

"اے روحی..... ادھر آ میری بات سن۔" رضیہ اس کو بلا رہی تھی۔

"آئی اماں.....!" وہ بولی۔

"یا الٰہی خیر....." روحی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھ کر باہر صحن میں آ گئی۔

"جی اماں....." وہ ہولے سے بولی۔

رضیہ صحن میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رشتے کرانے والی ثریا جانے کب کی چلی گئی تھی۔

"اے روحی وہ کاظمی صاحب نہیں ہیں، جن کی بیوی ماسٹرنی ہے، اے وہ ہی..... ان کی بڑی بیٹی کی آج رات مہندی ہے۔ کوثر گھر گھر پیغام دے رہی تھی۔ ہمیں بھی کہہ گئی ہے تو ایسا کر تو رات کو چلی جانا۔ کہا تو اس نے مجھے ہے پر مجھ نگوڑی سے کہاں اٹھا بیٹھا جاوے ہے۔ پھر میں اتنی ساری عورتوں میں بھلا اچھی لگوں گی۔ اس لیے تیرا کہہ دیا ہے کہ روحی آ جائے گی۔" رضیہ نے اپنے سر پر دوپٹا سیدھا کیا۔

"پر اماں میں....." روحی گڑبڑا گئی۔

"ہاں تو۔ اے کوثر تو جانے ہے روحی، بڑی تو تو ہے۔"

روحی کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا، ویسے بھی اسے یہ ڈھولکی اور مہندی والے فنکشن پسند ہی نہیں تھے۔ رضیہ بھی اس کی حالت کو جیسے بھانپ گئی تھی۔

"اے روحی..... میں تمہیں بالکل نہ بھیجتی، مگر جانا بھی ضروری ہے۔ آخر محلے داری ہے۔ سو آنا جانا ہوتا ہے۔"

"پر اماں..... میں اکیلی..... کیسے جاؤں گی۔ مجھے تو گھر کا بھی پتا نہیں ہے۔"

"اے لو..... یہ کون سی بات ہوئی بھلا۔" رضیہ بولی۔ "تجھے اکیلی تھوڑی جانے دوں گی میں، چھوڑ آؤں گی اور ہاں راستے میں ہمارے ساتھ ثریا بھی ہو گی۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ پکی سڑک پر کیکر کے درخت پر ہمارا انتظار کرے گی۔ وہیں سے تھوڑی دور کو کاظمی صاحب کا گھر ہے۔ اور وہیں پر ثریا تجھے گھر چھوڑ

دے گی۔ گھنٹے دو گھنٹے کی تو بات ہے ساری۔"

روحی نیم رضامندی کھڑی سب کچھ سن رہی تھی کہ اندر کمرے سے کوثر بھی باہر صحن میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

"اماں! اس کو چھوڑ دیکھ میں چلتی ہوں۔" کوثر رضیہ کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھی۔

"اف اماں مجھے اتنا شوق ہے۔ مہندی اور شادی کی کسی تقریب میں جانے کا...... ڈھولکی پر گیت گانا مجھے بڑا ہی اچھا لگتا ہے۔"

"تو چپ رہ...... نا ہنجار کم عقل کہیں کی۔" رضیہ نے اس کو ڈانٹا۔

"روحی جا جو رہی ہے۔ تو کیا کرے گی؟ تو گھر بیٹھ، تیرا ابا بھی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ رات گئے لوٹے گا۔ اکیلا گھر ہے۔"

"پر اماں......" کوثر ضد کرنے لگی۔

"میں نے کہا نہیں تو نہیں جائے گی تو۔" رضیہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ تو کوثر پاؤں پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی اور پھر روحی بھی باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔

شام جلد ہی رات میں تبدیل ہو گئی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگا تو رضیہ کمرے کی طرف گئی۔ جہاں کوثر ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی اور روحی پلنگ پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"اے روحی تو یہاں بیٹھی پڑھنے میں لگی ہوئی ہے۔ تجھے یاد نہیں مہندی پر جانا ہے۔ گھڑی پر وقت دیکھا ہے۔ آٹھ سے اوپر ہو رہے ہیں۔ چل جلدی سے کپڑے بدل اور اوڑھ لے۔ میں بھی دوسرے کمرے سے اپنی چادر اٹھا لوں۔"

رضیہ یہ کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں چادر اٹھانے کے لیے گئی تھی کہ اچانک بجلی نے آنکھ مچولی کی اور کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔

"خدا غارت کرے ان بجلی والوں کو...... اسی وقت ہی بجلی کاٹنی تھی۔" رضیہ اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی کہ کہیں سے چادر مل جائے۔ آخری بڑی کوششوں سے اس کو چادر ملی۔ جیسے وہ اوڑھ کر باہر برآمدے میں آئی تو روحی کو صحن میں اپنا منتظر پایا۔ جو سیاہ برقع میں ملبوس تھی۔ باہر چاندنی کی ہلکی ہلکی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

رضیہ اس کو لیتے ہوئے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اپنی گلی میں وہ چلتی ہوئی ایک دوسری گلی میں داخل ہو گئیں۔ دوسری گلی کا موڑ مڑتے ہی سامنے کچی سڑک آ گئی جہاں سائیڈ پر ایک بڑا کیکر کا درخت تھا۔

"اے ثریا نے تو یہیں کا کہا تھا کہ یہیں کھڑی ہوئی ملوں گی۔ یہ کہاں رہ گئی......" رضیہ منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

پھر نجانے کیوں وہ یک دم ہی پریشان سی نظر آنے لگی۔ لیکن کچی سڑک پر وہ دونوں کھڑی ہوئی آپس میں ایک لفظ بھی نہیں بولیں۔

ابھی ان دونوں کو وہاں کھڑے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک کار اس کچی سڑک پر سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ کر رکی اور وہ دونوں ایک دم ہی چونک کر بوکھلا سی گئیں۔ اس کار میں سے دو بدمعاش ٹائپ بندے اترے۔ ابھی وہ دونوں سنبھل نہ پائی تھیں کہ ایک بدمعاش نے دھکا دے کر رضیہ کو پیچھے کیا۔ رضیہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ پیٹھ کے بل نیچے زمین پر جا گری۔ کیکر کی مضبوط لاٹھی اس کے سر پر لگا تو رضیہ کا سر جیسے گھوم گیا۔ آنکھوں کے گرد تارے سے ناچنے لگے۔ اسی کیفیت میں اس نے سامنے دیکھا تو تھر تھر کانپتی روحی کو ان بدمعاشوں نے زبردستی کار میں ڈالا اور کار شہر کی طرف دوڑا دی۔

زمین پر گری رضیہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ سکے یا کچھ کر سکے۔ جلد ہی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ بمشکل کیکر کے تنے کی ٹیک سے اوپر اٹھی۔ خوف و پریشانی کی وجہ سے رضیہ کا سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ جلد ہی اس کو تیز تیز قدموں سے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سامنے دیکھا تو وہ ثریا تھی جو ادھر اس کے پاس ہی چلی آ رہی تھی۔

"تو...... تو...... کہاں رہ گئی تھی؟" ثریا کے قریب آتے ہی رضیہ نے جلدی سے سوال کیا۔ رضیہ کا جسم خوف اور ڈر کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔

"مجھے وہ راستے میں دیر ہو گئی۔ تمہیں تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے۔ کیوں کیا ہوا؟" ثریا کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"وہ...... وہ...... روحی کو اٹھا کر لے گئے......"

آدمی تھے۔ کار میں ڈالا اور چلے گئے۔ رضیہ کے منہ سے بمشکل الفاظ ادا ہوئے۔ "تو اتنی گھبرائی اور پریشان کیوں ہے پاگل۔" ثریا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ تیرا کام ہو گیا۔ جس کی تجھے خواہش تھی۔ تو یہاں خوامخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ ارے وہی تو آدمی تھے۔ جس کی دوپہر کو میں نے تم سے بات کی تھی۔ تو خود ہی تو اس بات پر راضی ہوئی تھی۔"

"ہاں..... کام تو ہو گیا ثریا۔" رضیہ نے چادر سے پسینہ صاف کیا۔

"پر یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میرے تو ہاتھوں کے طوطے تک اڑ گئے۔"

"ایسے کام تو اس طرح ہی ہوتے ہیں۔" ثریا مسکرائی۔

"مگر ثریا..... کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا دل ابھی تک ڈر رہا ہے۔" رضیہ ابھی تک پریشان تھی۔

"ارے کیسی گڑبڑ، ثریا نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنی آسانی سے اس کلموہی سے میری اور میری بیٹی کی جان چھوٹ گئی، لیکن وہ کم بخت کہیں واپس ہی نہ آ جائے۔" رضیہ اب بھی شک و شبہ میں تھی۔

"اری تو تو جھلی ہے جھلی۔ میرے دھندے کے بھی کچھ اصول ہیں۔ اک بار چھوکری ہاتھ لگی تو چلی گئی۔ کوئی لاکھ چاہے پھر نہ لوٹ سکے ہے۔"

ثریا کے کہنے پر رضیہ کو جیسے اطمینان سا ہو گیا اور اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ عود آئی۔

"اے چل رضیہ مہندی میں چلتے ہیں۔ ذرا شغل میلہ کرتے ہیں۔ تو اپنی جیت کا جشن ہی سمجھ لینا۔" ثریا نے آنکھ دبائی۔

"آج تو ڈھولکی کی تھاپ پر جی بھر کر ناچوں گی۔" رضیہ کے انگ انگ میں جیسے سرشاری سی امڈ آئی۔

دو تین گھنٹے بعد وہ دونوں مہندی میں غل غپاڑہ کرتے ہوئے واپس لوٹیں۔ ثریا اپنے گھر کی طرف چل دی اور رضیہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ اپنے شوہر نور دین کو باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ نور دین تھوڑی دیر پہلے دوسرے شہر سے اپنے گھر پہنچا تھا۔

"غضب ہو گیا نور دین۔ ہم لٹ گئے تباہ ہو گئے۔" رضیہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو اونچی آواز سے روتے ہوئے بولی۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے رضیہ.....؟" نور دین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو آتی رات کو آ کہاں سے رہی ہے؟" نور دین کی آنکھوں میں سوالیہ تاثر تھا۔

"وہ..... وہ کاظمی صاحب کی بیٹی کی مہندی تھی، میں روحی کو ساتھ لے گئی تھی مگر..... وہ راستے میں پکی سڑک پر دو غنڈے روحی کو اٹھا کر کار میں لے گئے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے تو رضیہ ہوش میں ہے۔" نور دین زور سے دھاڑا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں نور دین۔" رضیہ اس کو یقین دلانا چاہ رہی تھی۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا۔ روحی تو اندر کمرے میں ہے۔ میں نے ابھی دیکھا ہے۔"

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے!" رضیہ کے لیے یہ خبر جیسے کسی بم سے کم نہ تھی۔" وہ تیزی کے ساتھ اندر کمرے کی طرف دوڑی۔

واقعی روحی پلنگ پر آنکھیں موندے پڑی ہوئی تھی۔ رضیہ نے جیسے اس کو جھنجوڑ دیا۔

"تو..... تو یہاں کیسے.....؟ تو تو میرے ساتھ گئی تھی۔ کیسے لوٹ آئی.....؟" رضیہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

"میں اماں گئی کب تھی۔ وہ تو کوثر زبردستی میرا برقع اوڑھ کر تیرے ساتھ چلی گئی تھی۔" روحی کے الفاظ تھے یا کوئی زہر میں ڈوبے تیر جس نے رضیہ کے دل کو جیسے چیر سا دیا تھا۔

"ہائے میری بیٹی کوثر....." رضیہ زور سے چیخ اٹھی۔

اس کو لگا جیسے پورا آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر جا پڑی۔ رضیہ اپنے ہی دام میں آپ آ گئی تھی۔ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے تو خود ہی اس میں جا گرتا ہے اور اسی کا نام مکافات عمل ہے۔ جس کی گرفت میں رضیہ آ گئی تھی۔

☆.....☆

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

آشیانہ	اعجاز احمد نواب	400/-
جزیرہ	اعجاز احمد نواب	600/-
تیری یادوں کے گلاب	شازیہ اعجاز شازی	300/-
کانچ کے پھول	غزالہ جلیل راؤ	500/-
پیڈیا بجھنے نہ پائے	محمد سلیم اختر	300/-
وش کنیا	ایم اے راحت	400/-
درندہ	ایم اے راحت	300/-
تعلی	ایم اے راحت	200/-
بھرم	ایم اے راحت	200/-
چیمپئن	خاقان ساجد	400/-
وحوش	خاقان ساجد	150/
دھواں	فاروق انجم	300/-
دھڑکن	فاروق انجم	300/-
درخشاں	انوار صدیقی	700/-

قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

نواب سنز پبلی کیشنز

192/1، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی Ph: 051-5555275

چھٹی سچ بیانی

مرد

محمد مزمل

اضطراب سے پُر ایک مرد کی روح میں اتری داستانِ عجب

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دھند کے چیڑے چیر کر رہی چونچالی سے رقص کر رہا تھا۔ ایم ٹی سے ڈی جی روڈ کی جانب جانے والی سڑک پر کسی سکوت کی سی کیفیت طاری تھی غالباً رات کا کوئی پہلا پہر اپنی مسافت کا آغاز کر چکا تھا۔ سارا شہر نیند سو کر کسی شہر خموشاں کا سا منظر پیش کر رہا تھا اور ایسا سکوت طاری تھا جیسے ہوا کے دوش پر کوئی چیز پھڑ پھڑا کر پورے وجود میں سرایت کر جاتی تھی۔ اس اندھیرے اور شدید جاڑے میں جب چاند کروٹ بدل رہا ہوتا ہے، ستارے سو چکے ہوتے ہیں تو میں تنہائی کے لمحات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اکثر اس سڑک پر چل نکلتا ہوں۔

سڑک پر حد نگاہ کسی ذی روح کا سایہ تک نہیں تھا اور میں خراماں خراماں رواں دواں تھا۔ یکبارگی اطراف سے آہ و فغاں کا ایک انتہائی سلسلہ اپنی طرف توجہ کر لیتا ہے جو رات کی اس بال کھولتی تاریکی اور جاڑے میں ایسے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ جیسے آنسوؤں کا ذخیرہ اس کے حلق میں پھنس پھنس جاتا ہو، میں مضطرب ہو جاتا ہوں اطراف میں نگاہ دوڑانے کے بعد میں اسے جھنڈ میں تلاش کرتا ہوں، کافی سعی کے بعد وہ میرے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم ہچکیاں ممتا کی گود میں، ایک شیر خوار نومولود بچہ جس پر اس کے آنسو ٹپ ٹپ کرتے چلے جاتے ہیں۔

"شازو کہاں چلی گئی تو، ہائے! ہم لٹ گئے ہم برباد ہو گئے، ہم برباد ہو گئے، ارے تیرے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا تو بتاتی کیوں نہیں۔ تیرا ناس جائے ہماری ناک کٹ گئی، شازو بھاگ گئی۔

"ارے انور کہاں تو بھی شہر جا کر پتا کروا کر لے آ کسی چھوکرے کی بغل میں سو رہی ہو گی مر رہی ہو گی۔"

"اپنی بکواس بند کرو ورنہ......" انور خان کلہاڑا لیے وار کے لیے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مارے خوف کے اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں۔

"ارے میں نے کہتی تھی کہ تو شازو کے رشتے کے لیے ہاں کر دے، اب لے گیا نہ بھگا کر......" "اپنی بکواس بند کر ورنہ......" اور وہ ایک بار پھر کلہاڑے کے زور پر اچھل پڑتا ہے۔ اس چھوکری نے تو ہماری عزت ہی اتروا کر رکھ دی ہے۔"

☆......☆

نالے کے اس پار جانے والے سڑک پر پکی جوڑا دوڑ رہا ہے شہر قریب پڑتے ہی اس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی

سے بڑی عیاری سے کام لیتے ہوئے دونوں اپنا سانس بحال کرتے ہیں اور ثنا گویا ہوتی ہے۔

"ہم کہاں جائیں گے۔" وہ بولی۔ "گاؤں میں ہمارے بھاگنے کی خبر سب کو ہو چکی ہوگی۔ پوری بستی اور گھر میں ہیرے اور ... کا ... ہوگا۔"

اور وہ قدرے تیزی سے اس کے ساتھ ... کی ... کھولتی ہے۔ اس کی ... ساتھی دولھن کی طرح چلتے جاتی ہیں اور آنکھوں میں کسی انجانے خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں ہی نکلے پھرتے ہوں گے۔ ڈر اور خوف جیسے اس کی پیشانی سے عیاں ہو رہا ہے۔

"آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں..."

"ہاں جس روز تمہارے بابا کے پاؤں کے تلے سے پتا تھا کہ ثناء میری زندگی ہے۔ وہ کسی عزت سے رخصت کر دے۔ اگر تمہارے بابا چوہدری تک نہیں پہنچی۔" اور پھر وہ اس کی جانب مڑتا ہے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ "ثناء تم تو جانتی ہو نا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس روز کی ... کے لیے میں روزانہ تمہارے ... چلا آتا تھا اور تمہارے ... نے ... جاتے ہوئے ...

ایک ادا سے کہنے لگتا ہے۔ "میں نے شہر کے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کروا لیا ہے اور اس وقت اندھیرا ہمارے ساتھ ... سے رہا ہے۔ عدالت کا دروازہ کھلنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔"

☆ ☆

دونوں ایک ہی ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہیں اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ... بات ... گویا ہوتا ہے۔

"میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ شادی کے بعد ہم ایک ہی ہوٹل میں کھانا کھائیں ... قرابت کے حصول کے لیے میں برسوں ترسا ہوں اور آج ... تمہاری ... میں نے کوئی ... نہیں ..."

اور وہ ... ہوئی ... ہے "میں نے ایسا تب کیا ... محبت ... لی۔"

"تو وہ ... اس ... طرح ... عدالت ... اس شہر سے ... چاہیے ... خاموش رہنے کے بعد ... میں مشغول ... ہے۔

"... گاؤں ... محبت ..."



ہوگی اور اسکول تو کیا ہر جگہ میرا وجود تلاش کیا جاتا ہوگا۔" دکھ کی ایک لمبی لہر اس کے چہرے کے اطراف سے پھوٹتی ہوئی سبز اور نیلاہٹ سے چور رگ سے عیاں ہورہی ہے۔

اور وہ ایک بار پھر پکار اٹھتا ہے۔ "شاذو ان باتوں کو چھوڑ میری قربانیوں کو یاد کرو، کہ کیسے رات آنکھوں میں کاٹتا تھا اور ساری رات اس پیڑ تک چھپ کر تمہاری راہ دیکھتا، نہ سرد نہ گرم کا احساس اور اوپر سے تنہائی میں تمہاری یادوں کا خمار تھوڑے برساتا تھا۔"

☆......☆

مگر میں جب بھی تمہیں دیکھتا تو دل وہ دن کے سارے الجھاؤ کسی ہوا کے دوش پر دور جا پڑتے......" اور کچھ دیر گم صم رہ کر اس نے کہا۔ "بتاؤ شاذو کیا ایسا نہیں ہے۔" اور وہ دھیرے سے ہنس دیتی۔ ایک ادا سے چہرے کو حرکت دیتی اور کہتی۔ "ہاں ہاں۔ ایسا ہی ہے۔"

"رات کافی ڈھل چکی ہے اور تمہارا سونے کے متعلق کیا خیال ہے۔" اور وہ ادھر ادھر بے قراری سے جھانکنے کے بعد کہہ اٹھی "میرا کوئی خیال نہیں ہے، نیند اس سے کوسوں دور ہے۔" کرب کا ملگجا سا ہیولا اس کے اندر سے عیاں ہورہا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ایک تو تمہاری پچھلی یادوں کا خیال چین نہیں لینے دیتا اور دوسرا مجھے وکیل کی الجھن کھائے جارہی ہے۔ پہلے تو کوئی وکیل تیار نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو معاوضہ زیادہ مانگتا ہے۔

دونوں مضطرب ہیں۔

رات تاریکی میں ڈھل چکی ہے اندرون دان کھڑکیاں دروازے بند اور پردے سرکا دیے جاتے ہیں اور دونوں باہوں میں باہیں ڈالے کسی سوچ میں غرقاب ہیں اور اس رات تو بہت دیر تک جاگ کر ان کی آنکھ لگتی ہے۔

☆......☆

سردیوں کے سورج کی شفق آہستہ آہستہ کھڑکیوں اور دروازے کے سوراخوں سے جھانکتی ہوئی چھن چھن کر اندر آرہی ہے۔ سورج کی پہلی روشنی کی عجیب کیفیت کمرے میں پھیل رہی ہے اور وہ دونوں آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوتے ہیں۔ چائے پانی سے فراغت کے بعد وہ کپڑوں کے حصول کے لیے مارکیٹ جاتے ہیں۔ دلہن کا آراستہ لباس خریدتے ہیں اور اب وہ عدالت کے احاطے میں جا موجود ہوتے ہیں۔ احاطہ عدالت میں ہر ایک کا تانتا لگا ہوا ہے۔ وکلا اپنی فائلیں اٹھائے چار آدمیوں کے ساتھ آ اور جا رہے ہیں، ہر آنے والے اپنے وکیل کی خدمت بڑے زور و شور سے کررہے ہیں اور یہی حال ان کا۔

☆......☆

کورٹ میرج کرنے کے بعد اب وہ اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور کسی دوسرے شہر میں مقیم ہیں۔ دلاور خان ایک اعلیٰ فرم کا ملازم ہے۔ ہر دوسرے دن عیش و عشرت میں خوب بسر ہورہے ہیں، کبھی کسی میوزیم میں لے جایا جارہا ہے، کبھی کسی پارک میں، تو کبھی کسی جگہ زندگی ٹھہر رہی ہے، رنگ نکھر رہا ہے، پھول کھل رہے ہیں اور وہ چرب زبانی میں اتنی مہارت رکھنے لگا ہے کہ بات بات پر جتانے کا عادی ہے۔

"دیکھو! میں تمہارے لیے کیا کیا کررہا ہوں۔ وہ دوشیزہ کے لیے تم چنتی گئی تھی۔ وہ.... تمہیں کیا خلاصہ کیا سمجھا تھا۔ ہاں، ہاں.... بولو...." دلاور خان کی یہی گردانیں اکثر اوقات اسے سخت خلجان میں مبتلا کیے رکھتیں اور وہ اکثر اس پر خاموش ہو رہتی، مگر دلاور خان بجائے اس کی خاموشی کا اعتراف کرنے کے اور بھی چلنے لگا ہے کہ شاید اس کے بڑے ہونے کا اعتراف کیا جا رہا ہے، مگر جب بات حد سے بڑھ جاتی تو وہ بھی آسانی سے خاموش نہ ہوتی۔

☆......☆

زندگی کی گاڑی پھر سے رینگنے لگتی ہے۔ "اچھا شاذو بتاؤ تمہارے سپنوں کا راج کمار کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا" رات کا دوسرا پہر پہلو بدلنے کے لیے جیسے بے چین کھڑا ہو اور اس کے گلے سے ہچکیوں کی آوازیں بار بار خاموش کروانے کے باوجود اٹھ رہی تھیں۔

"وہ.... وہ قریشی والا کا تھا۔" یکدم خاموش رہنے کے بعد اس کی آواز ابھر آئی، جو ہمارے گاؤں سے تین کلومیٹر دور پڑتا تھا، میں اس وقت ایک اسکول میں پڑھتی تھی، پھر ایک دن اس نے سر راہ اپنی نظریں ملائیں، میں یہی سمجھی کہ یہی ہے میرا جیون ساتھی اور پھر جیسے کائنات کا راز طشت از بام ہو گیا، اس کی قربت بھی میرے ساتھ

انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ وہ بھی پہلی نظر پڑتے ہی مجھ پر فریفتہ ہو گیا تھا اور جب میں اس کے سحر میں گرفتار ہوئی اس وقت میں میٹرک کر رہی تھی۔ وہ روز راہ میں آ کھڑا ہوتا، ہم دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور پھر اور پھر تو جیسے بے تکلفی بڑھتی ہی چلی گئی، جیسے پھول کی کلی کھلتی ہی چلی گئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی، اماں اور باوا کو پتا چل گیا اور پھر تو مجھے اسکول سے ہی اٹھوا لیا گیا۔ ابا نے کڑی شرائط عائد کر دی تھیں کہ اس نے اگر اس کی غیر موجودگی میں گھر سے ایک قدم بھی باہر رکھا تو وہ اس کی ٹانگیں کاٹ پھینکے گا۔

مگر...... مگر چوہدری جی، آپ تو جانتے ہیں نا کہ دل کو بندہ کیسے سمجھائے اور پھر وہ رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے آتا، دیوار پھلانگتا اور ادھر میں بھی ہمہ تن متوجہ ہوتی اور پھر ہم حویلی کے پچھواڑے میں گھنٹوں بیٹھے رہتے اور ایک دوسرے کے درد میں شریک ہوتے، قرابتیں بانٹتے اور کبھی تو وہ شام ڈھلتے ہی آ جاتا اور کسی خطرے کی نزاکت کے پیش نظر درختوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور جب وہ میرے سامنے آتا تو شان سے، چوڑا ہو کر ایسی باتیں کرتا کہ میرا دل مچل جاتا۔

یونہی روز کرتے کرتے جب وہ مجھ سے مطمئن ہوا تو ایک شام آتے ہی زار زار رونے لگا۔ "شازو اب جلدی سے میری ہو جا، دیکھ اب تو دل بھی بے چین سا ہو کر رونے لگا ہے۔ سارا دن دفتر میں کام کرنے کی بجائے اب تمہیں ہی سوچنے لگا ہوں۔ ہماری قرابت رات کے اس پہر میں ہوتی جب خاموشی کا ہر طرف پہرا ہوتا اور پھر ایک روز تو حویلی پھلانگتے ہی دلاور خان نے مجھے زور سے بھینچنا شروع کر دیا اور کہا کہ اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے شادی کرے اور میں ایک لمحہ سے بھی۔ شادی کرنا ہمارے بس میں کہاں ہوتا ہے، دلاور خان، تو ہی آخر اپنی اماں اور باوا کو بھجوا دے اور شاید کہ ابا مان جائے۔ اور پھر دلاور خان نے اگلی صبح اٹھتے ہی اماں سے ذکر چھیڑنا شروع کر دیا کہ اس نے ایک چھوکری دیکھ لی ہے، بہت زوروں کی ہے۔ اونچا لمبا قد، گورے گال، شربتی ہونٹ، ستواں ناک، نرگسی آنکھیں اور سوکھا پن سادگی میں بے مثال ایسے جیسے اپنی اچھن اور اس روز تو وہ نہال ہوئے جاتا تھا۔

☆....☆

دلاور نے ایک ہفتے کی بھاگم بھاگ میں ماں کو راضی کر کے شازو کے ہاں رشتہ کہلوا بھیجا مگر انور خان نے صاف انکار کر دیا کہ شادی تو دور کی بات وہ اس کی بیٹی کا نام تک نہ لے اور پھر تو جیسے دلاور خان کو تاؤ چڑھ گیا اور پھر ایک رات جب آدھی رات کا چاند بھی چھدری چھپے نکلتا دیکھ رہا تھا اور پھر یونہی چھپتے دوڑتے ہم نے دلاور کے چچا کے ہاں جا دم لیا اور پھر وہاں سے بھاگتے اور دوڑتے جیسے شام ڈھل گئی۔ ہم ایک ہوٹل پہنچے، وہاں رات کو سوتے وقت اس نے مجھے چھوا تک نہیں، پر کھا تک نہیں، اور صرف اور صرف اپنے زخموں اور دکھوں میں جی بہلاتا رہا۔ اور رب اس کی..." "بس، بس آگے بیان کیجیے پھر کیا ہوا، تم شادی کے بعد آپ کی خوشی دور ہے تھے۔ دیکھیے بابو جی! آپ تو جانتے ہیں نا کہ شادی کے بعد وہ ذات انسان کو کھلوا بھی عطا کرتی ہے۔ جوان کے درمیان مزید محبت کا ذریعہ ہوتی ہے۔" "تم بھی بس، شہد کی طرح اب آگے بھی کہو نا" میں نے قدرے نقارت سے کہا تو "کیا ہوا بابو جی ایک دن یونہی الٹرا ساؤنڈ کروانے پر بچے کی تشخیص میں بچی کا سن کر اس کا دماغ چکرانے لگا، ہوک چڑھ گئی اسے، گھر آتے ہی بھڑک اٹھا۔ یہ کس نا گن کو جنم دے رہی ہو، بڑی ہو رہے گی تو کیا کیا گل کھلا دے گی۔ اور اور ہمارا تو کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں رہے گا۔ وہ بری طرح بھن بھن جاتا تھا۔ پیدائش پر جب میں اضطراری کیفیت سے گزر رہی تھی اس نے جو ظلم کے پہاڑ توڑے۔ وہ آج بھی پہلے دن کی طرح میری سنگین یادوں کی پردۂ اسکرین پر موجود ہیں۔ بچی کے جنم لینے کے کئی کئی دن بعد وہ مجھ سے کھل جایا کرتا تھا، یہی نہیں کہ وہ بچیوں سے شفقت نہیں برتتا تھا، بلکہ وہ یہی کہتا کہ بچیاں پرایا دھن ہیں اور......" اور پھر شازو نے دوسری بچی کا بتانا شروع کر دیا کہ اس کی پیدائش پر بھی دلاور خان زمین میں گڑا جاتا تھا، اس کا بس چلتا تو وہ مجھے قتل کر کے رکھ دیتا۔"

ٹپ ٹپ گرم گرم موتیوں کا سمندر جیسے اس کی آنکھوں سے بہ نکلا تھا۔ دونوں بچیاں سہمی ہوئی تھیں

اور اس شدید سردی میں ان کے فاقہ زدہ جسم اس طوفانی جاڑے سے کانپ اٹھتے تھے تو پھر کیا ہوا بابو جی میری تیسری بیٹی بھی پیدا ہوئی، مگر میری غیر موجودگی میں ظالم نے اس کے اوپر ایسے وار کیے کہ اس کا بیچ ہوش جاتا رہا۔ میں نے بہتیرا غل مچایا، مگر، کچھ نہ ہو سکا اور میں تیسرے کھلونے کی یادوں کا عکس سمیٹتے سمیٹتے رہ گئی۔ پتا نہیں اللہ نے مجھ پر یہ عذاب جھیلنے کے لیے کیوں ڈال دیا ہے کہ بجائے میں ولاور خان کی قربت حاصل کرنے کے اس کے طعنے اور جھڑکیاں سہہ رہی ہوں، مگر میں نے حد سے زیادہ صبر کیا ہے اور پھر ایک روز تو اس نے یونہی کسی بات پر پوری گلی میں میری عزت تار تار کر دی، مگر، میں نے اس کے آگے حرف تک نہیں نکالا، پتا نہیں میں نے بیٹیاں پیدا کر کے کون سا گناہ سر لیا ہے کہ وہ دن کی صحبت کے بعد اب تک عذاب میں جل رہی ہوں۔ اب وہ چھوٹی بیٹی کی جانب اشارہ کرنے لگتی ہے، کہ اس کی پیدائش بھی کی پر میرے نہانے کے سوا سینے سے بھی پہلے کسی بات پر سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا ہے اور میرا کیا آفرین دیکھیے کہ میں نے ایک لفظ بھی گستاخی کا نہیں کہا، نہ جانے کیوں اسے معصوم بچیوں اور میرے وجود سے نفرت ہو چلی ہے۔ سوچ سوچ کر شادی کے آٹھویں سال ہی سے بالوں میں سفیدی آ گئی ہے تو پھر کیا ہوا" میں نے پوچھا۔ "وہ بات بڑھاتے ہی کہنے لگی مجھے اور میرے بچوں کو باہر دھکے دے کر اندر سے دروازہ لگا لیا۔ میری حالت اتنی نہیں تھی کہ ٹھیک طرح سے چل پھر سکتی، میں نے اس سے لاکھ منتیں کیں کہ معاف کر دے اس تاریکی اور کاٹ کھاتی سردی میں میرے بچے مر جائیں گے، مگر دیکھیے جی اس وقت سے اس ذات کا نام لے کر چلی ہوں" اس کے الفاظ جیسے رستے چلے گئے۔

وقت جیسے گزرتا چلا جا رہا تھا، ہوائیں سرسراتی چلی جا رہی تھیں، کسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس پتلا خاکی میں کیا اضطراب اور دکھ کروٹ چل رہا ہے۔ رات اور بھی بھیانک ہو چلی تھی، سارا شہر کسی کے غم سے بے نیاز میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اور ایسا سکوت طاری تھا جب بھی ہوا کے دوش پر دباؤ ڈالتا تو خوف کی لہر پورے وجود میں کرنٹ دوڑا دیتی۔ ستارے آہستہ آہستہ سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

دفعتاً اسے ایسا جوش چڑھا کہ میرے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

"بولو...... تم مرد کیسے ہوتے ہو...... تم کس مٹی کے بنے ہوتے ہو۔ بولو لڑکیوں کو تو کہتے ہو تم میں وفا نہیں ہوتی تمہاری وفا کہاں ہے؟ کیا یہی وفا ہے کہ شادی سے پہلے چرب زبانی سے لڑکیوں کے دل لبھاتے ہو اور وہ دل ان کے وجود سے خطا اٹھانے کے بعد انہیں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہو۔ بتاؤ...... یکلخت اس کے ہاتھوں کی گرفت مزید سخت ہوتی گئی اور میرا گریبان سے نچلا دھڑ ایسے مفلوج ہو چلا، گویا ہوا کے دوش پر کہیں دور جا پڑا ہو اور ننھی گریبان اور سر اس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑا رہا ہو۔ "کیا یہی تم مردوں کی مردانگی ہے، کیا یہی تمہاری انسانیت ہے ہم لوگ جسم کی پوجا کو محبت کہتے ہو۔ خاموشی نے گویا خاموشی کو چونکا دیا ہو۔ اور نچلے دھڑ کے ساتھ ساتھ میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو اور پھر ایک چہرہ متلاشی نظروں سے حرکت کرتا ہوا دور ہی سے چلا آ رہا تھا، یہی اس کا نامرد شوہر ہوگا، میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔ اس سے پہلے کہ معاملہ مزید طول پکڑتا میں نے چھوٹتے ہی سرپٹ دوڑ لگا دی...... اور، پھر جیسے کچھ دور چل پڑنے کے بعد ضمیر نے ملامت سے چور کرنا شروع کر دیا کہ کتنا بھگوڑا مرد ہوں ایک عورت کی زندگی کا معاملہ ہے اور میں پنڈا چھڑا کر بھاگ رہا ہوں، بظاہر جیسے آگے چلا جا رہا تھا لیکن ذہن جیسے ندامت کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا اور پھر تو جیسے پیروں میں زنجیریں سی بندھ گئی تھیں۔ ایک قدم چلنا بھی محال ہو رہا تھا۔ ایک بار ضمیر سے آواز ابھری کہ زمین شق ہو جائے اور مجھ سمیت روئے زمین پر موجود تمام مردوں کا وجود خاک اس میں سما جائے اور رہتی دنیا تک عورتوں کا دامن تو داغ دار نہ ہو۔ اس کے فقرے بار بار میری سماعت میں میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

☆......☆

ساتویں سچ بیانی



زخموں کا مداوا

محمد عزیز میمن

ماں باپ کی محبت کو ٹھکرا کر گھر سے بھاگنے والی عورت کی کہانی

"بی بی جی! آپ ضد نہ کریں اور میری بات مان لیں، کیوں کہ اس سے آپ ہی کا نقصان ہوگا۔ ذلت اور رسوائی وہ بلا ہے، اس کو کیوں دعوت دے رہی ہیں آپ؟"

ہماری ملازمہ سلیمہ مسلسل میری منت سماجت کر رہی تھی اور میں حیرت اور پریشانی سے اسے تک رہی تھی، مجھ پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہو رہی تھی۔ آخر میں نے تنگ آکر اس سے پوچھا۔ "آخر کیا وجہ ہے جو تم مجھے بار بار روک رہی ہو، لیکن اصل بات نہیں بتا رہی ہو؟" میرا لہجہ اور انداز اس کی باتوں سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن وہ بولی۔ "یہ بات پوچھنے کے بجائے آپ اس کام سے باز آجائیں بی بی!"

"ہاں" میں نے دل ہی دل میں ایک منصوبہ بنایا اور اسے شروع کر دی۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں اس کام سے باز آ جاؤں تو مجھے اپنی ساری کہانی سچ سچ سنا دو۔"

اس ساری بات چیت کا پس منظر یہ تھا کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ خوب صورت اور جوان تھی اور میں قیصر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ قیصر میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کی مالی حالت ہم سے کم تر تھی، لیکن میں اس کی مردانہ وجاہت پر فدا تھی اور وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ "گلنازو! اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

میں نے جب امی کو یہ بات بتائی اور انہوں نے ابو کو بتائی اور پھر میرے ذریعے قیصر کے متعلق ساری معلومات حاصل کیں تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ہمارا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور وہ ہم سے کم تر لوگ تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اپنے والدین کو رضامند نہ کرسکی۔ انہی دنوں ہم نے ایک نئی ملازمہ گھریلو کام کاج کے لیے رکھی۔ اس نے اپنا نام سلیمہ بتایا تھا اور اس کا ایک بچہ بھی تھا۔ وہ بڑی ضرورت مند تھی اسی وجہ سے ہم نے اسے رکھ لیا اور سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا۔

سلیمہ عمر کے لحاظ سے مجھ سے صرف چار سال بڑی تھی لیکن وہ زیادہ عمر کی دکھائی دیتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں میری اس سے دوستی ہوگئی۔ وہ ہمارا ہر کام بڑے سلیقے اور نفاست سے کرتی تھی۔

میں نے اسے اپنے کوارٹر میں اکثر روتے دیکھا تھا اور اس کی وجہ پوچھتی تھی تو وہ ٹال جاتی تھی۔ جب میری اس سے دوستی بڑھی (بلکہ اسے دوستی کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ بہرحال ہماری ملازمہ تھی) میں اپنی ہر بات اسے بتاتی تھی۔ خصوصی طور پر قیصر سے متعلق جو بھی بات



بولتی تھی۔ وہ بات بڑے غور سے سنا کرتی تو وہ بھی کبھی افسردہ ہو جاتی اور کہیں کھو جاتی۔ میرے ذہن میں یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ سلیمہ محبت کے ناٹک کی ڈسی ہوئی ہے۔

گھر سے باہر قیصر سے میری ملاقاتیں جاری تھیں اور قیصر کا اصرار تھا کہ وہ اپنی والدہ کو ہمارے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، پہلے میں ممی اور پاپا سے بات کروں گی، پھر تم اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجنا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میرے والدین میری شادی قیصر سے کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور مجھ پر غیر محسوس طریقے سے پابندی عائد کرنے لگے۔ اس وقت میں نے سلیمہ کو اپنا ہم راز بنایا اور اس کے ذریعے میری قیصر سے بات چیت ہونے لگی۔ اس کام کے لیے مجھے سلیمہ کی بڑی منت سماجت کرنی پڑی تھی۔ لیکن میں نے قیصر اور اپنی محبت کی خاطر اپنی ملازمہ کی منت سماجت بھی کرلی تھی۔

پھر جب قیصر اور میں نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا تو سلیمہ نے مجھے روکنا چاہا۔ اس وقت بھی کئی باتیں ہو رہی تھیں اور میں نے شرط عائد کردی کہ اگر سلیمہ مجھے اپنے تمام حالات سے آگاہ کرے تو شاید میں گھر سے بھاگنے کا پروگرام ملتوی کردوں۔ میرے شدید اصرار پر سلیمہ نے اپنی کہانی سنانی شروع کردی۔

میرا نام اصل میں کچھ اور ہے۔ یہاں اس شہر میں آکر میں نے نام بھی بدل دیا ہے۔ میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لیے سب کی لاڈلی تھی۔ میرے ماں باپ بھی مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے اور میری ہر خواہش اور ہر ضرورت منہ سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی تھی۔ میرا ہر بھائی دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور میرے لیے بہت سی چیزیں لے آتے۔ میرے کمرے میں بہت سی چیزیں تحفتاً پڑی رہتے۔ موبائل، لیپ ٹاپ وغیرہ

کا سامان بہت تعداد میں جمع تھے اور میں تھی کہ اتنی ڈھیر ساری محبتیں پا کر مغرور ہوتی جا رہی تھی۔ کپڑوں کا ایک جوڑا اور جوتے زیادہ سے زیادہ دس دن تک میرے پاس رہتے، پھر میں انہیں اپنی کسی ملازمہ کو دے دیتی تھی۔

اسی غرور کی وجہ سے میرا کوئی دوست بھی نہیں بن پایا تھا، کیوں کہ میں کسی کو اپنا ہم پلہ سمجھتی ہی نہیں تھی اور نہ اس قابل کہ وہ میرا دوست بن سکے۔ ایسے میں شفقت میری زندگی میں بڑی آہستگی سے آ گیا۔ شفقت اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔

وہ لوگ ہمارے پڑوس میں بطور کرایہ دار آئے تھے۔ پہلی دفعہ جب میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے شفقت کو دیکھا تھا تو مجھے لگا جیسے میرے خوابوں کا شہزادہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ اس کے بالوں کا اسٹائل، دل موہ لینے والا جسم اور دیکھنے کا شوخ انداز مجھے گھائل کر گیا۔

ہمارے گھرانوں کے درمیان بڑی آہستگی سے رابطے بڑھ رہے تھے، مگر ہماری محبت کا پودا بڑی تیزی سے تناور درخت بنتا جا رہا تھا۔ اس دن میں بہت خوش تھی جب شفقت نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ خوشی میرے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی اور میں ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی پھر رہی تھی۔ میری اس خوشی کو کسی نے محسوس کیا تھا اور میرے دو تین بھائیوں نے تو مجھ سے پوچھا بھی تھا، مگر میں اپنی سالگرہ کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال گئی۔

کہتے ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپ سکتے، بالکل ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ ہماری محبت کا پتا بھی چل گیا اور میرے بھائی جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے، لیکن میں شفقت کی محبت کے سمندر میں ڈوب چکی تھی اور اب اسے چھوڑنا میرے بس کی بات نہ رہی تھی۔

میرے بھائیوں کے ڈر سے وہ لوگ یعنی شفقت کے گھر والے وہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اور میں دن رات تڑپتی اور سلگتی رہی۔ آخر بھائیوں اور والدین کو دکھانے کے لیے میں شفقت کو بھول گئی تھی اور کبھی کبھار باہر بھی جانے لگی تھی۔ ایک دن مارکیٹ میں میری شفقت سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت میری ایک سہیلی بھی میرے ساتھ تھی۔ ہم ایک ہوٹل میں گئے اور چائے کا آرڈر دینے کے بعد باتیں کرنے لگے۔ میری سہیلی میری ہم راز تھی اور اس لیے ہم بلا جھجک باتیں کرنے لگے۔ آخر کار ہم نے گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنا لیا، کیوں کہ ہماری شادی میں میرے والدین اور بھائی فولادی دیوار کی مانند رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

منصوبہ کامیاب رہا اور میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی عزت و غیرت کا جنازہ نکال کر گھر سے بھاگ کر شفقت کے ساتھ ایک گاؤں چلی گئی جہاں شفقت کا ایک دوست رہتا تھا۔ وہیں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ چند روز ہم وہاں رہے اور جب میں نے محسوس کیا کہ شفقت کا دوست اور اس کی بیوی ہمیں بوجھ سمجھ رہے ہیں تو میں نے شفقت سے کہا اور ہم ایک دوسرے شہر آ گئے۔

ایک کالونی میں ہم نے مکان کرائے پر لے لیا۔ میں اپنے گھر سے بہت سے زیورات اور نقدی لائی تھی جو کہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی کیوں کہ ضروریات زندگی تو پوری کرنی پڑتی ہیں اور شفقت کے پاس بالکل تھوڑی سی رقم تھی جو کہ کب کی ختم ہو چکی تھی۔

یہاں شفقت نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی مگر اسے کہیں سے بھی نوکری نہ مل سکی۔ اب اس کے مزاج میں بھی چڑچڑاپن آ گیا تھا اور وہ اکثر مجھ سے شکوہ کرتا رہتا کہ میں اسے غلط راستے پر لے آئی ہوں۔ میں نے کہا۔ ”شفقت! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچو۔ یہ نقدی اور زیورات کب تک ہمارا ساتھ دیں گے؟“ اس نے غصے سے کہا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم تو امیر والدین کی بیٹی ہو مگر میرے تو چھوٹے بہن بھائی اور ماں باپ ہیں۔ اب ان کا کیا ہوگا۔ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟“

میں نے کہا۔ ”دیکھو! جب تک یہ زیورات اور نقدی ہے، تم یوں کرو کہ ہر ماہ اپنے گھر کچھ رقم باقاعدگی سے بھیجتے رہو اور ملازمت بھی ڈھونڈتے رہو۔ خدا کرے گا اور کہیں نہ کہیں تو ملازمت مل ہی جائے گی، پھر آپ اپنے

سانحۂ ارتحال

دھوم ٹی وی کے CEO اور روزنامہ قومی اخبار کے ایڈیٹر انچیف الیاس شاکر کے والد حاجی ابا عمر داؤد رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ ادارہ الیاس شاکر کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کے خاندان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ درجات عطا کرے۔ (آمین)

والدین کو رقم بھیجتے رہنا۔"

شفقت رضامند ہو گیا اور یوں ہم ہر ماہ اس کے گھر والوں کو باقاعدگی سے رقم بھیجنے لگے، لیکن احتیاط کے طور پر کبھی اپنا پتا نہیں بھیجا۔ رقم اور زیورات کب تک ساتھ دے سکتے تھے۔ جلد ہی دونوں چیزیں ختم ہو گئیں۔ ادھر میرے پیٹ میں شفقت کی نشانی پل رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات شفقت کو بتائی تو وہ خوش ہونے کے بجائے الٹا ناراض ہونے لگا اور کہنے لگا۔ "اس مصیبت سے نجات حاصل کرو۔ ہم سے تو اپنا پیٹ نہیں بھرا جا رہا اور اوپر سے یہ مصیبت بھی گلے پڑ رہی ہے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنا پرانا وقت یاد آ رہا تھا جب میری ہر خواہش بن مانگے پوری ہو جاتی تھی اور میں ہر روز نیا جوڑا اور نیا جوتا پہنتی تھی اور آج یہ حالت تھی کہ اپنا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہر کام مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شفقت! کیا ہو گیا ہے تمہیں! یہ تو ہماری محبت کی تکمیل اور نشانی ہے۔ تم اس قدر بددل اور سنگ دل کیوں ہو گئے ہو؟"

اس نے مجھے جھڑک دیا اور سگریٹ بجھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ میں تنہا بیٹھی روتی ماضی کو یاد کرتی رہی اور پچھتاتی رہی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر جب میرا بیٹا یاسر پیدا ہوا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد شفقت اچانک کہیں غائب ہو گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔ اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالنے کی خاطر مختلف جگہوں پر کام کیا مگر شاید یہاں مردوں کے روپ میں درندے چھپے ہیں۔ بہت سی جگہوں سے میں نے کام چھوڑ دیا، کیوں کہ وہاں میری عزت محفوظ نہیں تھی اور یوں بھٹکتی پھرتی اب آپ کے پاس ہوں۔"

سلیمہ اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو چکی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ جیسے مستقبل میں کھو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہی حالات میرے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ اچانک سلیمہ بولی۔

"گلنازبی بی! اب تو آپ گھر سے نہیں جائیں گی؟"

"نہیں جاؤں گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سلیمہ کے مردنی چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے اور وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے گلنازبی بی کو میرے ذریعے سے ہدایت بخشی۔"

میں مسکرا دی تھی۔ آج میں تین بچوں کی ماں ہوں اور سلیمہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ جی ہاں جہیز میں، میں نے امی ابو سے سلیمہ کو بھی مانگ لیا تھا اور اب وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ اب وہ میری ملازمہ نہیں بلکہ بہن ہے۔ میرے شوہر شعیب ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک ہیں اور اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہمارے پاس موجود ہے۔ میں آج بھی سلیمہ کی احسان مند ہوں اور مشکور ہوں کہ اس نے مجھے بھٹکنے سے بچا لیا، کیوں کہ قیصر بھی کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ اس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی جس میں لکھا تھا کہ وہ اور بردہ اسمگلنگ کے کاروبار سے منسلک تھا۔ اس کا ایک خط میرے نام آیا تھا جس کی کچھ تحریر یوں تھی۔"......

تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم نے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا، ورنہ تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت کے ساتھ ساتھ ساری دولت و جائیداد بھی جاتی، کیوں کہ قیصر کا منصوبہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔"

☆...☆

آٹھویں سچ بیانی

سب جائز ہے

عبدالغفار عابد

دولت کی ہوس میں گھری ایک عورت کی عبرت خیز کہانی

"تو جانتا ہے زندگی بغیر پیسے کے نہیں گزرتی۔" باگیشری نے انگلی سے زمین پر مستطیل بنا کر 1000 کا ہندسہ لکھا اور گہری نظروں سے جانو کو دیکھنے لگی۔

جانو خاموشی سے اُس کی بات سن رہا تھا۔

"کیا چاہتی ہے تو اب؟" اُس نے میلے کپڑوں سے ہاتھ صاف کیے۔ اُس کی بات سن کر وہ گھٹنے سیدھے کر کے اُن پر چہرہ ٹکائے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"پیسا..... جن ہے ہر طرف سے۔ بس اور کچھ نہیں۔"

"کیا پیسا پیسا لگائے رکھتی ہے تُو ہر وقت..... تیرے کہنے پر میں یہاں شہر آیا ورنہ ہمیں گاؤں میں وڈیرے کی نوکری کیا بری تھی۔ کھانے، پینے، پہننے کو تو سب مل ہی رہا تھا۔ تیری ہوس ہمیں مار دے گی۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"بس یہی تو بات ہے تجھ میں۔ ہم دوسروں کو دیکھ کر نہیں سیکھتے۔ اندھے بن جاتے ہیں۔ تو ایسا کر مجھے کسی کوٹھی خانے پر لے چل۔ تجھ سے تو کچھ ہوگا نہیں۔ میں خود تجھے نوٹوں پر کھیل کر دکھاؤں گی۔"

"زبان سنبھال باگیشری..... اپنے خصم کے سامنے اتنی تیکھی نہ ہو جا..... کہ....." تھوک اُس کے ہونٹوں پر آ کے پھوٹنے لگے۔

"اچھا بابا معاف کر دے۔" باگیشری نے ہاتھ جوڑے۔

"ذرا خیال رکھنا ورنہ تیری چٹیا، ناک کاٹ کے پھینک دوں گا۔ بدمعاش کہیں کی۔"

"دے بابا..... دے جا تجھیا..... روپے دو روپے دے جا..... کھانا کھلا دے۔ تیرے بچے جیویں۔" کسی سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو دیکھ کر وہ فوراً بائیں دستے کشکول لیے اُس کے پیچھے پیچھے تیز صدائیں دیتی چلنے لگی اور جانو بھی جان بوجھ کر لنگڑاتا ہوا۔ "دے جا تجھیا۔ دے جا تجھیا" کرتا دُہائی مچانے لگا۔

☆.....☆.....☆

باگیشری اور جانو گاؤں کے رہائشی تھے۔ دولت کی چمک ہمیشہ باگیشری کی آنکھوں میں ہر انداز میں رہی تھی اور یہی چمک اُسے شہر تک جانو کو پلو سے باندھ کر لے آئی تھی۔ شہر آ کر اُس نے کراچی جیسے بڑے شہر کو اپنی آنکھوں میں سمونے کی ناکام کوشش کی اور سوچ بچار کر کے محنت کے بغیر گداگری ہی کے پیشے میں چارم نظر آیا تھا۔

چند ہی روز میں وہ پورے پیشہ ور بھکاریوں کے روپ میں ڈھل گئے تھے۔

☆......☆......☆

"اوئے شرفو! جا جا کے اس نئی لونڈیا کو لے کر آ ..... لنگڑے کے ساتھ جو چوک پر دھندا کر رہی ہے۔"

بھکاریوں کا ٹھیکیدار سیاہ کالا موٹا بشیرا آج اس نئے مال پر ہاتھ صاف کر دینا چاہتا تھا۔

اجازت چاہیے تھی۔ معاف کر دے۔" بابشری نے ہاتھ جوڑے۔

جانو کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

"لے جا، جا کر اسے چوک پہ چھوڑ کر آ۔ یہ لونڈیا بھلا رہے۔ میں اس سے بات کر تا ہوں ابھی۔"



"اوہ شاباش۔"

چوہدری بعد بابشری اور جانو ان کے سامنے تھے۔

"ہاں جتنی [illegible] کی اجازت سے کام چلا لیا تم لوگوں نے۔" بشیرے نے لال سرخ آنکھیں [illegible]

شاباش دی۔

شرفو جانو کو چوک پر چھوڑ آیا اور اس [illegible] نے بابشری کے [illegible] سے [illegible] اور [illegible] [illegible] ست کرلیا۔

بابشری کے لیے یہ آخری تھا۔

اس کے بعد اس نے [illegible] سے ناتا توڑ کر [illegible] بشیرے سے تعلقات [illegible] کرلیے۔

☆......☆......☆

"تُو ہر وقت کوٹھی خانے کی بات کرتی ہے۔ آج میں تجھے نیا نظارہ دکھاؤں گا۔ بس ایک گھنٹے بعد صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہا دھو کر، پوڈر شوڈر لگا کر میرے ڈیرے پر آ جائیو۔"

سردار بشیرے نے باکیشری کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

سردار! جانو بڑی چی پوں چی پوں کرتا ہے۔ اُس کو تُو سنبھال لے گا۔ زندگی وہ قسم ہے تیرا۔ چی پوں چی پوں تو کرے گا۔ یار تھوڑی ہے تیرا وہ..... بات کرتی ہے۔ دفع ہو۔" گھنٹے بھر بعد وہ صاف ستھری ڈیرے پر موجود تھی۔

سردار سے رہا نہیں تو گیا اُسے اندر تہ خانے میں لے گیا۔ ابھی کسی کارروائی کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا کہ پوں پوں بجتے..... گاڑی کے ہارن نے اُبھرتے اُسے انسان کے جامے میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کی کمر پر چٹکی کاٹ کر اُس نے ایک گندا سا اشارہ کیا اور باکیشری کو باہر کھڑی بلیک شیراڈ میں سوار کرا دیا۔

☆......☆......☆

ایک ہی جھٹکے میں دس ہزار کی خطیر رقم جب باکیشری کے ہاتھ میں آئی تو وہ یہ سب بھول گئی کہ اُس روشن کمرے میں کتنے بندے اُس کی بوٹی بوٹی نوچ رہے تھے۔

اُس رات جانو کا حوصلہ جواب دے گیا اور اُس نے اُس کے رگیدے گئے جسم پر اُسے چار چوٹ کی مار لگائی۔

صبح تڑکے جانو باہر نکل گیا اور باکیشری بخار میں پھنکتی پلنگ پر پڑی رہی۔

سردار بشیرے کے پاس آ کر اُس نے یہ خبر سنائی تو دواؤں سے نئے رنگ دکھانے لگا۔

"میری جان..... یہ لے اسے۔ یہاں سنبھال لے۔" بشیرے نے ایک تیز دھار والا استرا اُس کی شلوار میں اُڑسا۔"

"ہائے سردار..... میں کیا کروں گی اس کا۔" وہ ہکلائی۔

"تُو نے کچھ نہیں کرنا پگلی۔ سب کچھ یہ خود کرے گا۔" سردار نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔

"ہائے اللہ! سردار کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ میں..... جانو کو..... کس طرح۔ نہیں سردار مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب۔"

"تو ہمت کرے گی تو سب کچھ ہو جائے گا۔ چل شاباش! ہمت کر۔ پھر سب کچھ تیری مرضی کے مطابق ہوگا۔"

اور پھر رات آ گئی۔ باکیشری نے جانو کے سوتے ہی کلوروفارم بھرا رومال جانو کی ناک پر رکھ دیا۔ اپنی شلوار میں اُڑسا ہوا استرا نکالا، کھولا اور اُس کے چمکتے پھل کو دیکھا۔ جانو کا منہ کھولا اور زبان نکالی اور ایک ہی وار میں زبان اُس کے ہاتھ میں تھی۔

خون بہنا شروع ہوا اور وہ ایک ہاتھ میں زبان اور ایک ہاتھ میں استرا لیے کر تیز تیز قدموں سے بشیرے سردار کے حجرے کی طرف چل پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مکمل کسی ٹرانس کی کیفیت میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں بھلا اُسے کون دیکھتا؟

☆......☆......☆

"اوئے حنیف دیکھ وہاں اُس عورت کے ہاتھ میں کیا چیز ہے۔" چاندی کی چٹکی چاندنی میں استرے کا پھل چمک رہا تھا اور وہ بے خود آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ گشت پر موجود سپاہی حنیف اور رحیم نے اُسے جا لیا۔

سردار بشیرا اور باکیشری پولیس تحویل میں تھے۔ سردار تو ہر الزام سے بری الذمہ ہو گیا تھا مگر باکیشری پر الزام عائد ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

جانو کی بیوی جیل میں جاتے جاتے اُس کی زبان بھی ہمیشہ کے لیے لے گئی تھی۔ باکیشری جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھری جوانی میں زندگی کے دن سیاہ کر رہی ہے۔ سزا تو سزا ہے۔

بھلے خدا کسی کو بھی طور دے، مگر باکیشری کی آنکھوں کی چمک ماند نہیں پڑی۔ اُن میں آج بھی شیطانی چمک ہے۔ کیا عورت کا ایسا بھی روپ ہوتا ہے؟

یہ سوال آج بھی ہنوز تشنہ ہے۔ کیا اپنی ہوس کے لیے سب کچھ جائز ہے؟

☆☆......☆☆

نویں سچ بیانی



حیاتِ جاوداں

محمد علی سدوزئی

دہشت گردی کا شکار ہونے والے ایک سپاہی کی زندہ کہانی

اگر پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگانے والے ملک دشمن عناصر ایک صرف کمربستہ ہیں تو دوسری جانب پاک سرزمین کے تحفظ کے لیے ریاستی سچ پر لاگو کیے گئے قوانین کی رٹ کو یقینی بنانے کے لیے پولیس کے جوان بھی سینہ سپر ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ جرائم پیشہ ملک دشمن عناصر کے خلاف جاری آپریشن اور ان کے اہداف کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے مصروف عمل باصلاحیت اور فرض شناس پولیس افسران اور نوجوان سپاہی جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ ایسے کئی واقعات ہیں جو صفحۂ قرطاس پر بکھرے پڑے ہیں اور پولیس اہل کاروں کی شجاعت اور بہادری کی داستان سنا رہے ہیں۔ اس ہی طرح کا ایک واقعہ اورنگی ٹاؤن تھانے کی حدود ایم پی آر کالونی الشفاء اسپتال کے قریب پیش آیا۔ عینی شاہدین کے مطابق موٹر سائیکل پر سوار دو مسلح دہشت گردوں نے ہنستے مسکراتے خوش اخلاق اور فرض شناس پولیس اہلکار 40 سالہ مقیم احمد ولد نذیر احمد چوہان کو گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ شہید پولیس اہلکار محکمہ پولیس کے شعبہ ٹیکنیکل اسپیشل برانچ میں ہیڈ کانسٹیبل تعینات تھا۔

شہید پولیس اہلکار مقیم کے بھائی چھیپا کے رضا کار وسیم احمد نے بھائی کے ساتھ گزرے دن کی یاد میں دہراتے ہوئے بتایا کہ میرے والد نذیر احمد چوہان دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے بڑے اور انتہائی خوش اخلاق اور جاذب نظر شخصیت کے حامل تھے۔ وہ شپنگ کمپنی میں بطور ریگی مین ملازم تھے اور اکثر ملک سے باہر رہتے تھے۔ والد مقیم بھائی کو پیار سے گڈو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ مقیم بھائی بچپن سے ہی والد صاحب کی طرح خوش اخلاق اور نرم مزاج تھے۔ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ 14 اگست کے دن پورے گھر اور محلے کو دلہن کی طرح سجایا کرتے تھے اور اس روز ان کی سرشاری دیکھنے کے قابل ہوا کرتی تھی۔

مقیم احمد وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے اسی لیے میٹرک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1995ء میں محکمہ پولیس سے وابستہ ہو گئے۔

شہید مقیم کے سب سے چھوٹے بھائی عظیم نے بتایا کہ والد صاحب کی وفات کے بعد مقیم بھائی نے چھوٹے ہونے کے باوجود بڑا بن کر ہم سب بہن بھائیوں کو سہارا دیا اور والد صاحب کی وفات کے بعد بننے والے خلا کو پُر کر دیا۔ مقیم بھائی نے کبھی کسی چیز کی ہمیں کمی نہیں ہونے دی۔ اگر گھر میں سے کسی بھی فرد نے کبھی بھی کوئی بھی فرمائش کی تو اس کی فرمائش کو



انہوں نے فوری طور پر پورا کیا۔ وہ مشکل کام تو بغیر بولے ہوئے پورا کر دیتے تھے۔ وہ اپنی سنجیدگی اور بردباری کی وجہ سے گھر اور خاندان کے لیے مثال بنا کرتے تھے۔

ایم پی اے کالونی میں وہ محلے کے تمام افراد کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے اس کے باوجود محلے کے اکثر افراد اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ نعیم شہید محکمہ پولیس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی محلے میں اپنے آپ کو پولیس اہلکار ظاہر نہیں کیا تھا۔ بھائی اپنا ہر کام کرنے سے پہلے تمام پروگرام بنا لیتے تھے اور وقت کی پابندی کیا کرتے تھے۔ محکمہ پولیس کے تمام افسران و اہلکاران ان کے حسن اخلاق کی تعریف کیا کرتے تھے۔ محکمہ پولیس کے افسران و اہلکاروں نے ہمیں اکیلا ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھائی کی شہادت کے بعد تمام دفتری معاملات ان کے ساتھ ڈیوٹی کرنے والے اہلکاروں نے سنبھال لیے۔ گھر کے تمام بچے ان کا انتظار بے چینی سے کرتے تھے اور ان کی موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی بچوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ نعیم بھائی کے گھر میں داخل ہوتے ہی بچے انہیں گھیر لیا کرتے اور وہ بچوں کو سیر و تفریح کے لیے باہر لے جایا کرتے تھے۔ نعیم بھائی اپنی سب سے بڑی بیٹی مہک کو بہت مہک باجی پکارا کرتے تھے۔ اب ہم بھائی کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی نہایت خوب صورت تھی انہیں ہمیشہ زندہ [illegible]۔

شہید ہمیشہ زندہ ہوتا ہے اور شہیدوں کی زندگی کو شعور نہیں ہوتا وہ [illegible] نعیم شہید کی

14 سالہ بیٹی مہک نے غمزدہ لہجے میں الفاظ میں بتایا کہ ہمارے پاپا بہت اچھے انسان تھے۔ وہ صبح ہم سب کو نماز کے لیے اٹھاتے تھے اور پھر نماز پڑھنے کے بعد ہم سب ایک ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔ میرے پاپا کی خواہش تھی کہ اقبال احمد کو انجینئر، زینب کو سب سے چھوٹی بیٹی عائشہ کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ وہ اکثر مجھ سے بھائی نذیر احمد کو حافظ قرآن بنانے کی بات کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خواہشات کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور سب بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے پاپا کے قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے اور ان کو عبرتناک سزا دی جائے۔ ہمارے پورے اہل خانہ کی دعا ہے کہ ہمارے پاپا کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ نعیم شہید کے 10 سالہ بیٹے نذیر احمد نے آنسوؤں سے تر آنکھوں اور معصومیت سے بولتے ہوئے اپنے الفاظ میں بتایا کہ پاپا مجھے [illegible] کیا کرتے تھے آپ قرآن [illegible] شہادت کے بعد سے [illegible] آپ سے [illegible] بھائی [illegible] ہمیشہ [illegible]



کو سیر کرانے کے بہانے باہر لے جاتے تھے اور وہاں انہیں جوس اور سنیکس بھی دلاتے تھے۔ ہماری نانی کی عمر 90 برس ہے۔ وہ جب بھی گھر آتے تھے تو سب سے پہلے نانی جان کے پاس جاتے اور ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شہید مقیم کے ساتھ پولیس کے محکمے میں ایک ساتھ ٹریننگ کرنے والے اہلکار نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے پر کہا کہ شہید نے آخری بار سب انسپکٹر نیاز شہید کا جنازہ ادا کیا تو یہ الفاظ کہے کہ یہ شہید کتنا خوش قسمت انسان ہے کہ اس کا جنازہ اس کے بیٹے حافظ سید عدنان احمد نے پڑھایا، کاش کہ میں بھی شہید ہو جاؤں اور میرا بیٹا بھی میرا جنازہ پڑھائے۔ اپنے دوست سے شہید نے کہا کہ تم اگر شہید ہو گئے تو میں تمہارا جنازہ ضرور ادا کروں گا اور میری شہادت پر جانے نہیں تم کہاں ہو گے۔



شہید کے دوست نے اپنی پرانی یادوں کے جھروکوں میں جھانک کر مقیم شہید کی شرارت کا ایک یادگار واقعہ سنایا کہ ہم سب کی جب جیکب لائن میں پوسٹنگ ہوئی تو ہم نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا اور ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ ہم نے آموں کی پیٹی سمندر کے پانی میں رکھ دی اور نہانا شروع کر دیا۔

مقیم شہید کو آم بہت پسند تھے۔ اس نے سمندر میں نہاتے ہوئے ایک ایک کر کے سارے آم کھا لیے اور ہم نے جب پیٹی پانی سے باہر نکالی تو وہ آموں سے خالی تھی۔ مقیم شہید دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سب دوست اس کی شرارت کو سمجھ گئے اور اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ہم اپنے شہید بھائی کے ساتھ گزارے ہوئے یادگار لمحات کو کسی صورت نہیں بھول سکتے۔ یہ بات کرتے ہوئے ان کے ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان دوستوں نے کہا کہ پکنک پر جانے والے ہم 5 دوستوں میں سے تین دیرینہ دوست وطن کی آبرو پر شہید ہو چکے ہیں اور اب ہماری بھی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرمائے اور ملک دشمن عناصر کی سازشوں اور ان کے ایجنٹوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی صلاحیت اور ہمت عطا فرمائے۔ مقیم شہید کے جسد خاکی کو گارڈن ہیڈ کوارٹر میں سلامی دی گئی، بعد ازاں علاقائی مسجد البدر میں نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد ایم پی آر کالونی کے قبرستان میں والد اور والدہ کے پہلو میں ان کی تدفین کی گئی۔

شہید مقیم کی بیوہ شدید غم کی کیفیت میں ہے اور یوں نوحہ کناں ہے..... میں کس کے ہاتھ پہ اپنے شوہر کا لہو تلاش کروں، ظالموں نے اس کے سر سے نہ صرف سہاگ کی چادر چھین لی ہے، بلکہ ان کے بچوں کے سر سے بھی باپ کی شفقت کا سایہ چھین لیا ہے۔ اس کی اشک برساتی آنکھیں سراپا سوال اور انصاف کی منتظر ہیں۔ شہید کے معصوم بچے مہک، علینہ، عائشہ، دانیال اور نذیر اپنے والد کے منتظر ہیں کہ وہ آئیں گے اور ان کی فرمائشیں پوری کریں گے، ان کے سر پر دست شفقت رکھیں گے اور ان کو اپنے سے لگا کر تھپکیاں دیں گے، لیکن.....

مقتول کے قتل کا مقدمہ 102/14 تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302/34 RW 7 ATA کو ہائی پروٹیکشن کے آرڈیننس ISPPO کے تحت پہلی بار اورنگی ٹاؤن تھانے میں درج کیا گیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ مقتول کے اہل خانہ کو انصاف کی دہلیز کب میسر آتی ہے اور ان کی یہ امید کب پوری ہوتی ہے کہ شہید کے قاتل قانون کے شکنجے میں جکڑے جائیں گے اور انہیں سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر ہی ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو پھر یہ سمجھ لیجیے کہ دہشت گرد کسی بھی وقت کچھ بھی کرنے کو کھلے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

☆...☆



دسویں سچ بیانی

وہ باتیں تیری

عائشہ وسیم

کراچی سے اپنے نانا کی یاد میں، ایک محبت نامہ

ہم سب کو آج نہیں تو کل اس دنیا سے جانا فانی ہے۔ ہم سب تو مسافر ہیں اس فانی دنیا کے۔ مگر افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پہ جو اپنی زندگی سے کچھ پل چرانا چاہتے ہیں مگر اس سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے دور چلے جاتے ہیں اور ان کی خواہشیں ان کہی، ان سنی رہ جاتی ہیں۔ میرے نانا بھی کچھ ایسے تھے میرے بہت اچھے، جنہوں نے کبھی اپنے لیے نہیں سوچا، اپنے لیے نہیں جیے۔ اپنی خوشی کی پروا کیے بغیر ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچا۔ چاہے جتنا بھی درد، تکلیف میں کیوں نہ ہوں، کبھی کسی سے نہیں بتانا۔ کیوں ایسے لوگ اور اچھے لوگ اتنی جلدی چلے جاتے ہیں؟ کبھی راضی رہتے کے لیے؟ کیا ان کو جینے کا حق نہیں؟ مگر سنا ہے جو اللہ کو پیارے ہوتے ہیں اللہ ان کو جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ میرے "نانا ابو" زندگی بھر محنت کرتے رہے۔ نوکری کرتے رہے تاکہ اپنے گھر کی خوشیاں لے سکیں۔ ان کے بعد قسمت نے ان کو موقع نہیں دیا۔ بچپن سے محنت کرتے رہے۔ اپنے پیارے بچیوں کو ان کے گھر کا کیا۔ ان کی خوشیاں اللہ پاک نے دکھائیں، مگر اپنی چھوٹی نواسی کی شادی کا ارمان دل میں لیے ہی چلے گئے۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ جلد از جلد ان کی زندگی میں ان کو اپنے گھر کا کر دیں۔ مگر الحمدللہ، اللہ نے تمام فرائض ان کے پورے کرائے، بس ایک ہی رہ گیا۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان کی یہ آخری خواہش جلد پوری کر جائیں گے تاکہ ان کی روح کو سکون ملے۔ کاش ہم ان کے لیے ان کی اس خواہش کے لیے کچھ کر پاتے۔ مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے، جب تک اللہ کی رضامندی نہ تھی۔ ایک خطرناک بیماری نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کو کھا لیا۔ میرے پیارے "نانا ابو" چلے گئے اچانک تو ہم سب کو بے گھر سا ہوئے تھے۔ 40 دن تک ہی گردن کا پتا چلنا، پھر آپریشن، پھر ٹھیک ہوتے ہوئے اچانک چلے جانا۔ آپریشن سے پہلے کافی تکلیف اٹھائی انہوں نے۔ گردے میں کینسر ہوا تھا جو کہ پھیپھڑوں میں بھی تھوڑا پھیل گیا تھا مگر گردے بدلوانے کے بعد نانا ابو نے کہا تھا۔ "میں اب جینا چاہتا ہوں۔" مگر قسمت کو یہ منظور کیوں نہیں تھا؟ آخر کیوں۔ وہ بار بار بول رہے تھے کہ "میرا وقت آ گیا" مگر ہم دواؤں کا اثر سمجھتے رہے۔ ہم تو ان کو ٹھیک ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہم کو کیا پتا تھا کہ ان کو اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور ان کی آنکھیں کہتی تھیں۔ ظاہر ہے جو ہمارے دل کے بہت قریب ہوتے ہیں ان کی موت کا تو ہم خیالوں میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ کاش اس بیماری کا کوئی علاج ہوتا، کتنے لوگ اس بیماری کی نذر ہو چکے ہیں۔ کاش ہم ان سے بات کر پاتے جو اب ہمارے درمیان نہیں، جا چکے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ بس یہی پوچھ پاتے۔ "ٹھیک ہیں نا آپ۔ ہمیشہ خوش رہیے گا۔ اپنی دعائیں وہاں سے بھی ہم کو دیتے رہیے گا۔ اللہ آپ کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اونچا مقام عطا کرے۔ آپ جہاں بھی ہیں آپ کی باتیں بہت یاد آتی ہیں۔ قدم قدم پر آپ کی رائے کی اور آپ کی ضرورت ہے ہم کو۔ اللہ ہم کو بھی آپ جیسا اچھا انسان بنائے اور جس مقام پر آپ ہم سب کو دیکھنا چاہتے تھے اللہ وہ مقام دلائے۔ (آمین)"

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی ستائیسویں تقریب کے یادگار لمحات

ایوارڈ یافتگان کے تاثرات

مندوبین دوشیزہ کی ملن ساز گھڑیاں......



وہ لمحات جو امر ہو گئے

تقریب بھر ملاقات کے خاص پل

بہت جلد دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر میں ملاحظہ کیجیے

آتشِ جنوں



سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی روداد۔ 28 ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں۔ ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے اور ایک دوسرے پر جان دینے والے... ارسلان چھوٹا بھائی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی متعدد لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں ان کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ غلام علی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غلام علی راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام علی کے پیچھے ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ کا ہاتھ ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ان کے والد بھی اسی غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد ان کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں ان کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عمران اور تیمور شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ حاکم خان کے محافظوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک فائل کا تقاضا کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن "محی الدین" عمران سے آ ملتا ہے۔

جان محمد کو کشمیری کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے قافلے کے لیے کشمیری نے جن لوگوں کو امریکا سے بلوایا ہے ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔ طارق شیخ کے بارے میں پتا چلتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں پچھلا ... تعلقات بعد میں کشمیری نے اپنے گینگ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پوسٹ پر ہوتی ہے۔ کشمیری کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔ ... آرزو کے ... کر کے جنگل جاتا ہے۔ ابھی تھوڑا آگے ... سے ... ہوئے تھے کہ عمران کے لوگ ... پولیس ... کے سامان کی ... آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ... سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ ... ہے کہ ... کشمیری کی قید سے فرار ہو گیا تھا جاتے جاتے کشمیری کا ... لے گیا ہے۔ ... کے ہاتھ لگ گیا اور اب ... میں ہے۔ اچانک سامنے سے ... آتی ہے ... جاتا ہے۔ ... کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ... شہاب مارا جاتا ہے۔ اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف ... کو ... ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل "را" کا ایک سفاک اور فعال ایجنٹ تھا۔ جو ... پاکستان میں ... تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں ... علاقے میں ان کے ... معروف ... کے ... کے لیے ... کا کام آتا ہے۔ عمران ... ملاقات کے لیے ... سے ملتا ہے۔

وقارالحسن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی مرسڈیز نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں۔

ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔ عمران اور ہاشم بڑے خطرناک طریقے سے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اگلے روز وقارالحسن سے ملنے ان کے آفس پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ فکرمند ہو جاتے ہیں۔ عمران وقارالحسن کو اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی شہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ادرسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقارالحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور "را" کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے گھر آ رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میرپورخاص میں کسی پیر کی حفاظت میں ہے اور یہ بات بلوچ کے آدمی رمضان نے بتائی ہے۔ رمضان عمران کو بتاتا ہے کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لڑکی اپنی مرضی سے نہیں رہ رہی ہے، کیوں کہ وہ جس کمرے میں تھی وہ باہر سے بند تھا۔ پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ پیر صاحب کا نام پیر احسان الحق شاہ ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میرپورخاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ میرپورخاص کے داخلی راستے پر ہی پولیس چوکی پر انہیں روک لیا جاتا ہے۔

عمران پولیس آفیسر سے کہتا ہے کہ وہ لوگ وڈیرے ممتاز سومرو کے مہمان ہیں یہ سن کر پولیس انسپکٹر گھبرا جاتا ہے اور ان کی گاڑی کو آگے جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ممتاز سومرو انتہائی خوش اخلاق اور پڑھا لکھا وڈیرہ ہے، جو درحقیقت ادرسلان کا دوست ہے۔ عمران ممتاز سومرو کو ساری کہانی سناتا ہے اور شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ پیر احسان الحق کی قید میں ہے۔ ممتاز ان لوگوں کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس پیر کی پہنچ صدر پاکستان تک بھی ہے تو بھی شائستہ کی رہائی میری ذمہ داری ہے۔ وہ لوگ ممتاز سومرو کے ہمراہ پیر احسان الحق کی حویلی پہنچتے ہیں۔ ممتاز پیر صاحب سے عمران کا تعارف کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی بہن کچھ لوگوں کی قید میں ہے اور یہ اس کی رہائی چاہتے ہیں اور جس شخص کی قید میں ان کی بہن ہے اس کا نام پیر احسان الحق ہے۔ اپنا نام ممتاز سومرو کے منہ سے سن کر پیر احسان سخت غصے اور طیش میں آ جاتا ہے اور انہیں وہاں سے جانے کے لیے کہتا ہے۔ تب تیمور پیر احسان پر جھپٹ پڑتا ہے اور خنجر اس کے گلے پر رکھ کر شائستہ کی بازیابی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ممتاز سومرو اس سے کہتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق الذوالفقار سے ہے لہٰذا اپنے آدمیوں کو ہدایت دو کہ شائستہ کو یہاں لے آئیں۔ تب پیر احسان مشکل کو فون کر کے شائستہ کو لانے کا کہتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد مشکل شائستہ کو کمرے میں لے آتا ہے۔ شائستہ عمران کو دیکھ کر اس سے لپٹ جاتی ہے۔ عمران اسے تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم نے بہت آنسو بہا لیے، اب آنسو بہانے کی باری دشمنوں کی ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ عمران تیمور کو وہاں سے نکلنے کا کہتا ہے اور پیر احسان کو بھی ساتھ لے جانے کا کہتا ہے اور وہ لوگ وہاں سے ممتاز کی شہر سے باہر والی حویلی کی جانب چل پڑتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ پیر احسان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو فون کر کے بتا دے کہ وہ حیدرآباد ایک وفاقی وزیر سے ملنے جا رہا ہے۔ ممتاز تیمور کو کہتا ہے کہ میں نے احسان سے پچھلے بہت سے حساب برابر کرنا ہیں۔ عمران تیمور سے کہتا ہے کہ اسے زندگی سے محروم کر دو۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

ہم لوگ سکتے کی حالت میں اسے دیکھ رہے تھے اور احسن سردی کھائے ہوئے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ کم بخت سرے سے مسلمان ہی نہیں تھا۔ میں نے تو پولیس کا ایک حربہ آزمانے کو اسے بے لباس کیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پیر احسان الحق شاہ جیسا آدمی پیر تو کیا سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ اس وقت احسن کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وہ بہت بے بسی اور بے چارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" تیمور نے دھاڑ کر اس سناٹے کو توڑا۔ "اور تم کب سے یہاں کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"یہ تو پچھلے بیس سال سے اس علاقے میں ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"میں پوچھتا ہوں تم ہو کون؟ اپنا اصل نام بتاؤ ورنہ میں تمہارے جسم کو اس خنجر سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دوں گا۔"

"مم.....مم.....میرا....."

"کیا بکری کی طرح ممیا رہا ہے؟" ممتاز نے کہا۔ "سیدھی طرح بتا کہ تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"مم.....میرا.....اصل نام.....رمیش.....ہے رمیش چندر!"

"اس کا مطلب ہے کہ تو بھارتی جاسوس ہے؟" ممتاز نے بپھر کر کہا۔ "تو برسوں سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔"

"میں جاسوس نہیں ہوں۔" وہ نحیف آواز میں بولا۔ "ہاں بھارتی ضرور ہوں۔"

"تو بھارتی ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں برسوں پہلے بھارت سے یہاں آیا تھا۔ وہاں میں بہت مفلس اور نادار تھا اور بعض اوقات مجھے اور میری بیوی کو فاقے بھی کرنا پڑتے تھے، میں اپنے ایک عزیز سے ملنے بارڈر پار کر آیا تھا، اس نے مجھے ورغلایا کہ اگر میں مسلمانوں کی طرح شرعی داڑھی بڑھاؤں اور عربی اور اردو پڑھنا سیکھ لوں تو میں چند ہی برس میں لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہو جاؤں گا۔"

"اچھی کہانی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تیرے اس عزیز نے اس مشورے پر خود عمل کیوں نہیں کیا؟"

"اس سے تو اب ایم آئی (ملٹری انٹیلی جنس) والے ہی نمٹیں گے۔" ممتاز نے کہا۔ "وہ خود اس سے اگلوالیں گے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"مجھے ان لوگوں کے حوالے مت کرو، میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً چالیس کروڑ روپیہ ہے، زمینیں اور باغات ان کے علاوہ ہیں، میرپور خاص اور حیدرآباد میں دو بہت شاندار حویلیاں ہیں اور کراچی میں ڈیفنس کے علاقے میں دو ہزار گز پہ بنا ہوا بنگلا ہے۔"

"تم مجھے اپنے بینک بیلنس اور جائیداد کی تفصیل بتا کر مرعوب کرنا چاہتے ہو؟" ممتاز نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ مری مری سی آواز میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ یہ سب لے لو اور مجھے جانے دو۔"

تیمور نے آگے بڑھ کر پھر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ "الو کے پٹھے! تو نے یہ دولت ہمارے



اسی ملک سے بغاوت ہے اور ہمیں ہی اس کی رشوت دینا چاہتا ہے۔ تجھے چھوڑنے کا مطلب ہے کہ تو ایک مرتبہ پھر بھولے بھالے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دے۔"

"نہیں، میں اب اس ملک میں نہیں رہوں گا۔" رمیش چندر نے کہا۔ "میں واپس بھارت چلا جاؤں گا۔"

"تجھے اگر ایم آئی والے چھوڑ دیں تو تو بھارت جا یا امریکہ۔" ممتاز نے کہا۔

"مجھے تو صرف یہ بتا کہ تو نے میرے باپ کی کتنی زمین ہڑپ کی تھی؟"

"وہ دو سو ایکڑ کے قریب زمین تھی۔" رمیش چندر نے بتایا۔ "دیکھیں اس وقت وہ بالکل غیر آباد تھی۔ اسے آباد میں نے کیا اس پہ دن رات محنت میں نے کی تب کہیں جا کر وہ زمین پیداوار کے قابل ہوئی۔"

"تیرا کیا خیال تھا کہ میرا باپ اس زمین کو یوں بنجر اور غیر آباد چھوڑ دیتا؟"

ممتاز نے کہا۔ "اور اگر اس نے اس زمین کو آباد نہیں کیا تھا تو کیا میں بھی اسے آباد نہ کرتا۔ تو نے تو اور بہت سے زمینداروں کی زمینیں ہڑپ کی ہیں۔ تجھے ان سب کا حساب دینا پڑے گا۔"

"میں کہہ تو رہا ہوں کہ....."

تیمور کے تھپڑ نے اسے خاموش کر دیا۔ "ایک ہی بات کی رٹ بار بار مت لگا۔ یہ بتا کہ تو نے شائستہ کو اپنی قید میں کیوں رکھا تھا؟"

"میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک لڑکی میرے پاکستانی دوست کی قید سے فرار ہو کر تمہارے علاقے کی طرف گئی ہے۔ وہ خود بھی اسے پکڑ سکتا ہے لیکن وہ فی الحال اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔ وہ لڑکی کے لواحقین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ لڑکی وہاں سے فرار ہو گئی ہے۔ تم اسے اپنا پاس رکھو، اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے، نہ اس کے ساتھ وہ سلوک ہونا چاہیے جو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" تیمور نے پوچھا۔

"میرے دوست کا خیال تھا کہ اس کا پاکستانی دوست اس لڑکی کے ذریعے اس کے لواحقین سے کوئی بہت اہم قسم کی فائلیں نکلوانا چاہتا ہے۔ اگر لڑکی کو نقصان پہنچا تو ممکن ہے اس کے لواحقین ان فائلوں کو حکومت پاکستان کے حوالے کر دیں۔ اسے زیادہ خطرہ پاکستانی فوج سے تھا۔"

"اور تمہارے اس بھارتی دوست کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام..... سریش بسواس ہے۔" رمیش چندر نے جواب دیا۔

"اور سریش بسواس کا پاکستانی دوست کون ہے جس نے شائستہ کو اغوا کیا تھا؟" تیمور نے پھر کر پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔" رمیش چندر نے کہا۔

"دیکھو تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔" ممتاز نے کہا۔

"تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے تو مجھے اس خنجر سے ذبح کر دو۔ یوں بھی ایم آئی والے مجھے سسکا سسکا کر ماریں گے، اس خنجر سے تو لمحوں میں کام تمام ہو جائے گا۔"

"تمہارا تعلق "را" سے ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

رمیش کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"دیکھو جھوٹ مت بولنا ورنہ ہم تمہیں ایم آئی کے حوالے کر دیں گے۔"

رمیش نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "ہاں، میرا تعلق "را" سے ہے۔ میں گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کر رہا ہوں۔"

"تم نے اتنی صاف اردو ہمیں سکھی ہے یا وہیں سے سیکھ کر آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"اردو لکھنا پڑھنا تو میں نے یہاں آنے سے پہلے سیکھی تھی لیکن یہاں رہ کر میں بالکل یہاں والوں کی طرح اردو بولنے لگا۔ مجھے تو قرآن کی بہت سی آیتیں بھی یاد ہیں۔"

"تیمور!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اسے کپڑے پہنا دو اور اس کے ہاتھ پاؤں سختی سے باندھ دو، ہاں اس کے کپڑوں کی اچھی طرح تلاشی لے لینا، اس کی گھڑی بھی کھول لو اور انگوٹھی بھی ہاتھ سے اتار لو۔"

تیمور نے اس کی گھڑی کھولنے کی کوشش کی تو اس نے ہلکی سی مزاحمت کی اور بولا۔ "یہ گھڑی میرے لیے بہت یادگار ہے اور یہ انگوٹھی میری مرحوم بیوی کی نشانی ہے۔"

"اب تو تم خود اپنے نام و نشان کی فکر کرو۔" میں نے کہا۔

جب تیمور نے اس کی انگلی سے انگوٹھی اتارنا چاہی تو اس نے اچھی خاصی مزاحمت کی لیکن تیمور کے دو تھپڑوں میں سیدھا ہو گیا، پھر تیمور نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے پرس سمیت ایک ایک چیز حتیٰ کہ کاغذ کا ایک ایک پرزہ تک نکال لیا۔ اس نے آخر میں اس کی واسکٹ کا استر اُدھیڑ ڈالا، اس میں سے بھی ایک لفافہ نکل کر گر پڑا۔

ممتاز نے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھایا اس میں ایک بھارتی پاسپورٹ تھا، وہ پاسپورٹ رمیش چندر کا تھا، پاسپورٹ میں اس کی داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر ایک ٹیلی فون نمبر ایک اور نمبر اور ایک کروڑ روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی۔

رمیش کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

تیمور نے اس مرتبہ خاصی بے رحمی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے، اس کے پیر اچھی طرح مضبوطی سے باندھے اور اسے میز پر دھکا دے دیا۔

"غلام قادر!" ممتاز نے آواز لگائی۔ فوراً ہی ایک ملازم اندر آ گیا۔ "حکم سائیں!"

"ہاں تو اس قیدی کے ساتھ اس کمرے میں رہو، یہ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو اس کے ساتھ بالکل لحاظ مت کرنا۔"

"حاضر سائیں!" غلام قادر نے کہا اور جم کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

ہم لوگ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو رمیش چیخ کر بولا۔ "دیکھو تم لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے ایم آئی والوں کے حوالے نہیں کرو گے۔"

ہم میں سے کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر آ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں انکل وقار کو ٹیلی فون کر کے یہاں بلا لیتا ہوں، ان سے کہوں گا کہ وہ اپنے ساتھ پولیس کا کوئی دیانت دار افسر لے کر آئیں، پھر ان ہی کے ذریعے ہم ایم آئی والوں سے رابطہ کر سکیں گے۔"

"بات تو معقول ہے۔" ممتاز نے کہا۔ "ورنہ میں یہاں کی پولیس پر تو اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہاں کا ایس ایس پی بھی انسان ہو گا...... میرا مطلب ہے کہ رمیش کا زر خرید ہے۔"

"انکل وقار کی وجہ سے ہمیں بہت سہولتیں ملیں گی، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم لوگ بیک گراؤنڈ میں رہیں گے، اس کیس کا کریڈٹ اگر انکل وقار اور ان کے کسی دوست اور دیانت دار پولیس افسر کو ملتا ہے تو مل جائے۔"

"تو پھر تم انہیں ابھی ٹیلی فون کر دو۔ انہیں یہاں پہنچتے ہوئے صبح ہو جائے گی۔"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور انکل وقار کا نمبر ڈائل کیا، دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی، میں نے سوچا، ممکن ہے انکل کا سیل فون سائلنٹ پر ہو، میرے پاس ان کا لینڈ لائن نمبر بھی تھا، میں نے اس نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجیں، پھر آنٹی کی غنودہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"ہیلو آنٹی۔ میں کامران بول رہا ہوں۔"

"کامران! اچھا..... کامران، ہاں بولو۔"

"مجھے ابھی اور اسی وقت انکل سے بات کرنا ہے۔"

"لیکن وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے سوئے ہیں۔"

"آپ انہیں اٹھا دیں پلیز!" میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "بات بہت زیادہ اہم ہے۔"

"اچھا تم ہولڈ آن کرو، میں انہیں اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور مجھے ان کی آواز سنائی دی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ تقریباً دو منٹ بعد انکل کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہاں کامران، ابھی کیا قیامت آ گئی؟" ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"ابھی ہی قیامت آئی ہے انکل!" میں نے کہا۔ "آپ نے کبھی پیر احسان الحق کا نام سنا ہے؟"

"ہاں، وہ خاصا مشہور آدمی ہے۔" انکل نے اکتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ پیر ہے نہ احسان الحق۔" میں نے کہا۔ "اس کا اصل نام رمیش چند ہے اور وہ "را" کا ایجنٹ ہے۔"

"تم ہوش میں تو ہو کامران؟" انکل نے جھنجلا کر کہا۔

"میں بالکل ہوش میں ہوں اور اس وقت وہ رمیش چند ہمارے قبضے میں ہے۔ آپ اگر اپنے چینل کے لیے کوئی Exclusive بریکنگ نیوز چاہتے ہیں تو ابھی اور اسی وقت اپنی ٹیم کو لے کر میرپور خاص آ جائیں۔"

"ابھی اور اسی وقت؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، ورنہ یہ خبر کسی دوسرے چینل کے ہاتھ لگ گئی تو آپ ہی کا نقصان ہوگا۔ ہاں آتے ہوئے اپنے ساتھ پولیس کا کوئی دیانت دار بڑا افسر اور پریس کی کچھ نفری بھی لیتے آیئے گا، اسی طرح آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے اس دوست کو بھی کریڈٹ مل جائے گا، بعد میں تو یہ کیس ایم آئی والے خود ہی ہینڈل کریں گے۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "لیکن تم تو کراچی میں تھے، میرپور خاص میں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنی بہن شائستہ کی بازیابی کے لیے یہاں آیا تھا۔ اب آپ باتوں میں وقت ضائع مت کریں انکل! آپ کی کیمرا ٹیم کو بھی تیاری میں کچھ دیر لگے گی۔"

"میری کیمرا ٹیم ہر وقت تیار رہتی ہے اور صرف پانچ منٹ کے نوٹس پر روانہ ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یار اس بھاگ دوڑ اور ہنگامی دوڑ میں مجھے تو اچھی خاصی بھوک لگ گئی ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔ "یوں بھی انکل کے یہاں پہنچنے میں ابھی وقت ہے، اس وقت تک ہم کچھ کھا پی لیں۔" پھر میں چونک کر بولا۔

"میں ایک نظر ذرا شائستہ کو دیکھ آؤں، تم کھانے کا بندوبست کرو۔"

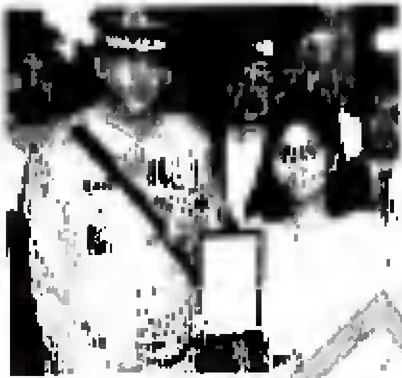
میں وہاں سے اٹھ کر اوپری منزل کی طرف گیا۔ شائستہ بے خبر سو رہی تھی، اس کے چہرے پر مجھے وہی معصومیت نظر آئی جو آج سے دس سال پہلے تھی۔ بس اس کا دل کش چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا، سرخ و سفید رنگ کملا گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھر آئی تھیں، اس عالم میں بھی وہ خوب صورت لگ رہی تھی، مجھے بے اختیار اس پہ پیار آ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اس وقت باتھ روم سے نادیہ نکلی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے میرے نزدیک آ گئی اور بولی۔ "تمہیں فرصت مل گئی یہاں آنے کی؟"

"فرصت کہاں جان!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تو ایک نیا طوفان کھڑا ہونے والا ہے۔" اسی وقت شائستہ کسمسائی تو نادیہ نے کہا۔ "شائستہ کو ڈسٹرب مت کرو، باہر چلو۔"

میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا، اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور تیمور بھی اندر آ گیا۔ "تمہیں

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں "دم"





پاکستان کی اہم خاتون شخصیات کی زندگی اور جدوجہد سے مربوط ایک خاص سلسلہ

جس میں آپ آج کی عورت کا اصل مقام ان کی اس معاشرے میں

ثابت قدمی سے منزل کو پانے کی کہانی اور ملکی تاریخ میں اپنا لوہا منوانے کے

عزم کو آپ کے لیے ان ہی کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

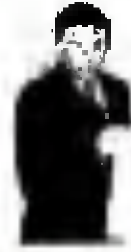
ان مایہ ناز خواتین کی کہانی جن سے ہماری آج کی عورت بہت کچھ سیکھ

رہی ہے۔

دوشیزہ ڈائجسٹ کی روایات سے مربوط آج کی عورت کی عظمت کا آئینہ

"وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں "دم






بھی سکون نہیں ہے؟" نادیہ نے منہ بنا کر تیمور سے کہا۔
"سکون اب تک تو تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب کافی عرصے تک ہم لوگ بے سکون رہیں گے۔"
"ایسی کیا بات ہے؟" نادیہ الجھ کر بولی۔ "کیا اس جعلی پیر نے کوئی اور چکر چلا دیا؟"
"بات اصل میں یہ ہے کہ بھیا، میرا مطلب ہے نادیہ!" وہ بھابی کہتے کہتے رک گیا۔ "وہ جعلی پیر سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔"
"کیا؟" نادیہ اچھل پڑی۔ "لیکن کیسے؟"
جواب میں تیمور نے اور میں نے اسے مختصراً رمیش چندر کے بارے میں بتا دیا۔
"یہ کیسے ممکن ہے کامران؟" نادیہ نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ "ہمارے ملک کی خفیہ ایجنسیاں کیا سو رہی ہیں؟"
"جن لوگوں پر بڑے بڑے بارسوخ وزراء اور اعلیٰ سول افسران کا ہاتھ ہوتا ہے، وہ اس طرح دندناتے پھرتے ہیں۔ ان برسوں میں اس منحوس رمیش چندر نے ہمارے ملک کی جڑوں کو کتنا کھوکھلا کیا ہوگا؟ کتنے اہم قومی راز ہمارے دشمن کو پہنچائے ہوں گے؟"
"اب اس کی مدد سے ایم آئی چن چن کر پاکستان میں اس کے ساتھیوں کو جہنم رسید کرے گی۔"
اس وقت دروازے پر پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔
میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ "کون ہے؟"
"سائیں..... کھانا تیار ہے!" باہر سے ممتاز کے ملازم نے آہستگی سے کہا۔
"اچھا تم چلو ہم آ رہے ہیں۔"
"کھانا؟" نادیہ نے حیرت سے کہا۔ "کون سے وقت کا کھانا کھاؤ گے تم لوگ؟"
"یار اس رمیش چندر کے چکر میں مجھے پھر بھوک لگ گئی ہے۔ یوں بھی ہم نے ڈنر ساڑھے آٹھ بجے ہی کر لیا تھا، اگر تمہارا کچھ کھانے کا موڈ ہے تو آ جاؤ۔"
"نہیں، میں اب برش کر چکی ہوں اور تم جانتے ہو کہ رات کو دانت برش کرنے کے بعد میں چائے اور کافی بھی نہیں پیتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے، پھر تم یہاں بیٹھ کر خون جگر پیو، ہم چلتے ہیں۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔"
ممتاز نے ہلکے پھلکے اسنیکس میں بھی اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ کھانا کھاتے اور کافی پیتے ہوئے ہم نے تقریباً ایک گھنٹا مزید گزار دیا۔
اب بھی صبح ہونے میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے۔ میں ٹہلتا ہوا باہر لان میں آ گیا جہاں ایک سنگل بنچ پر بلوچ بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔
"کیا بات ہے بلوچ؟" میں نے پوچھا۔
"کیا تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟"
"ممتاز صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں بہت کچھ کھلا چکا ہے۔" اس نے کہا۔
"پھر تم پریشان کیوں ہو؟"
"واجہ! اگر آپ برا نہ مانو تو ایک بات بولوں۔"
"ہاں ہاں بولو۔" میں نے کہا۔
"میں تمہاری کسی بات کا برا کیوں مانوں گا۔"
"واجہ..... وہ..... اصل میں..... بات....."
"کھل کے بولو بلوچ! تم نے مجھے اپنا بھائی کہا ہے نا؟ تو پھر بھائی سے کیسی جھجک؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں ایم آئی اور کرائم برانچ کا بہت سا افسر آ جائے گا، ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی مجھے یا میرے آدمیوں کو پہچان لے بلکہ ضرور پہچان لے گا۔ کرائم برانچ سے تو ہم لوگ کی آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے۔"

"تو اس میں اتنا جھجکنے کی کیا بات ہے بلوچ؟" میں نے کہا۔ "تم اگر جانا چاہتے ہو تو ابھی اپنے آدمیوں کے ساتھ نکل جاؤ۔"

"پر دل نہیں مانتا واجہ!" اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ "آپ کو اس حال میں کیسے چھوڑ جاؤں؟"

"ارے بھئی اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے، یہاں میرے اپنے گارڈز ہیں، ممتاز کے بہت سے گارڈز ہیں، پھر کراچی سے وقار صاحب آ رہے ہیں، ان کے ساتھ میں پولیس کا کوئی بڑا افسر ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہی ایم آئی کے کسی افسر کو لے آئیں، مجھے اب بالکل خطرہ نہیں ہے، جس کی طرف سے خطرہ ہو سکتا تھا وہ ہماری قید میں ہے، تم ابھی فوراً نکل جاؤ کیوں کہ وقار انکل پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہو واجہ؟" اس نے پوچھا۔

"کیسی غیروں والی باتیں کرتے ہو بلوچ؟"

میں نے کہا تو وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ گیا اور بولا۔ "ہم ٹیلی فون پر آپ سے رابطہ رکھوں گا۔"

"ہاں، ضرور رکھنا۔" پھر میں مسکرا کر بولا۔ "یار بلوچ! تم نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھی، دوسرے بلوچوں کے مقابلے میں تمہاری زبان بھی بہت صاف ہے۔"

"واجہ! ہم بہت چھوٹا تھا جب ہمارے باپ نے ہم کو ایک گھر میں نوکر کرا دیا تھا، وہ صاحب کسی کالج میں پروفیسر تھا، بیگم صاحب بھی کسی بڑے اسکول میں پڑھاتا تھا، ہم نے اردو ان ہی لوگوں کے ساتھ رہ کر سیکھی ہے، اردو بھی اور تھوڑی بہت کام چلانے والی انگریزی بھی۔"

"اچھا اب دیر مت کرو، جاؤ اب کراچی میں ملاقات ہوگی۔"

بلوچ ایک مرتبہ پھر سینے سے لگا اور اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔

میں بوجھل قدموں سے برآمدے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بلوچ کی ڈبل کیبن پک اپ ممتاز وسٹرو کی حویلی کے آہنی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

اسی وقت تیمور باہر آ گیا اور بولا۔ "کیا وقار انکل آ گئے؟ میں نے ابھی کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی تھی؟"

میں نے اسے بتایا کہ بلوچ واپس چلا گیا ہے۔ "یوں بھی اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" تیمور نے کہا۔

ہمیں وہاں دیکھ کر یا ہماری آوازیں سن کر ممتاز بھی برآمدے میں آ گیا اور اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ہاں اگر کراچی سے بلا توقف اور تیز رفتاری سے چلے ہوں گے تو اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔" تیمور نے کہا۔

"اندر چلو یار!" ممتاز نے کہا۔ "یہاں تو اچھی خاصی خنکی ہے۔"

ہم اندر داخل ہو ہی رہے تھے کہ میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ اسکرین پر انکل وقار کا نام تھا۔

"السلام علیکم انکل!" میں نے کہا۔ "کیا آپ ابھی تک ......"

"میں میرپور خاص پہنچ چکا ہوں لیکن تم اس وقت کہاں ہو، وڈیرے ممتاز کی دو حویلیاں ہیں، تم کس حویلی میں ہو؟"

"ممتاز نے اپنی جیپ میں دو آدمی پولیس چوکی پر بھیجے ہیں۔" میں نے کہا۔

اسی وقت مجھے کسی کی آواز آئی۔ "سائیں! آپ کو سائیں ممتاز کی حویلی جانا ہے؟ آئیں ہمارے پیچھے آ جائیں۔"

"کیا ہوا؟" ممتاز نے پوچھا۔

"انکل وقار یہاں پہنچ گئے ہیں، وہ مشکل سے دس منٹ میں یہاں ہوں گے۔" پھر واقعی دس منٹ سے بھی کم عرصے

میں مجھے حویلی کے گیٹ پر کئی گاڑیاں آنے کی آواز سنائی دی۔ ممتاز کی ہدایت پر اس کے گارڈز نے فوراً ہی مین گیٹ کھول دیا اور آگے پیچھے چار گاڑیاں اور ٹی وی چینل کی ایک بڑی وین اندر داخل ہوگی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انکل وقار کی گاڑی کے پیچھے آرمی کی ایک ہارڈ ٹاپ جیپ بھی تھی اور پولیس کی ایک کرولا بھی تھی۔

انکل وقار کی گاڑی کا دروازہ ممتاز کے ایک ملازم نے کھولا۔ دوسری گاڑیوں کے دروازے بھی مختلف ملازمین نے کھولے۔ انکل وقار سیدھے میری طرف آئے اور بولے۔ "دیکھو کامران! میں تمہاری توقع سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا ہوں۔" میں نے ممتاز کا تعارف کرایا۔ انکل وقار اس سے بھی بہت تپاک سے ملے۔ اس دوران میں دوسری گاڑیوں سے بھی مختلف افراد اتر کر برآمدے میں آ گئے تھے۔ ان سب نے باری باری ہم سے ہاتھ ملایا۔ انکل وقار ان سب کا تعارف کرا رہے تھے، یہ ایس ایس پی علی شہزاد ہے، کرائم برانچ کا انتہائی سفاک اور دیانت دار افسر! جرائم پیشہ لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں، یہ میجر احتشام ہیں، ایم آئی کے ایک عہدیدار ہیں اور یہ میرے چینل کا نمائندہ اور بے باک رپورٹر مسعود ہے، یہ کیمرہ مین اسلم ہے اور دوسرے افراد بھی اس کی ٹیم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"ملزم کہاں ہے؟" ایس ایس پی نے پوچھا۔ وہ خاصا دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا، اس کا رنگ گندمی تھا، سیاہ بال تھے اور اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اس کی ذہانت سے بھرپور آنکھیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں مقابل کا ایکسرے کر رہا ہو۔

میجر احتشام اس وقت سوٹ میں تھا لیکن اپنی چال ڈھال اور گفتگو سے وہ ایم آئی کا کوئی اہم عہدے دار لگ رہا تھا۔ "ہم لوگ اکیلے نہیں ہیں۔" ایس ایس پی علی نے کہا۔ "میرے ساتھ پولیس کی ایک بڑی وین ہے اور میجر صاحب کے ساتھ بھی کمانڈوز کا ایک پلاٹون ہے، وہ لوگ حویلی سے باہر ہیں۔"

"سر! آپ لوگ کراچی سے یہاں تک مسلسل سفر کرنے کے بعد تھک گئے ہوں گے، پہلے آپ لوگ ذرا تازہ دم ہو جائیں اور ہمارے ساتھ ایک کپ کافی پی لیں۔"

"ان تکلفات میں نہ پڑیں ممتاز صاحب!" احتشام نے کہا۔ "اگر آپ کا بیان درست ہے تو ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، میں پہلے اس ملزم سے ملنا چاہوں گا۔"

"میجر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" ایس ایس پی علی نے کہا۔

"تو پھر آیئے، میرے ساتھ!" ممتاز نے کہا اور ان لوگوں کو لے کر اس کمرے کے دروازے پر پہنچا جہاں رمیش قید تھا، اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اس کے گارڈ کی آواز آئی۔ "کیرا؟ (کون)۔"

"دروازہ کھول بابا!" ممتاز نے کہا۔

اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

بیڈ پر رمیش چند گھڑی بنا پڑا تھا، ہماری آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم لوگوں نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے، تم نے تو کہا تھا کہ میری ساری دولت اور جائیداد لے کر تم مجھے چھوڑ دو گے؟" وہ جنونی انداز میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ارے تو ہم نے ایسی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔" ممتاز نے کہا۔ "اور اگر کی بھی تھی تو ہم نے وعدہ خلافی کی ہے۔ کم سے کم تجھ جیسے شیطان کو وعدہ خلافی کا لفظ زیب نہیں دیتا۔"

"یہ تو بیر احسان الحق ہے؟" علی نے کہا۔

"ہاں، یہ اسی بہروپ میں ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"یہ ہے اس کا پاسپورٹ!" میں نے اس کا پاسپورٹ نکال کر وقار انکل کو دیا۔ انہوں نے وہ دیکھے بغیر احتشام کے حوالے کر دیا۔

"رمیش چند!" احتشام نے حیرت سے کہا۔ "ہم اس مردود کو پنجاب اور بھارت میں ڈھونڈ رہے تھے اور یہ یہاں پیر بنا بیٹھا تھا۔" پھر وہ ممتاز سے مخاطب ہوا۔ "ممتاز صاحب! اس کی داڑھی اور مونچھیں صاف کرنے کا بندوبست کریں۔" ممتاز کمرے سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک شخص اور تھا۔ اس نے چھوٹی سی ایک صندوقچی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے صندوقچی کھول کر اس میں سے شیونگ کریم، برش اور استرا نکالا تو علی نے کہا۔ "ایک منٹ سر! پہلے موجودہ حالت میں اس کی ایک فلم بنالیں اور کچھ اسٹل فوٹو گراف لے لیں۔" وقار انکل نے فوراً اپنے سیل فون پر کیمرامین اور دوسرے عملے کو طلب کرلیا۔

فلیش کی تیز روشنی میں رمیش چند کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یوں بھی ان آنکھوں میں اب زندگی کی رمق نہیں تھی اور اس کا سرخ وسفید باوقار چہرہ اس وقت مجھے کسی مردے کا چہرہ لگ رہا تھا۔

کیمرامین نے مختلف زاویوں سے اس کی فلم بنائی۔ فوٹو گرافر نے اس کے کئی فوٹو اتارے، پھر انکل وقار مائیک لے کر اس کی طرف بڑھے اور بولے۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"رمیش چند!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

"میں تمہارا وہ نام پوچھ رہا ہوں جس گیٹ اپ میں تم ہو اور جس نام سے یہاں مشہور ہو؟"

"آپ جانتے تو ہیں پھر مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟" رمیش چند نے کہا۔

انکل وقار کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید اس کے اس جواب پر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیتا۔

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" انکل وقار نے درشت لہجے میں کہا۔

"میرا نام پیر احسان الحق ہے۔" وہ مشینی انداز میں بولا۔ "پیر احسان الحق تھا۔ میں برسوں سے اسی نام سے مشہور ہوں۔"

میجر احتشام نے نائی کو اشارہ کیا۔ نائی نے آگے بڑھ کر اس کی داڑھی پہلے مشین سے کاٹی، پھر کریم لگا کر اسے استرے سے بالکل چکنا شیو کردیا۔ اس پورے عمل کی بھی ویڈیو بنتی رہی۔

اس کا چہرہ صاف ہوتے ہی احتشام بے اختیار بولا۔ "تم رمیش چند نہیں ہو۔"

"میں رمیش چند ہی ہوں۔" رمیش چند جھلا کر بولا۔

"تم نرائن داس ہو، یہ بتاؤ تمہارے اور کتنے نام ہیں؟"

"میں رمیش چند ہی ہوں۔"

وہ موت کو سامنے دیکھ کر اب شاید اپنی زندگی سے بے پروا ہو گیا تھا۔

"ایک منٹ!" تیمور نے کہا اور اپنا خنجر نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ "جو کچھ صاحب پوچھ رہے ہیں، سچ سچ بتا ورنہ میں تیری ریڑھ کی ہڈی توڑ کر تجھے زندگی بھر کے لیے معذور کردوں گا، پھر تیری بقیہ زندگی اپاہج گاڑی پر گزرے گی۔"

تیمور نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور پشت سے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اپنا گھٹنا اس کی کمر پر رکھ دیا۔ "میں ایک جھٹکے میں تجھے ناکارہ کردوں گا۔" تیمور کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ میں بھی کانپ کر رہ گیا۔

"صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میرا نام نرائن داس بھی ہے۔"

"تیرا پیدائشی نام کیا ہے؟" تیمور نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میرا اصل نام تو رمیش چند ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"سر! اسے ابھی لے چلیں۔" علی نے کہا۔

"ہمیں پہلے اس کی حویلی کی تلاشی بھی لینا ہے۔ اس سے پوچھ گچھ تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی۔"

"ایک مسئلہ اور ہے سر!" ممتاز نے کہا اور میجر کو کمرے سے باہر لے گیا۔ "اس کی گرفتاری کی خبر سن کر اس کے ہزاروں مرید جمع ہوجائیں گے اور نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔"

اس وقت علی بھی باہر آگیا اور بولا۔ "ہم فوری طور پر اسے یہیں رکھیں گے۔ اس کے ملازمین اور گارڈز سے یہ بھی کہیں

دوسرے ہی لمحے AK-47 کی آواز سنائی دی، اس کی آواز تمام رائفلوں سے منفرد تھی، پھر کچھ کرب ناک انسانی آوازیں گونجیں اور خاموشی چھا گئی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر تیمور کی تھی، میرے دل میں برے برے خیال آرہے تھے کہ کہیں وہ کسی گولی سے زخمی تو نہیں ہو گیا یا پھر کسی گولی نے اس کا کام تمام تو نہیں کر دیا۔

میں نے ان خیالات کا اظہار ہاشم سے کیا تو اس نے کہا۔ "آپ اتنے زیادہ پریشان کیوں ہیں؟ میں ابھی سیل فون پر تیمور سے Contact کر لیتا ہوں۔"

"نہیں ہاشم!" میں نے کہا۔ "ممکن ہے سیل فون کی بیل سے وہ دشمنوں کی نظروں میں آ جائے۔"

"کامران! تیمور اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ اپنے سیل فون کو سائلنٹ کیے بغیر اس مشن پر نکل گیا ہوگا۔"

"پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"بھیا! ہاشم بھائی ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں، اگر ان کا سیل فون سائلنٹ پر نہ بھی ہوا تو فائرنگ کے اس شور میں ان پر کوئی دھیان دے گا۔"

اچانک اندر سے میگا فون پر میجر احتشام کی بارعب آواز آئی۔ "یہ حویلی چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہے، جو بھی فرار ہونے کی کوشش کرے گا مارا جائے گا۔ حویلی کے اندر بھی جن لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں، وہ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں ورنہ ان کے ساتھ بھی ان کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

تقریباً بیس منٹ بعد حویلی کے بلند و بالا پھاٹک سے میں پولیس کی ایک بکتر بند گاڑی اور این ایل سی کے دو فوجی کنٹینرز داخل ہوئے، اب اندر سے فائرنگ کی آواز بالکل نہیں آ رہی تھی، ہم لوگ بے تابی سے آئندہ پیش آنے والی صورت حال کا انتظار کرتے رہے۔

مجھے اس وقت کسی بھی بات کا ہوش نہیں تھا البتہ ہاشم مسلسل اپنی رسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔

اس نے کہا "پولیس کی گاڑی اور کنٹینرز کو اندر گئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن..... اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ اندر سے پھر ایک فائر ہوا تھا، یہ فائر بیون ایم ایم کا تھا، پھر اندر سے انسانی چیخ پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں، مزید دس منٹ بعد وہاں پھر سکوت چھا گیا۔

پھر وہاں کسی بھاری گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور حویلی سے ایک کنٹینر برآمد ہوا، اس کے پیچھے پیچھے دوسرا کنٹینر تھا، پھر پولیس کی تین موبائلز تھیں سب سے آخر میں میجر احتشام کی ہارڈ ٹاپ جیپ برآمد ہوئی، اس کے آگے ایس ایس پی ایمل کی کرولا تھی۔

اس نے باہر نکل کر اپنے لوگوں کو کچھ ہدایات دیں، میجر بھی اپنی گاڑی سے باہر آ چکا تھا اور وہ بھی اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا حویلی کے آہنی پھاٹک پر پولیس کے مستعد جوان کھڑے ہو گئے۔

ایس ایس پی ایمل نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کو کال کرنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے ٹی وی چینل کی وین اور انکل وقار کی گاڑی حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھی، فوراً ہی اندر کا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ ٹی وی چینل کی ٹیم نے اپنا کام شروع کر دیا تھا، میں جانتا تھا کہ اس وقت انکل وقار بہت مصروف ہوں گے۔ ان سے بات کرنا اس وقت ممکن نہیں تھا، یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حویلی سے دور رہ کر بھی اپنے چینل پر حویلی میں ہونے والی کارروائی کی Live کوریج دکھا رہے تھے۔

مجھے تیمور کی فکر تھی، وہ مجھے ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور تیمور کا نمبر ڈائل کر دیا، دوسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی اور بولا۔ "جی بھیا؟"

"تم کہاں ہو تیمور، وہاں کیا ہوا ہے؟"

"آپ پریشان نہ ہوں، میں خیریت سے ہوں اور ابھی دس منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔"

"جلدی پہنچو، ہم بھی اس وقت حویلی کے باہر ہی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ہاشم سے کہا۔

"واپس گھر چلو۔"

ہاشم نے ہمیں دس منٹ سے بھی کم عرصے میں ممتاز کی حویلی پہنچا دیا۔

ہمارے پیچھے پیچھے ایس ایس پی علی، میجر احتشام، پولیس کے مزید کئی بڑے افسر اور سادہ لباس میں ملبوس اور انتہائی باوقار افراد وہاں موجود تھے۔ احتشام بھی ان لوگوں کو سر کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ایم آئی کے کوئی بڑے عہدے دار تھے۔

ایس ایس پی علی نے ممتاز کا تفصیلی بیان لیا۔ پی ٹی وی کیمرے اس وقت بھی آن تھے، حیرت انگیز طور پر کسی نے میرا یا تیمور کا بیان نہیں لیا۔ اس وقت تک دوسرے چینلز کی ٹیمیں بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ان میں سے ہر ٹیم ممتاز سے ملنا اور رمیش کی فوٹیج بنانا چاہتی تھی لیکن ایس ایس پی علی اور احتشام نے ان لوگوں کو ٹال دیا۔

شفق پہ صبح کی لالی ابھر چکی تھی اور میر پور خاص جیسا چھوٹا شہر اب پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔

ایس ایس پی شرما اور میجر احتشام دونوں ہی تھکن سے چور تھے۔ ان کے افسران باہر جا چکے تھے وہ اپنے ساتھ رمیش چند کو بھی لے گئے تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس معرکے میں منشی سمیت رمیش چند کے سات گارڈز مارے گئے تھے اور تقریباً بارہ شدید زخمی تھے۔ علی نے زخمیوں اور ڈیڈ باڈیز کو حیدرآباد بھجوا دیا تھا۔ رمیش چند کی حویلی سے بہت سی اغوا شدہ لڑکیوں کے علاوہ کافی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ اور منشیات بھی برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ خفیہ نوعیت کے کاغذات بھی تھے جن کا علم ایم آئی اور علی کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔

مزید دو گھنٹے تک کارروائی چلتی رہی۔ پھر انکل وقار نے بے اختیار مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کامران! تم نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ اس کا کریڈٹ تم نے علی اور احتشام کو دے کر ان کا کیریئر بھی بنا دیا۔ اب علی دو چار دن میں نہ صرف ڈی آئی جی بن جائے گا بلکہ اسے پولیس کی طرف سے اعلیٰ کارکردگی کی اسناد اور تمغے بھی ملیں گے۔ نقد انعام اس کے علاوہ ہوگا۔ احتشام بھی ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل ہو جائے گا۔"

"انکل! وہ سب تو ٹھیک ہے اس سے آپ کو بھی کچھ فائدہ ہوا ہے یا نہیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"مجھے بھی فائدہ ہوگا۔" انکل مسکرا کر بولے۔

"بس میری ایک ہی درخواست ہے۔" میں نے کہا۔

"رمیش چند سے بھارت اور پاکستان کے "را" کے ایجنٹوں کے جو نام پتے اور ٹیلی فون نمبرز معلوم ہوں، ان کی ایک کاپی آپ مجھے بھی دے دیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو کامران!" انہوں نے کہا۔

"یہ ساری معلومات علی کے پاس ہوں گی۔ میں اس کی ایک سیٹ تمہیں بھی دلوا دوں گا۔ یہ انتہائی کانفیڈنشل قسم کی معلومات ہیں لیکن علی تمہیں دینے میں انکار نہیں کرے گا۔"

ممتاز اس وقت علی کے ساتھ رسمی خانہ پری کے لیے پولیس اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی صبح کے دس بجے تک ہوئی، وہ بھی بہت تھکا تھکا نظر آ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر فتح کی چمک تھی۔

"اب تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟" انکل نے پوچھا۔

"فی الحال تو ہم لوگ ناشتا کریں گے۔" میں نے کہا۔

"ورنہ بھوک کی شدت سے میرا نہیں تو تیمور کا انتقال ضرور ہو جائے گا۔"

"آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتا کر لیں۔" ممتاز نے انکل سے کہا۔

"بھئی اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ مجھے فوری طور پر اپنے اخبار اور چینل کو تفصیلی رپورٹ دینا ہے۔"

ناشتے میں صرف دس منٹ لگیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب تک میرے ملازمین نے ناشتا بنا کر رکھ دیا ہوگا۔

ناشتے کے بعد انکل وقار اپنی ٹیم کے ساتھ کراچی روانہ ہو گئے مجھے شدید تھکن اور نیند کا احساس ہو رہا تھا لیکن مجھے

شائستہ کی فکر بھی تھی۔

میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ کل کے مقابلے میں خاصی تر و تازہ اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب وہ وحشت بھی نہیں تھی۔ وہ بڑھ کر میرے سینے سے لگ گئی اور بولی۔ ”بھیا! آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ نے ٹی وی دیکھا۔“

”مجھے تو اب تک نادیہ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے، تجھے نہیں دیکھا ہے تو ٹی وی کہاں سے دیکھتا۔“

”تو پھر دیکھیے۔“ اس نے کہا اور اس نے بیڈ روم میں رکھے ہوئے ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”رمیش چندر گزشتہ تین دہائیوں سے ہمارے ملک میں موجود تھا اور تخریبی سرگرمیوں میں معروف تھا، پولیس اس کی نشاندہی پر مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مار کے اس کے آدمیوں کو گرفتار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان نے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمشنر کو بلا کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرا دیا ہے۔ دیکھیے اس بہروپیے نے گزشتہ تیس برس سے کیا رنگ رچا رکھا تھا۔“

پھر ٹی وی پر رمیش چندر کی وہ تصویر دکھائی گئی جس میں وہ بہت شاندار انداز میں اور بہترین لباس میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ایک عقیدت مند اس کے قدم چوم رہا تھا۔

یہ تصویر شاید ممتاز یا اس کے کسی آدمی کے موبائل فون سے لی گئی تھی۔ ایک تو پیج وہ تھی جب وہ رسیوں میں جکڑا پڑا تھا، اس وقت بھی وہ پیر احسان الحق کے روپ میں تھا، دوسری تو پیج اس کے مکمل شیو ہونے کے بعد کی تھی۔

مجھے پیر پور خاص میں بیٹھ کر اندازہ نہیں تھا کہ پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ رمیش چندر کی نشاندہی پر کئی کرپٹ سیاست دانوں اور بیورو کریٹس کا نام ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) میں شامل ہو چکا تھا اور پولیس ان سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔

بھارت اسے اپنا شہری ماننے سے انکار کر رہا تھا لیکن اس کا پاسپورٹ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ وہ بھارتی شہری ہے۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے ہی سو گیا۔

میری آنکھ دوبارہ کھلی تو کمرے میں بلب جل رہا تھا اور وال کلاک میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں کئی گھنٹے تک گھوڑے بیچ کر سوتا رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے بالوں میں کسی کی نرم و نازک انگلیوں کا احساس ہوا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ شائستہ میرے سرہانے بیٹھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بولی۔ ”بھیا! اب اٹھ جائیے۔ آپ گزشتہ کئی گھنٹے سے میرے بیڈ پر سو رہے ہیں۔“

میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ بھرپور نیند کی وجہ سے اب مجھے تر و تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ جہاں تک میرا خیال تھا میں جوتوں سمیت ہی سو گیا تھا۔ اس وقت میرے پیر میں جوتے نہیں تھے، اس کا مطلب یہ تھا کہ شائستہ یا نادیہ نے میرے جوتے بھی اتار دیے تھے اور مجھے کمبل بھی اوڑھا دیا تھا۔

میں جینز اور جیکٹ میں تھا، اور کوئی چیز میری بغل میں بری طرح چبھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اپنی بغل پر ہاتھ مارا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ریوالور تھا۔

میں اسی حالت میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ باتھ روم تو شائستہ کے کمرے میں ہی تھا لیکن میری شیونگ کٹ، ٹوتھ برش اور باتھنگ گاؤن میرے ہی باتھ روم میں تھا۔

باتھ روم میں میرا ایک صاف ستھرا استری شدہ جوڑا لٹکا ہوا تھا۔ میں دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔

تیار ہو کر باہر نکلا تو کوری ڈور میں مجھے تیمور دکھائی دیا اور ہنس کر بولا۔ ”واہ بھیا! آپ تو ایسے سوئے کہ لگتا تھا کہ اب کئی دن بعد جاگیں گے۔“

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم بھی تو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی اٹھے ہو۔“

"ایک تو یہ گھر کے بھیدی ہی لنکا ڈھاتے ہیں، میں تو بھیا کے سامنے اپنے نمبر بڑھا رہا تھا، ویسے ممتاز بھی ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور اس وقت واش روم میں ہے۔"

میں نے نادیہ سے پوچھا۔ "کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

"میرا دم تو نکل چکا ہے بھیا!" تیمور نے کہا۔ "اب تو میں ایک چلتی پھرتی لاش ہوں۔"

"چلتی پھرتی لاش صاحب!" نادیہ نے ہنس کر کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں یہاں خود مہمان ہوں، مجھے نہیں پتا کہ ان کا کچن کہاں ہے اور اس میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "ویسے میں نے ممتاز صاحب کے ملازمین سے کھانا تیار کرا لیا ہے، ممتاز صاحب تیار ہو کر باہر آئیں گے تو کھانا بھی مل جائے گا۔"

"بھئی ممتاز صاحب تو کب کے تیار ہو کر باہر آ چکے ہیں بھائی!" ممتاز نے کوری ڈور کے نزدیک سیڑھیوں سے ہانک لگائی۔

"تو پھر ڈائننگ روم میں چلیے۔" شائستہ نے کہا۔ "میں ابھی کھانا لگانے کو کہتی ہوں۔"

"آپ زحمت نہ کریں شائستہ بہن! میرے ملازمین نے مجھے دیکھتے ہی کھانا لگانا شروع کر دیا ہوگا، انہیں معلوم ہے کہ اس سلسلے میں تاخیر میں برداشت نہیں کرتا۔"

پھر بہت خوش گوار انداز میں کھانا کھایا گیا۔

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے میں نے کہا۔ "ممتاز! میرا خیال ہے کہ اب ہم بھی کراچی کی طرف نکل جائیں۔"

"اب تو رات ہو گئی ہے بھیا!" ممتاز نے کہا۔

"آپ صبح سویرے نکلیں گے تو دوپہر تک آرام سے کراچی پہنچ جائیں گے۔"

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی تو وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی، وہ بلوچ کی کال تھی۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو بلوچ!"

بلوچ نے کہا۔ "آپ خیریت سے تو ہو۔"

"ہاں، ہم لوگ بالکل خیریت سے ہیں اور کل کراچی پہنچ رہے ہیں۔"

"یہ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے واجا!" بلوچ نے کہا۔ "رات میں سفر کرنا ویسے بھی اچھا نہیں ہے، میں بھی میرپور خاص پہنچ رہا ہوں۔ صبح آپ کے ساتھ ہی کراچی کے لیے نکلوں گا۔"

"ارے بھئی، تم زحمت کیوں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ نہیں سمجھتا ہے واجا!" بلوچ نے کہا۔ "اس حرام زادے مشہدی کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے، اس نے شائستہ کو اس ہندو کے حوالے کیا تھا اور یہ مشہور کر دیا کہ شائستہ یہاں سے فرار ہو گئی، پھر آپ کے لیے ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔"

"وہ بھی بتا ہی دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ تو میں آپ کو وہیں آ کر سناؤں گا۔" بلوچ نے کہا۔

"میں ابھی راستے میں ہوں اور آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

بلوچ کی کال کے دوران ہی مجھے ہلکی سی بیپ سنائی دی تھی، اس کا مطلب تھا کہ اس وقت کوئی اور بھی مجھے کال کر رہا تھا۔

"اچھا بلوچ! تم یہاں پہنچو، پھر تفصیل بات ہوگی، میری کال آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت دوبارہ سیل فون کی بیل بجی، اسکرین پر ہاشم کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ہاشم!"

"کامران! تم خیریت سے تو ہو؟" اس نے بھی وہی سوال کیا جو بلوچ نے کیا تھا۔ "اب تک تو تمہیں کراچی پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

گے کہ پیر صاحب حیدرآباد میں ہیں لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس مسلمان کے روپ میں ایک بھارتی جاسوس آ کر ٹھہرا تھا، ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ وہ اگر حویلی میں نہ بھی ہوا تو ہمیں اس کا سامان یا اس کی کوئی چیز ضرور مل جائے گی جس سے اسے گرفتار کرنے میں مدد ملے۔ پیر صاحب نے تلاشی کی اجازت دے دی ہے اور وہ خود بھی ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"وہ شخص اپنی جان دے دے گا لیکن آپ لوگوں کو میرے کمرے تک نہیں جانے دے گا۔" رمیش چند نے کہا۔ "وہ پکا مسلمان ہے اور مجھے بہت پہنچا ہوا پیر سمجھتا ہے۔"

"اس سے بھی نمٹ لیں گے۔" ایس ایس پی نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ "آپ لوگ قیدی کا دھیان رکھیں، ہم اس کی حویلی کی تلاشی لے کر آتے ہیں۔"

میجر احتشام نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہاں اس کے مریدوں میں خاصے بڑے بڑے بارسوخ زمین دار بھی ہیں، کوئی ایسا معتبر شخص نہیں ہے جو بغیر کسی خون خرابے کے ہمیں حویلی کے اندر لے جائے۔"

"ایسا کوئی شخص کم سے کم میر پور خاص میں نہیں ہے۔" ممتاز نے جواب دیا۔ "وہ حکومت سندھ کا کوئی اعلیٰ افسر ہو تو ہو یا پھر کوئی وفاقی یا صوبائی وزیر ہو ورنہ یہاں کے زمین داروں کو یہ منہ ہی نہیں لگاتا تھا۔ کچھ بڑے جاگیردار ہیں لیکن وہ اسے پیر نہیں مانتے ہیں۔"

"اوکے۔" میجر نے کہا۔ "دیکھا جائے گا۔" پھر وہ تیمور سے مخاطب ہوا۔ "جوان تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟"

"میرا تعلق تو کسی بھی ایجنسی سے نہیں ہے سر!" تیمور نے کہا۔ "میں کامران صاحب کا کزن ہوں اور اپنی بہن شائستہ کی بازیابی کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسے ہم لوگ بہ خیریت اس کے چنگل سے چھڑا لائے ہیں۔"

"سر، میری ایک ریکوئسٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سارے قصے میں اگر شائستہ کا نام نہ آئے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔"

"آپ فکر مت کریں کامران صاحب!" میجر نے کہا۔ "اس مردود پر تو اتنے سنگین جرائم کے کیسز ہیں کہ آپ کی بہن کا کیس تو ان کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔" پھر وہ تیمور سے بولا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو اس آپریشن میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ تم ہمارے لیے خاصے سودمند ثابت ہوگے۔ ہتھیار چلانا جانتے ہو؟"

"میں بچپن سے شکار کھیلتا آ رہا ہوں سر!" تیمور نے فوری طور پر ایک داستان گھڑی۔ "مجھے مختلف قسم کے ہتھیار چلانے آتے ہیں۔ میرا نشانہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"چلو، پھر دیر مت کرو۔" پھر وہ علی سے بولا۔ "رمیش چند کی حویلی پہنچ کر آپ یہاں کی مقامی پولیس کو بھی انفارم کر دیجیے گا۔"

"میں انہیں انفارم کر دوں گا لیکن اس وقت ان کے پاس نفری برائے نام ہوگی۔ ممکن ہے پولیس موبائل بھی ایک ہی ہو یا وہ بھی نہ ہو۔"

وہ سب باہر نکل گئے۔ میجر کے کوٹ کے دونوں جانب کے ابھار بتا رہے تھے کہ اس نے کوٹ کے نیچے ڈبل ہولسٹر لگا رکھا ہے۔

وقار انکل بھی اپنی ٹیم کے ساتھ چلے گئے۔

"میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بھی اس آپریشن میں شریک ہو جاؤں، اب جب تک وہ لوگ بہ خیریت واپس نہ آ جاتے، میں ٹینشن میں مبتلا رہتا۔ مجھے سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ رمیش چند کی وفاداری میں اس کے آدمی پولیس اور آرمی کمانڈوز کا راستہ روکیں گے اس کے نتیجے میں اچھی خاصی خون ریزی ہوگی۔ میں چاہتا تھا کہ تیمور کی بجائے ہاشم ان کے ساتھ جائے لیکن ہاشم تو مجھے اس وقت کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

ان لوگوں کی روانگی کے بعد ہاشم کمرے میں داخل ہوا۔

"تم کہاں تھے ہاشم؟" میں نے پوچھا۔
"یہاں پولیس کی گاڑیاں آگئیں، میڈیا کی وین آئی، اچھا خاصا شور شرابہ رہا لیکن تم مجھے نظر نہیں آئے۔"
"میں جان بوجھ کر ایس ایس پی علی کے سامنے نہیں آیا۔"
ہاشم نے جواب دیا۔
"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کیس بھی بلوچ کی طرح ہے۔ وہ بھی پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔"
"ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔" ہاشم نے مسکرا کر کہا۔
میں بھی اضطراب کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا، کبھی تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔
"اچانک میرے کانوں میں فائرنگ کی آوازیں آئیں، وہ آوازیں خاصی دور سے آرہی تھیں اور اگر غور سے سنا جاتا تو سنائی بھی نہیں دیتیں، میں نے ممتاز سے کہا۔ "وہ لوگ آخر پولیس سے ٹکرا ہی گئے۔"
"ٹکرا گئے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔ بجر اور ایس ایس پی کے ساتھ جو لوگ ہیں، وہ پھول برسانے تو نہیں گئے ہیں، پھر تیمور بھی ان کے ساتھ ہے جو بہ قول تمہارے بیس آدمیوں پر بھاری ہے۔"
"یار، تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے، مجھے ان بے گناہ لوگوں کی فکر ہے جو صرف اور صرف اس جعلی پیر کی عقیدت میں مارے جائیں گے۔" پھر میں ممتاز سے بولا۔ "ہم اس آپریشن میں شریک نہیں ہیں لیکن وہاں جا کر صورت حال کو دیکھ تو سکتے ہیں۔"
"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"
"تم اب تک اس کمرے میں کئی میل تو ٹہل ہی چکے ہو، چلو، ہاشم بھی، وہاں کا ایک چکر لگالیں، تم اپنی گاڑی نکالو۔" ممتاز نے کہا۔
"میری گاڑی کو سب پہچانتے ہیں۔"
میں نے ہاشم سے گاڑی نکالنے کو کہا۔ اس نے ڈبل کیبن پک اپ کی بجائے اپنی کرولا نکال لی اور بولا۔
"اس موقع پر ڈبل کیبن پک اپ بھی لوگوں کی نظروں میں آسکتی ہے۔"
میں ممتاز، ہاشم اور ندیم کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ جانے سے پہلے ممتاز نے اپنے گارڈز کو ہدایت کردی تھی کہ اگر کوئی زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا۔ جو لوگ چھت پر موجود ہیں انہیں بھی یہ پیغام دے دو اور اس قیدی کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کرنا۔
میں نے نعیم اور تیمور کے دوسرے ساتھیوں کو بھی ہدایت کردی تھی کہ وہ قیدی کے کمرے کے آس پاس ہی رہیں اور ہر طرف سے چوکنا رہیں۔ ہم لوگ رنیش ونجر کی حویلی کے نزدیک پہنچے تو وہاں لوگوں کا جم غفیر تھا، مقامی پولیس کے سپاہی انہیں ایک خاص فاصلے سے آگے نہیں جانے دے رہے تھے کیوں کہ وہاں دونوں طرف سے زوردار فائرنگ ہو رہی تھی، حویلی کا گیٹ البتہ چوپٹ کھلا ہوا تھا لیکن ابھی تک ٹی وی چینل والوں کو اندر داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی وین وہاں سے خاصی دور کھڑی تھی لیکن کیمرا مین زوم لینس کے ذریعے اس منظر کی فلم بھی بنا رہا تھا۔
اس وقت آرمی کی تین ٹروپ میں آگئیں، آرمی کی ٹروپ میں عام ٹرک کی طرح ہوتی ہیں، بس ان کا رنگ مختلف ہوتا ہے اور ٹرک کے برعکس ان کے دونوں کناروں پر لکڑی کے تختے لگے ہوتے ہیں تاکہ اس میں سوار افراد ان پر بیٹھ سکیں۔
ان کے رکتے ہی اس میں سے اچھل اچھل کر کمانڈو اترے اور وہ چشم زدن میں ادھر ادھر بکھر گئے، پھر میں نے دو جوانوں کو چھپکلی کی طرح گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا، حویلی میں اندر کی سمت خاصی پاور کا ایک بلب روشن تھا، اس کی وجہ سے اندر والے مزاحمت کر رہے تھے۔ ان جوانوں میں سے ایک نے اس بلب کا نشانہ لیا، فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے پوری حویلی تاریکی میں ڈوب گئی، میں اس جوان کے نشانے پر عش عش کر اٹھا۔
میری آنکھیں جب اندھیرے سے کسی حد تک مانوس ہوگئیں تو میں نے کئی جوانوں کو چھپکلی کی طرح تیزی سے حویلی کی طرف رینگتے دیکھا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کتنی خواری ہوئی۔ آج صبح دس بجے تک تو ہمیں ناشتا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، پھر ناشتا کرنے کے بعد ہم لوگ سو گئے، رات بھر جاگنے کے بعد تھکن اتنی بڑھ گئی تھی کہ آنکھیں ہی نہیں کھل رہی تھیں، پھر ہم تو دو راتوں سے مسلسل جاگ رہے تھے تم بتاؤ، کوئی خاص بات؟"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔"

"ہم لوگ کل صبح یہاں سے نکلیں گے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ایک کام کرو تم میرے وہاں پہنچنے تک وہیں ٹھہرنا میں ابھی کراچی سے نکل رہا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے بلوچ کا ٹیلی فون آیا تھا، وہ آدھے گھنٹے میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں پہنچ رہا ہے، پھر ہمارے ساتھ تیمور اور اس کے ساتھی بھی ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اچھا، بلوچ پہنچ رہا ہے؟" ہاشم نے پوچھا۔

"ہاں، وہ ابھی کچھ دیر میں یہاں آ جائے گا، اس نے راستے سے ٹیلی فون کیا تھا۔

دن بھر سونے کے بعد اب ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی، البتہ نادیہ اور شائستہ کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ "تم لوگ جا کر سو جاؤ، رات بھر بے آرام ہی ہوگی تم۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں شاید یہی چاہتی تھیں، فوراً ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

میں اور تیمور، ممتاز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے، وہ اس وقت ڈرائی فروٹ سے برسر پیکار تھا، سینٹر ٹیبل پر اخروٹ، بادام، تلی ہوئی مونگ پھلیاں رکھے ہوئے تھے۔

وقت گزاری کو ہم ڈرائی فروٹ ٹونگنے لگے۔

بلوچ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ گیا، ممتاز کی حویلی پر موجود پولیس گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ممتاز کے گارڈز ان لوگوں کو پہچانتے تھے اس لیے وہ اپنی ڈبل کیبن پک اپ سمیت اندر آ گیا۔

اس کے آدمی تو اپنے ان کمروں میں چلے گئے جن میں وہ اس سے پہلے مقیم تھے، بلوچ ڈرائنگ روم میں آ گیا اور مجھ سے ایسے ملا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔

"تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

"ہاں واجہ!" وہ ہنس کر بولا۔ "لیاری میں ہائی وے پر پٹھانوں کی کئی ہوٹل ہیں وہاں کھانا بہت اچھا ملتا ہے، میرے آدمیوں نے فرمائش کی آج ہم ہائی وے کے کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔"

"آپ یہ بتاؤ کہ وہ کون سی خوش خبری تھی جو تم ہمیں دینے والے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"واجہ! پہلا خوش خبری تو یہ ہے کہ مشہدی کا دو بہت ہی خاص آدمی پولیس نے گرفتار کر لیے ہیں اور مشہدی خود انڈر گراؤنڈ چلا گیا ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ڈولی کہاں ہے۔"

"ڈولی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "مشہدی کی بیٹی؟"

"ہاں، وہی، وہ آج کل کراچی ہی میں ہے۔"

"لیکن اب ہم اس کا کیا کریں گے بلوچ؟" میں نے کہا۔

"اب تو شائستہ تمہیں مل چکی ہے۔"

"پر واجہ! ہم ڈولی کے ذریعے مشہدی کو بلیک میل تو کر سکیں گے، اسے بھی تو وہی صدمہ پہنچے جو تم نے ایک سال برداشت کیا ہے۔"

☆.....☆

یہ پُرتجسس، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے "سچی کہانیاں" میں ملاحظہ فرمائیں

میں کون ہوں؟



سدرہ انور علی

فقیرنی کے روپ میں چھپی ایک مجرم عورت کی کہانی کی جھلک

کیا آپ نے کبھی کسی فقیر کی آپ بیتی سنی ہے؟ ضرور سنی ہوگی لیکن میری کہانی بہت ہی منفرد اور عجیب قسم کی ہے۔ میں ہاں فقیر، ایک نچلے درجے کا جاہل سا انسان جو دوسروں کے جھوٹے ٹکڑے کھا کر اور لوگوں کی اترن پہن کر اپنی زندگی میں کچھ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن زندگی کی چادر پر لگی ہوئی غربت کی سیاہی دور ہونے میں نہیں آتی۔ خوشیوں کے پھول کھلنے نہیں پاتے کہ دکھوں کی ہوا انہیں مرجھا کر رکھ دیتی ہے۔ جہاں پیٹ بھر کا موسم سالہا سال تک فصل گل کو آنگن میں قدم رکھنے نہیں دیتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ غربت کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

میں نہیں جانتا میرا نام کیا ہے؟ شاید میرا کوئی نام تھا ہی نہیں۔ لیکن میری ماں مجھے ہر وقت حرام زادہ کہتی تھی، شاید یہی میرا نام تھا اور میری قسمت بھی میرے نام کی طرح تھی۔ ہر اچھی چیز، ہر اچھا کپڑا، ہر اچھا کھانا مجھ پر حرام تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ نام انسان کی شخصیت پر اثر کرتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں ایک فقیر ہوں اور یہی تو فقیری زندگی ہوتی ہے۔

میری ماں جو کہنے کو تو میری ماں تھی، لیکن کسی حکمران کی طرح ظالم اور جابر۔ اس کے منہ سے ہر وقت گالیوں کی برسات جاری رہتی۔ انتہائی خود غرض، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی کی جان تک لینے سے گریز نہ کرتی تھی۔ توبہ توبہ۔ میں بھی کیسا ناہنجار لڑکا ہوں۔ کیسا کفر بک رہا ہوں اپنی ماں کے خلاف، لیکن میں بھی کیا کروں۔ کہتے ہیں کہ ماں کی گود انسان کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے، لیکن میری ماں نے شاید ہی مجھے کبھی پیار کیا ہو۔ ہر وقت گالم گلوچ کرنا، مجھ پر جسمانی تشدد کرنا تو گویا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ مجھے ہر طرح کی اذیت دیتی تھی۔ مجھے تنور کی طرح جلتا دیکھ کر بھی اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ میں نے تو سنا تھا کہ ماں رب کائنات کی عظیم مخلوق ہے لیکن کیا مائیں ایسی ہوا کرتی ہیں۔

☆......☆......☆

میری ماں جسے سب، وڈی، کہتے تھے۔ اس نے ایک تین پہیوں والی لکڑی کی ریڑھی بنوائی ہوئی تھی۔ اس طرح کی ریڑھی عموماً گداگر بھیک مانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت میری عمر اندازاً آٹھ یا نو سال ہوگی۔ میری ماں مجھے منہ اندھیرے جگا دیتی اور دو تھپڑ اس قدر زور سے مارتی کہ خالی پیٹ مجھے چکر آنے



لگتے۔ پھر وہ مجھے ایک پیالہ لال کالی چائے کا اور رات کی باسی سوکھی روٹی دیتی اور پھر وہ چانٹے مار کر کہتی۔

"جلدی سے کھاؤ اور میرے ساتھ کام پر چلو۔"

جس جگہ پر ہم رہتے تھے، وہ جگہ ساری ہی فقیروں کی تھی اور وہاں پھٹی پرانی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس جگہ کا نام پہلے تو اسلام نگر تھا، لیکن جب سے وہاں فقیر آ کر آباد ہوئے تھے، تب سے اس جگہ کا نام "فقیر نگر" پڑ گیا تھا۔

ماں مجھے سوکھی روٹی اور کالی پھیکی چائے کا ناشتا دیتی تھی، لیکن خود دیسی گھی والے پراٹھے کھاتی تھی، جب تک میں ناشتا کرتا، ماں جس کا وزن بھی دو من کے قریب تھا، وہ تب تک ریڑھی میں بیٹھ چکی ہوتی تھی۔ وہ گاڑی میں ایک پاؤں پر سفید رنگ کا کوئی سلوف مل کر اور پاؤں تھوڑا ٹیڑھا کر کے بیٹھتی، تاکہ دیکھنے والے اسے واقعی معذور سمجھیں اور پھر میں گلی گلی اس کی گاڑی کو چلاتا تھا۔

فقیر نگر سے باہر نکلتے ہی وہ ایسی دردناک آوازیں نکالتی اور بھیک مانگتی کہ دیکھنے اور سننے والوں کے آنسو نکل آتے وہ بہت بڑا بہروپ اوڑھ کر بیٹھتی تھی، تاکہ لوگ اس کی عیاری اور مکاری کو نہ جان سکتے۔ میں تو بالکل بچہ تھا اور آدھا گھنٹہ پیدل چلتے ہی میرے پاؤں دکھنے لگتے تھے۔ مجھے جوتا پہننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ میرے اور ماں کے کپڑے بھی پھٹے پرانے ہوتے تھے۔ میں سارا دن ننگے پاؤں ریڑھی چلاتا اور ماں مجھے سارا دن گالیاں اور کوسنے دیتی تھی۔ کبھی کہتی کہ تیز چلاؤ، کبھی کہتی آہستہ کرو۔ جس وقت ریڑھی رکواتی بس وہی وقت میرے لیے کچھ سکون کا ہوتا تھا۔ سارا دن ننگے پاؤں چل چل کر میرے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ دوپہر میں کسی ہوٹل کے سامنے رکواتی اور وہیں کھانا مانگ کر لاؤ۔ کبھی کبھار کوئی کھانا دے دیتا اور کبھی جھڑک دیتا اور جھوٹے برتن اٹھا کر دے دیتا۔ ماں دور سے ہی دیکھ کر کہتی "اے منحوس حرام زادے، یہ کھانا خود ہی کھاؤ۔" کسی کا بچا ہوا کھانا بھی نہ کھاتی تھی۔ ضدی اور ڈھیٹ اس قدر تھی کہ اگر کبھی کوئی کچھ نہ دیتا تو ایک جگہ جمی رہتی اور کچھ نہ کچھ لے کر ہی ٹلتی۔ بڑی بڑی اور امیر دکانوں کے آگے جا کر

گاڑی رکواتی، کیوں کہ وہ جلدی اور زیادہ بھیک دیتے تھے۔ وہ نظریں بڑی تیز اور گہری رکھتی تھی۔ جس جگہ ایک بار جاتی پھر پورے پانچ دن بعد اس جگہ جاتی، تاکہ کوئی اس کے فراڈ کو پہچان نہ سکے۔ حالانکہ میرے مطابق اس کے پاس اتنی دولت اکٹھی ہو چکی تھی کہ وہ برسوں تک بیٹھ کر کھا سکتی تھی، لیکن دولت کی حرص انسان کو کہاں چین لینے دیتی ہے۔

دن اسی معمول کے مطابق گزرتے جا رہے تھے۔ نہ اس کے میرے اوپر ظلم میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی اس کے تشدد میں کوئی فرق آیا تھا۔ وہ دن رات میری نگرانی میں لگی رہتی تھی کہ کہیں میں اس سے بغاوت نہ کر دوں۔ حالانکہ میں ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ میری ماں ہی تو میرا واحد سہارا تھی، وہ جیسی بھی تھی مگر میری ماں تھی، لیکن اس کا دن بدن خطرناک ہوتا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ماں تو محبتوں کا سمندر ہوتی ہے۔ ایسا عجیب اور گہرا سمندر جس کی گہرائیوں کو آج تک کوئی ناپ نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ معمول کے مطابق ماں نے مجھے چائے اور ساتھ ہی رات کی باسی روٹی کا ناشتہ دیا اور خود دیسی گھی والا پراٹھا چائے کے ساتھ کھا کر اس زور سے طمانچے میرے منہ پر مارے کہ سوکھی روٹی میرے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی، پھر کہنے لگی۔

"ارے کتیا کی اولاد، حرام زادے..... جلدی کرو ناشتا، آج ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ میری ماں ہے۔ مائیں تو اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتی ہیں، پھر میری ماں کیوں مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے میری پیٹھ پر اس زور سے دو ٹھڈے مارے کہ میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا، پھر کپڑوں سے پکڑ کر زور سے کھینچ کر اوپر اٹھایا اور بولی۔

"حرام زادے میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں جلدی پہنچنا ہے اور تمہیں سوجھیں پڑ گئی ہیں۔" اور پھر وہ خود ریڑھی میں سوار ہو گئی، پھر میں بھی اپنا ناشتا ادھورا چھوڑ کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور ریڑھی کا ڈنڈا پکڑ کے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی ماں نے منہ سے کپڑا ہٹایا ہوا تھا، لیکن

آبادی شروع ہوتے ہی اس نے کپڑا منہ پر گرا دیا اور معمول کی آوازیں لگانے لگی۔

ماں کی آواز میں اتنا سوز ہوتا کہ شدت کرب سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ اب بھی وہی آوازیں لگانے لگی اور میرا دل شدت درد سے کلبلا اٹھا اور قدم آگے بڑھانا مشکل ہو گیا۔

لوک تاں آکھن پکھی وداں ڈاڈھے سوکھے
ہوندا او کھا پکھی واساں لوں ڈاڈھا
سارا دن جھولی تے کشکول بھریندے
کوئی نہ کرے اندازہ
کوئی نہ پڑھے نماز ایہناں دی
نہ کوئی پڑھے جنازہ
لوک تاں آکھن پکھی وداں ڈاڈھے سوکھے
ہوندا او کھا پکھی واساں لوں ڈاڈھا

☆......☆......☆

آج ہماری منزل کوئی اور تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے آفس کے لیے اور بچوں نے اسکولوں کی راہ لی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارا برتن پیسوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ جب برتن بھر جاتا تو ماں آہستہ سے مجھے کہتی کہ یہ تھیلے میں ڈال دو۔ کچھ معصوم بچے جو اپنا جیب خرچ لیے جا رہے تھے، ان معصوم بچوں نے بھی اپنا جیب خرچ برتن میں ڈال دیا تھا۔ میں آگے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور اب ماں کا دھیان بھی بھیک مانگنے کی طرف نہیں تھا، بلکہ اب وہ بار بار ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی، جیسے اسے کسی کی تلاش ہو، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر ماں نے مجھے ایک گلی میں داخل ہونے کے لیے کہا اور میں گلی میں داخل ہو گیا۔

میں تو آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، لیکن ماں کا اضطراب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ماں نے مجھے ایک گھر کے سامنے رکنے کے لیے کہا اور خود برقعے کے اندر سے ہی آہستہ آواز میں کہنے لگی، کسی سے جو کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

"آ جاؤ میں باہر گھر کے سامنے ہوں۔"

لگتا تھا کہ ماں کے پاس موبائل تھا، لیکن میں نے تو آج تک نہیں دیکھا تھا کہ ماں کے پاس موبائل ہے۔ اب اچانک ماں کے پاس موبائل کیسے آ گیا۔ اچانک ہی سامنے والا دروازہ کھلا اور 40 سال تک کی عمر کا ایک کالا چھوٹا سا آدمی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک شاپر تھا جو اس نے ماں کی گود میں گرا دیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"دعدو والی حساب شام کو مل جائے گا بے فکر رہنا اور یہاں حفاظت سے ہم جانتی ہو نا۔"

"بس بس میں سمجھ گئی تم بھی بے فکر ہو جاؤ۔"

ان کی گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس شاپر میں کیا تھا یہ بھی مجھے پتا نہ چلا۔

"اب گاڑی کو واپس موڑ دو منحوس۔"

ماں نے مجھے تیز آواز میں کہا تو گلی سے نکل کر روڈ پر آتے ہوئے میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں دیکھ سکوں کہ اس شاپر میں کیا ہے، لیکن ماں نے میری ہر کوشش ناکام بنا دی اور شاپر کو برقعے کے اندر چھپا لیا اور وہ دوبارہ بھیک مانگنے کے لیے آوازیں لگانے لگی۔

اب بچے بڑے سب اپنی اپنی منزلوں کو جا چکے تھے اور روڈ پر رش ختم ہو چکا تھا، صرف ٹریفک اور اس کا شور تھا۔ میری ماں نے مجھے مارکیٹ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیران کن طور پر اس کے لہجے میں نرمی تھی اور یہی وقت تھا کہ میں اس شاپر کے بارے میں پوچھ سکتا تھا، اب میں اس بارے میں دل میں ترکیبیں سوچنے لگا۔

"ماں جی...... وہ جو آدمی نے گلی میں تمہیں شاپر دیا تھا اس میں......"

"چپ کر منحوس...... حرام زادے تجھے اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تو مجھ سے سوال کرے۔ دعدو صرف سوال کرتی ہے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ دعدو سے سوال کرے۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے ہی میری ٹانگ پر اس زور سے لات ماری کہ میں منہ کے بل سڑک پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ سامنے سے آتی ہوئی کار مجھے کچل کر گزر جاتی، میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ریڑھی آگے کو بڑھا دی۔

سارا دن مختلف بازاروں میں بھیک مانگنے کے بعد ہم ایک بوائز کالج کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگ تو ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے گزر گئے اور کچھ نے بھیک دی۔

میرے اندازے کے مطابق آج کی دیہاڑی بہت زیادہ لگ گئی تھی اور ماں اسے ایک ہفتے تک بیٹھ کر کھا سکتی تھی، لیکن اس نے اسی پر بس نہیں کی۔ اس وقت پانچ بجے کا ٹائم ہوگا جب ماں نے کہا کہ مجھے فوارہ چوک لے کر چلو۔ اس وقت وہاں بہت زیادہ رش ہوتا تھا اور بھیک بھی زیادہ ملتی تھی۔ فوارہ چوک پر آئے ہوئے ہمیں ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک بس وہاں آ کر رکی اور اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ بہت عجیب انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر چل رہا تھا۔ اس کے کانوں سے موبائل لگا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آ جاؤ..... آ جاؤ..... جلدی آؤ اس وقت کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ہمارے قریب آ کر اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور نیچے جھک کر برتن میں رکھنے لگا تھا کہ ماں نے وہ شاپر نکال کر اس کو پکڑا دیا اور وہ لے کر جلدی سے چلنے لگا، دفعتاً دو پولیس اہلکاروں کی نظر اس پر پڑ گئی، وہ ٹریفک پولیس کے آدمی تھے۔ وہ دونوں اس آدمی کی طرف بھاگے، لیکن تب تک وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ واپس ہماری طرف آئے۔ ماں نے مجھ سے کہا اب ہماری خیر نہیں، لیکن اچانک ماں نے اس قدر چیخ پکار شروع کر دی۔

"وہ میری ساری دیہاڑی لے کر بھاگ گئے۔ اس آدمی نے ہمیں لوٹ لیا۔"

ایک پولیس والا کہنے لگا۔

"مائی اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ کتنے پیسے تھے تمہارے۔"

پتر جی وہ میری ساری پونجی لے کر چلا گیا۔ یہ سن کر پولیس والے سائیڈ پر ہو گئے۔

یہ ہے ہمارے ملک کا قانون کہ دو اہلکار ایک آدمی کو نہ پکڑ سکے۔ میں ماں کے اتنے بڑے ڈرامے اور فراڈ پر حیران تھا اور دل میں اس کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، لیکن یہ سب معاملہ میری سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ وہ موٹا آدمی اس شاپر کو دوسرے آدمی کو خود بھی تو دے سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہ طریقہ کیوں نہیں اپنایا۔ ایک بھکارن کے ذریعے انہوں نے ایک شاپر کا تبادلہ کیا، جو کہ ایک یا ڈیڑھ کلو وزنی تھا۔ اس دن میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سارا دن چل چل کر میری ٹانگیں شل ہو گئی اور سر الگ درد کر رہا تھا۔ میں نے صبح سے کچھ زیادہ کھایا بھی نہ تھا، لیکن میری ماں کو مجھ پر ذرا بھی ترس نہ آیا تھا کہ مجھے کچھ کھلا پلا دیتی، اُلٹا مجھے مارا بھی تھا اس نے۔

گھر آ کر میں تھکن اور بھوک سے نڈھال اوندھے منہ گر گیا۔ ماں نے راستے سے ہی کھانے کا سامان لے لیا تھا، لیکن اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور خود کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ اتنے میں دو آدمی جھونپڑی کا پردہ اُٹھاتے ہوئے اندر آ گئے اور ماں کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئے۔ ایک نے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر ماں کو دیے، جسے اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں پکڑ لیے۔ ان میں سے ایک چہکنے لگا اور کہا۔

"واہ دلنشی! اگر تم ہمارے ساتھ اسی طرح مخلص رہی تو ہم تیری پیسوں کی بھوک مٹا دیں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ مجھے صرف پیسوں سے مطلب ہے۔ میں آپ کے کاروبار میں کبھی ہیر پھیر نہیں کروں گی۔"

"اچھا یہ چھوکرا کون ہے؟"

"یہ ہمارا بچہ ہے۔"

"اچھا تو اس کو کھانا نہیں دیا تم نے۔"

"ارے اس نے ابھی کھایا ہے۔"

میں ماں کے اس ظالمانہ جھوٹ پر حیران رہ گیا۔

ٹھیک ہے، ہم پھر چلتے ہیں اور کل اسی ٹائم پر آ جانا، دھیان سے، کسی کو شک تک نہ ہونے پائے، یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔

نیند نے مجھے کسی مہربان ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت ہوگا، جب سخت بھوک کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس قدر شدید بھوک کہ میرا جی چاہا کہ دھاڑیں مار کر روؤں۔ اچانک میری نظریں ماں کے ساتھ پڑے ہوئے برتنوں پر پڑی۔ وہاں وہی ماں کا بچا ہوا کھانا رکھا ہوا تھا۔ شاید ماں نے میرے لیے رکھا ہو، اس لمحے میری ماں مجھے بڑی مہربان لگی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا، جیسے صدیوں بھوکا

رہا ہوں۔

صبح ہوئی تو پھر وہی ماں کے دو تھپڑ، سوکھی روٹی اور کالی چائے اور پھر ماں کو ریڑھی میں بٹھا کر چل پڑا۔ لیکن ایک بات جو مجھے مسلسل پریشان کر رہی تھی اور وہ جو ایک آدمی کالا شاپر ماں کو پکڑاتا اور ماں شام کو دوسرے آدمی کو دے آتی تھی۔ لیکن ایک دن یہ معما بھی حل ہو گیا۔ وہ یوں کہ ایک دن ماں اور میں اسی گھر کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا۔

"ماں جی تم روز یہاں کیا کرنے آتی ہو۔ یہ لوگ تو اشتہاری ملزم ہیں۔ ہیروئن اور افیم کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ تو بہت بڑے ڈکیت ہیں اور پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ سارا محلہ ان سے ڈرتا ہے۔ تم یہاں نہ آیا کرو۔"

اب مجھے ساری بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ وہ لوگ ماں کو شاپر میں کیا چھپا کر دیتے ہیں۔

☆......☆......☆

اسی معمول میں تین سال گزر گئے اور اب تو میں نے بھی ماں کو ہٹ دھرمی دکھانی شروع کر دی تھی۔ جب وہ مجھے مارنے لگتی تو میں ہاتھ آگے کر لیتا اور ماں کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ جس پر اسے اور زیادہ طیش آتا اور مجھے اور زیادہ شدت سے مارنے لگتی۔ اب تو اس کے ظلم میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ایک دن صبح صبح کا ٹائم تھا اور ماں مجھے مار رہی تھی کہ وہی آدمی آ گیا، جو صبح کے وقت ماں کو شاپر دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی ماں کے ہاتھ نہیں رکے تھے۔ وہ بہت حیران نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا اور کہا۔ "تم اپنے بیٹے پر اتنا ظلم کیوں کر رہی ہو۔"

"یہ میرے آگے بکواس کرتا ہے جو بھی کام کہوں، اس میں ہیرا پھیری کرتا ہے۔ بہت ڈھیٹ بنتا جا رہا ہے۔"

"تو ڈھڈو جی تم اسے پیار سے سمجھاؤ۔ اس طرح تو یہ مر جائے گا۔"

"ارے نہیں مرے گا یہ پکا حرامی ہے۔" بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن یہ مجھے نہ مار دے۔ اس لیے تو اس کتے کو نہیں پالا تھا کہ یہ مجھ پر ہی بھونکے۔ کتے تو پھر بھی اپنے مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔"

ماں نے نجانے کون سا اشارہ اسے کیا کہ وہ کہنے لگا۔

"اچھا، بس کل آؤں گا پھر مجھے بتانا، دیکھتے ہیں یہ کیسے سیدھا نہیں ہوتا۔"

میں اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا لیکن وہ تین دن کے بعد آیا اور وہ بھی اس وقت جب میں سو گیا تھا، لیکن ابھی میں گہری نیند میں نہیں تھا، بس آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک جھونپڑے کا پردہ سرکا اور ایک سایہ سا اندر داخل ہوا، اندر مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے اس کی آواز سے اسے پہچانا۔ اس نے آتے ہی میرے بارے میں پوچھا۔ ماں نے کہا۔

"سو گیا حرامی۔"

"اچھا کتنی دیر ہوئی اسے سوئے ہوئے۔"

"یہی کوئی ایک گھنٹہ۔"

"اچھا پھر یہیں بات کرتے ہیں، باہر تو سخت سردی ہے۔"

"ہاں، ہاں...... تم کہو، تمہیں اس سے کیا ڈر ہے۔ اگر یہ سن بھی لے تو کچھ نہیں ہو گا۔"

"تمہیں ڈھڈو جی، سمجھا کرو، بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"اچھا اب تم کہہ بھی دو۔"

"تم اسے سیدھا کرنا چاہتی ہو تا تو تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ یہ اب سیدھا نہیں ہو گا۔ جیسے جیسے یہ بڑا ہو جائے گا، تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اچھا تم یہ تو پہلے بتاؤ کہ یہ تمہاری سگی اولاد ہے۔"

"ارے نہیں سگی اولاد ہوتی تو میں اسے یوں مارتی، گندگی کے ڈھیر سے اٹھایا تھا اسے میں نے۔ یہ حرامی ہے۔"

"چلو پھر تو میرا اور تمہارا پلان کامیاب ہو جائے گا۔" آدمی نے کہا۔

"اچھا وہ کون سا؟"

تم نے یہ کرنا ہے کہ اب یہ سیدھا تو ہو گا نہیں بلکہ یہ تمہیں مارے گا بھی اور شاید بھاگ بھی جائے۔ اگر تم اسے قابو کرنا چاہتی ہو تا تو اس کے دونوں بازو اور ایک ٹانگ کٹوا دو۔"

اُف میرے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی اور میں پسینے میں نہا چکا تھا۔ اگر ذرا سی بھی روشنی ہوتی نا تو انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور کچھ شک نہ تھا کہ مجھے اسی وقت مار دیا جاتا۔

"اب میں اسے ماں کیسے کہتا۔ میں تو حرامی تھا اور وہ میری ماں نہیں تھی۔"

اچانک ڈھڈو کی آواز آئی۔ "او کالیا تم تو میری روزی بند کرنا چاہتے ہو یہ میری روزی روٹی کا وسیلہ ہے۔"

"پھر تم اسے مار لیں کیوں، ہو اسے کمانے اوڑھنے کو اچھا کیوں نہیں دیتی۔ اگر تم اس کے بازو اور ٹانگ تڑوا دو تو تمہارا رزق بھی بڑھ جائے گا اور تمہارا کاروبار وسیع ہو جائے گا۔"

"وہ کیسے؟" ارے ڈھڈو اس نے منہ آگے کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"جب تم اسے ریڑھی میں لاد کر باہر جاؤ گی تو لوگ اسے معذور سمجھ کر تمہیں زیادہ سے زیادہ بھیک دیں گے اور تمہارا کاروبار بڑھ جائے گا۔"

"لیکن میں اسے کیسے کھینچوں گی۔ مجھ سے دو قدم تک نہیں چلا جاتا۔"

اس کے لیے میں تمہیں ایک لڑکا دوں گا وہ ریڑھی کھینچے گا اور تم اس کے ساتھ ساتھ چلنا۔ اور پھر چلنے میں تو نہیں رہنا، کرنا بھی تو ہے جگہ جگہ۔

یکدم ڈھڈو کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" "اب یہ تو مجھے کیا کرنا ہے۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا جو بھی کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔ اب آگے میرا کام شروع ہوتا ہے۔"

"یہ سن کر میں جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور میری سانسیں بھی رک رہی تھیں۔ کوئی انسان اتنا سفاک اور ظالم کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک زندہ سالم انسان کے اعضا کاٹ دے۔ اچانک پھر کالے کی آواز آئی اور اس نے کہا۔ "ڈھڈو میں پرسوں آؤں گا۔ پہلے اس کو نشے کا ٹیکا لگا دوں گا تا کہ یہ ہمارے آگے پھڑک بھی نہ سکے۔"

اب تو میری اور بھی جان نکلنے لگی۔ پھر ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔ میرے پاس صرف آج کا دن تھا۔ سارا دن سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا، لیکن آج ماں نے مجھے باہر جانے ہی نہیں دیا۔ مجھے کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ باہر جا سکوں۔

مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ رات کا کھانا کھا کر ڈھڈو نے مجھے کہا کہ اب سو جاؤ اور خود بھی میرے سامنے ہی سونے بن گئی، لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ میں بھی اس کے سامنے ایسے لیٹ گیا جیسے گہری نیند میں ہوں۔ بارہ بجے کے بعد کا وقت ہوگا جب میں بہت آہستہ سے بغیر آواز نکالے نہایت آرام سے اٹھا۔ ڈھڈو بے ہوش سو رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس ڈنڈے کو تلاش کرنے لگا جو ڈھڈو نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا اور اب وہی ڈنڈا مجھے اپنی حفاظت کے لیے چاہیے تھا اور پھر ڈنڈا مجھے مل گیا۔ اب میرے ہاتھ اس ڈبے کو تلاش کرنے لگے جہاں ڈھڈو پیسے رکھتی تھی۔ وہ ٹین کے دو ڈبے تھے، ایک میں سکے تھے اور دوسرے میں کاغذ کے نوٹ، لیکن میری بدقسمتی تھی کہ میرا ہاتھ سکوں والے ڈبے سے ٹکرایا تو آواز پیدا ہونے کی وجہ سے ڈھڈو ہلکا سا کسمسائی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں آرام سے اپنی جگہ لیٹ گیا ڈنڈا میں نے پاس رکھ دیا تھا۔ ڈھڈو نے بلب جلا دیا اور پھر اس نے ہر طرف نظر دوڑائی ہو گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لائٹ بند کر کے پھر سو گئی۔ آدھا گھنٹہ میں اسی پوزیشن میں لیٹا رہا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے ٹین کے ڈبے کو آہستہ سے لیٹے ہی باہر دھکیلنا شروع کر دیا، پھر میں نے پیٹ کے بل زمین پر رینگنا شروع کر دیا۔ ڈنڈا میرے ہاتھ میں تھا۔ ابھی میرا ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر نکلا ہی تھا کہ ڈھڈو نے میرا اندر والا پاؤں زور سے پکڑ کر اندر کھینچا اور کھڑی ہونے ہی لگی تھی کہ میرا ڈنڈے والا ہاتھ فضا میں لہرایا اور اس کے سر پر لگا اس زور سے کہ ڈھڈو چکراتی ہوئی نیچے گری۔ مجھے توقع تھی کہ یہ سب ہو گا یعنی میں پکڑا جاؤں گا لیکن ڈھڈو کو یہ توقع نہیں تھی کہ ڈنڈا اس کے سر پر پڑے گا، پھر میں نے اندھا

دھند بھاگنا شروع کردیا۔ فقیر گھر سے باہر آ کر بھی میں نہیں رکا، بلکہ بھاگتا رہا۔ میری سانسیں پھول گئی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں رات کے گھور اندھیرے میں اکیلا تھا۔ میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ لیکن ڈھنڈو کا خوف اس پر بھی حاوی تھا۔

میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا میں نے اس کا نمک کھایا تھا۔ میں حرامی ضرور تھا، لیکن نمک حرام نہیں تھا، لیکن وہ تو میری جان کے درپے تھی۔

بھاگتے بھاگتے مجھے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ میں نے اب پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شکر تھا کہ میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ یہ کوئی ویران و سنسان علاقہ تھا۔ دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اب بھی چلتا رہا۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں اپنی مرضی سے جی رہا تھا۔ اب دور دور سے اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد دن کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں اب ایک روڈ پر آ چکا تھا جو بالکل سنسان تھا۔ ابھی رات کا اندھیرا چھٹا نہیں تھا۔ دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں اِدھر اُدھر چھپتا۔ وہ ٹرک تھا اور میرے بالکل قریب آ کر رک گیا۔ دو آدمی باہر نکلے اور پوچھا۔

"تم کون ہو لونڈے۔" میں چپ ہی رہا۔ ان میں سے ایک نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈنڈا لے کر میرا بازو پکڑ کر مجھے اندر بٹھا دیا۔ وہ کل تین آدمی تھے۔ اندر لائٹ روشن تھی ان کے چہرے کرخت تھے اور آنکھیں لال۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ ٹرک اب پھر پوری رفتار سے چلنے لگا تھا کہ اچانک ایک آدمی نے دوپٹا کھول کر دیکھا تو میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ تم کسی کی چوری کر کے نکلے ہو۔" پھر اس نے میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا، تو میں نے اسے شروع سے اب تک اپنی ساری کہانی سنا دی۔

میری کہانی سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ "ہماری بہت بڑی فیکٹری ہے اب تم ہمارے ساتھ رہنا اور وہیں کام کرنا۔ پھر وہ مجھے لے کر چلے گئے یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔ جب انہوں نے مجھے ٹرک سے اُتارا تو دو آدمی آئے اور ٹرک کے پچھلی طرف چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے پانچ لڑکوں کو نیچے اتارا اور مجھے بھی ساتھ ملا لیا اور وہاں لے گئے جہاں اور بھی بہت سارے ہم عمر لڑکے کام کر رہے تھے۔ کچھ پتھر اُٹھا کر ٹرک میں لوڈ کر رہے ہیں اور کچھ لکڑیاں کاٹ رہے تھے تو کچھ لوہے کے بڑے بڑے پائپوں کو کاٹ رہے تھے، پھر وہ آدمی اور آ گئے اور انہوں نے ہم کو مارنا شروع کر دیا اور اتنا مارا کہ ہم بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہی آدمی میرے پاس بیٹھا تھا جس نے مجھے ٹرک پر بٹھایا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں روکا تھا کہ تمہیں نہ ماریں وہ شاید بھول گئے، لیکن ان کا کام ہی یہی ہے۔ اب میں جہاں رہ رہا تھا یہ جہنم اس جہنم سے بھی بدتر تھی۔ صبح سے شام تک کام کرنا اور رات کو قید خانے میں سونا۔ میں یہاں بھی فرار کے منصوبے سوچنے لگا، لیکن کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ وہاں پہرے کا انتظام بہت وسیع تھا اور وہاں سے نکلنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ بچوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کو مار پیٹ کر انہیں بیرون ممالک میں بھجوا دیا جاتا یا ان کے جسمانی اعضا نکال کر فروخت کیے جاتے تھے۔ کچھ بھی ہو مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔

وہاں پر دو لڑکے تھے جو میرے دوست تھے یعنی ان سے اچھی دعا سلام تھی۔ ان میں ایک لڑکا جس کا نام عثمان تھا، وہ ہر وقت روتا رہتا تھا، اسے اپنے والدین کی بہت یاد ستاتی تھی اور اس پر تشدد بھی زیادہ کیا جاتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنی ترکیب اس کے گوش گزار دی۔ اسے میری ترکیب بہت پسند آئی اور ہم نے اس ترکیب پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا، گو کہ یہ بہت بڑا رسک تھا، لیکن رسک نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ جس جگہ ہم رہ رہے تھے مین گیٹ وہاں سے دس منٹ کی دوری پر تھا اور یہی رسک تھا، کیوں کہ وہاں پر چار سنتری (پہرے دار) ہوتے تھے۔ ان کو چکما دینا آسان نہ تھا۔ (اس دن آدھی رات کے بعد ہم نے نکلنا تھا۔ ہم تین تھے۔ رات کو ہمیں کھانے کے لیے باہر لایا گیا تو ہم تینوں کھانے والی جگہ پر دیر تک بیٹھے رہے، باقی سب لڑکے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ برتن اٹھانے والا آتا، ہم تینوں اُٹھ کر

پتھروں کی آڑ میں ہو گئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ آدھی رات کا وقت ہوگا ہم نے سب کے سونے کا یقین کر لیا تھا۔ ہم تینوں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جا رہے تھے۔ دو سنتریوں کو ہم نے پار کر لیا تھا۔ جو گیٹ کے اندر تھے اور ان کے خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ اب گیٹ پھلانگنے کا مرحلہ تھا۔ جو بہت اونچا تھا، لیکن ہم پار کر سکتے تھے۔ اگر آواز پیدا نہ ہوتی۔

پہلے امجد گیٹ پر چڑھا اس کے قد تھوڑا لمبا تھا، وہ جلد ہی اوپر پہنچ کر نیچے اتر گیا۔ پھر عثمان اور میں اوپر چڑھ گئے۔ اوپر پہنچ کر میں نے ان کے سونے کا یقین کر کے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیا۔ گیٹ ہلکا سا ہلا، کیونکہ ہم دو تھے۔ گیٹ پر دائیں جانب والا سنتری ہلکا سا کسمسایا، جبکہ دوسرا اونگھ رہا تھا، لیکن انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا کیوں کہ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ ہم کامیابی سے نیچے اتر گئے اور پیٹ کے بل چلتے ہوئے تقریباً پانچ منٹ کا سفر کیا اور اس کے بعد ہم بھاگنے لگے۔ ہمیں نہیں معلوم ہم کتنی دیر بھاگے۔ جب اندھیرا چھٹنے لگا اور صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تو ہمیں اپنے سے کچھ فاصلے پر ایک چوکی نظر آئی۔ دو پولیس والوں نے ہمیں روک لیا اور کہا۔

''تم اتنی صبح صبح کہاں سے آ رہے ہو۔'' میرے دوستوں نے مجھے روکا لیکن میں نے ساری بات ان کو بتا دی۔ میری بات سن کر وہ حیران رہ گئے۔ کیونکہ کئی سال سے بچے غائب ہو رہے تھے، لیکن ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے ان کو جگہ بتا کر ان لوگوں کو پکڑوا کر سارے بچے بازیاب کروا لیے۔ جب بچے اپنے والدین سے ملے تو وہ منظر اتنا نم ناک تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کچھ بچوں کے والدین ان کے غم میں یہ دنیا ہی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ہر کوئی ہمارے حوصلوں کی داد دے رہا تھا اور ہمیں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیا تھا جو میں حرامی تھا، لیکن آج میرے کارنامے پر ہر کوئی خوش تھا۔ ہر کوئی مجھے اپنی سرپرستی میں لینے کی کوشش میں تھا اور پھر میرے دوست عثمان نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا تھا۔

☆......☆......☆

آج میں پورے تین برس بعد اسی شہر جا رہا تھا۔ جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں مجھے حرامی کا لقب دیا گیا تھا۔ میں امام غزالی روڈ جھنگ پر جا رہا تھا تو مجھے دور سے ہی ایک ریڑھی نظر آئی۔ جیسے جیسے وہ قریب آتی جا رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ایک اوٹ میں ہو گیا اور پھر میں نے اسے اپنے بالکل قریب سے گزرتے دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ جی ہاں وہ کوئی اور نہیں ڈھڈو ہی تھی۔ اس کے دونوں بازو کہنیوں تک کٹے ہوئے تھے اور اس ریڑھی کو ایک دس سالہ بچہ دھکیل رہا تھا۔ زمانے بھر کا کرب اور درد ڈھڈو کے چہرے پر تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔ شاید اسے میری خوشبو محسوس ہو گئی تھی، جو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئی تھیں۔ یہ یقیناً یہ قدرت کا انتقام تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا آج خود پا لیا تھا۔

کہتے ہیں وقت اپنے آپ کو ضرور دہراتا ہے۔ کل جب میں ریڑھی چلاتا تھا تو وہ مجھے بات بات پر مارتی اور حرامی ہونے کے طعنے دیتی تھی، لیکن آج نہ اس کے ہاتھ تھے اور نہ زبان، جو رب نے گنگ کر دی تھی۔

میں نے یہ بھی سنا تھا کہ مظلوم اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ میرا آج سارے زمانے سے یہی سوال ہے کہ کیا حرامی ہونا کوئی جرم ہے، یا حرامی خود آتے ہیں اس دنیا میں۔ انہیں اللہ نہیں بناتا۔ حرامی بھی اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آتے۔ یہ معاشرہ صاف اور پاکیزہ ہو جائے تو کوئی حرامی نہ ہو، لیکن اگر ہو بھی جائے تو بھی کبھی حرامی اس دنیا میں وہ کارنامے کرتے ہیں جو کوئی نہیں کر سکتا۔

ڈھڈو شاید مجھ سے معافی مانگنا چاہتی تھی، تو اس کے چہرے پر غم کی شدتیں تھیں۔ میں نے اس کا نمک کھایا تھا۔ اس نے چودہ سال تک مجھے پالا تھا، مجھے بڑا کیا تھا۔ معاف کرنے والوں کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے اور یہی اللہ کو بھی پسند ہے۔ اس لیے میں نے ڈھڈو جی کو معاف کر دیا ہے، شاید اللہ بھی اسے معاف کر دے۔

☆......☆......☆

دنیا میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

زرِمبادلہ دیجیے

اندرون ملک =/720 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

110 آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

فون نمبر: 021-34939823,34930470



اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ یہ سلسلہ "ناگن"۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 8

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پرداداؤں کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور ان الف لیلوی کہانیوں کے جن بھی انہیں کے حکم کے غلام ہوں گے لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ان کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جوان جوڑوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو اب تک زندہ رکھا ہے یہ جوڑا اور قربانی کا یہ سلسلہ اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔

وہ وقت بھی اب قریب تھا کہ ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے پہاڑی میں سالوں سے ساتھ رہنے والے بیٹے ساجو کو بتایا کہ آج رات کوئی آنے والا ہے۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور ساجو انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج اپنے بیٹے پر مطمئن تھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا ساجو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھتے رہ گئے۔ ساجو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ ساجو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ ساجو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب ساجو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

ناگ سے دیکھ لیتے ہیں وہ اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی تحقیر کر کے بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ کیا تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں؟ شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی ایک ایک اینٹ سے انتقام لوں گی۔ تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے دور ہو جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔"



شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تاپانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

سامری جادوگر اپنے گرو شنکرا جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور "تو سب کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ" سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شکنتلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ قرار دے کر مخاطب کرتا ہے مہارانی شکنتلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شکنتلا کہتی ہے کہ "آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وشال ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں ناگنوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔" سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شکنتلا اپنی ملازمہ خاص پریہ کو بھی اپنی اصلیت کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ پریہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شکنتلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پریہ کا خون کر دے گی دوسری صورت میں اسے تاپانہ کی حکومت میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ پریہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

مہارانی مادیہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے جو انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو زرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو مادیہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک غلام شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی مادیہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بکرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ شکنتلا سامری جادوگر کو یاد کرتی ہے تو سامری جادوگر فوری حاضر ہو جاتا ہے۔ گرو زرائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور کلکتہ میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ اب سامری اور شکنتلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیدان کر کے تیرہ جاپ شروع کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کالی کے چرنوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

بلیدان کا عمل مکمل کر کے وہ ناگن شکنتلا کو اپنا غلام بنانے کے لیے مندر سے نکل کر شمشان گھاٹ میں جا پہنچتا ہے اور تیرہ جاپ شروع کر دیتا ہے۔

سامری، شکنتلا، بکرام اور پریہ تاپانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی دیوی کی انسان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔ پریہ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔

شکنتلا سبز آنکھوں اور سنہرے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شمران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔

شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو زرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شنکرا کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شمران اور سامری تینوں گرو زرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو زرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خسکران ان دونوں کو لے کر کلکتہ سے دور لے جاتا ہے اور ان دونوں سے کہتا ہے کہ میں اپنی سلطنت واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے جنوں سے اس بارے میں مشورہ کرتا ہوں۔ سامری بھی اپنے گرو شنکرا جادوگر سے رابطہ کرنے کے لیے شکنتلا کو اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ شکنتلا اپنے ہر چمتکار کو حاصل کرتی ہے اور اس سے انسانی خون طلب کرتی ہے۔ چمتکار بتاتا ہے کہ جس گھر میں آپ موجود ہیں اس گھر میں زندہ انسان موجود ہیں جو اس گھر کے مالک ہیں اور خسکران نے انہیں قید کر رکھا ہے۔ گرو زرائن کو شکنتلا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مہا پنڈت اگنم ناتھ سے اس سلسلے میں مدد طلب کرتا ہے۔ مہا پنڈت شکنتلا سے فائدہ اٹھانے کے وعدے پر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شکنتلا گھر میں قید نوجوان سلیمان کے خون سے اپنی بھوک مٹاتی ہے اور اس کی بہن رقیہ اور بیوی کنیز فاطمہ پر تشدد کرتی ہے۔ گرو زرائن اور اگنم ناتھ شکنتلا دیوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ گرو زرائن شکنتلا کو کہتا ہے کہ وہ اپنے مہابیروں کو حکم دے کہ وہ ہم سب کو ریاست کلکتہ کالی ماتا کے استھان کے اندر اگنم ناتھ کے کمرۂ خاص میں لے چلیں۔

شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو زرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چمتکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں ناگن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔ ادھر سامری جب واپس وادی والے مکان میں پہنچا تو

شگفتا موجود نہ تھی۔ رقیہ، کنیز فاطمہ اور اسد اللہ اور اس کے بیٹے سلیمان کی دردناک موت کا ماتم کر رہے تھے۔ سامری کہتا ہے کہ کسی طریقے سے گرو رائن کے آنے کی اطلاع پا کر شگفتا کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ وہ کلکتہ کالی کے مندر پہنچنے کا فیصلہ کرتا ہے جیسے ہی وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھتا ہے ایک بھاری جسم اس کے اوپر آ گرتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ادھر یہ بے خبر ان تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شگفتا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ یہ پتا تھا کہ گرو رائن شگفتا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شگفتا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے اگر وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو رائن تیرہ جاپ میں کامیاب ہو کر شگفتا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو رائن اور ششم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کاریکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو رائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شگفتا کو گھیر لیتے ہیں۔ شگفتا گرو رائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شگفتا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شگفتا گرتی پڑتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود ہیں۔ علاج، اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شگفتا کی دوست بن گئی ہے۔ شگفتا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی کئی رات گئے چپکے سے دو دو پہر نکل جاتا ہے۔ شگفتا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چمگادڑ کو ذبح کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چمگادڑ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔

اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے

"آپ کو سامری جی گرو رائن سے ہزاروں کوس دور ساتھیوں کو چھوڑنے والے اس علاقے میں چھوڑ گئے تھے، لہٰذا آپ کی شکتیاں تو بحال ہو چکی تھیں! آپ نے خود ہی استعمال نہیں کیں تو کسی کا کیا قصور؟"



چھنکار کی باتیں سن کر شگفتا کھل اٹھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔
مسلسل شکستوں سے اس کا وجود بکھرنے لگا تھا! جیون اسے کانٹوں کی باڑ نظر آنے لگا تھا۔ جب آگ سے جلے وجود کے ساتھ اس کی آنکھ ویرانے میں کھلی تھی تو یہ اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ چھنکار کو آواز دے کر دیکھتی یا اپنی شکتیوں کو آزماتی اس وقت تو اس کا ذہن کام نہ کررہا تھا۔ وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ جیون کا آخری دور شروع ہو چکا ہے! لیکن اب چھنکار کو دیکھ کر اس کی باتیں سن کر خواہشات کی چمک اس کی آنکھوں میں اُبھر آئی۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔ چھنکار کمرے کو اندر سے بند کردو۔ اس نے حکم دیا تو کھٹک پیدا ہوئی اور چٹخنی کمرے کے اندر سے خود ہی چڑھ گئی۔ اب شگفتا نے زوردار پھنکار ماری اسے اپنا جسم سکڑتے ہوئے محسوس ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ شیش ناگن بن چکی تھی۔ شیش ناگن بنتے ہی مارے خوشی کے وہ کمرے میں گھومنے لگی اور پھر دوسری بار پھنکار کے ساتھ ہی وہ چند لمحے پہلے والے عام سے لباس کی شگفتا بن گئی لیکن اس کا جسم اب ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ چل پھر سکتی تھی۔ شگفتا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔
''اوئے بدشکلے۔'' شگفتا چہک کر بولی۔ ''جی مالکن'' چھنکار کی سنسناتی آواز ابھری۔
''تو تو بڑے کام کی چیز ہے۔ آج تو نے میرے جیون میں پھر سے خوشیاں بھردی ہیں ارے!'' شگفتا نے آگے بڑھ کر چھنکار کے کراہت آمیز وجود کو بانہوں میں سمیٹنا چاہا، لیکن یہ کیا؟ شگفتا کی بانہیں ہوا میں لہرا کر رہ گئیں اور چھنکار کے جسم سے آر پار ہونے لگیں ارے! یہ...... '' شگفتا حیران رہ گئی۔
''بدشکلے تو تو ہوا کا بنا ہوا ہے۔ تیرا تو کوئی شریر ہی نہیں'' اور چھنکار ایسے ہنسنے لگا جیسے کسی دیگچی میں پتھر کے ٹکڑے ڈال کر ہلائے جائیں تو ان کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔
''شگفتا جی ہم تو صرف آپ کو ہی نظر آتے ہیں اور ہمارا شریر تو کالی شکتیوں کے ماننے والوں کے پاپ کی سڑاند سے جنم لیتا ہے۔''
''اچھا اچھا۔ بکواس نہ کر بدشکل۔'' شگفتا شوخی سے بولی۔ وہ اپنی شکتیوں کے دوبارہ حصول سے کھلی جارہی تھی۔ اس کا سہما سا خوفزدہ چہرہ جو مسلسل ناکامیوں سے کملا چکا تھا پھر خوشیوں کی آماجگاہ بننے لگا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔
''چھنکار یہ تو بتا کہ گروزمان اس وقت کہاں ہوگا؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی زبان میں لرزش نمایاں تھی اگلے وقتوں کے قصے اس کے دل و دماغ پر لہرانے لگے۔
''گروزمان وہیں کلکتہ میں ہے۔ بس اس سے زیادہ مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی آپ کچھ عرصہ اس علاقے سے باہر جانے کا وچار من سے نکال دیں!''
''سامری بچی کے بارے میں کچھ پتا لگتا ہے؟'' شگفتا کا دل ابھی تک دھک دھک کررہا تھا۔
''سمے کے گرداب میں پھنس کر منش ٹمسن گھیری بن جاتا ہے مالکن، وقت کی لہریں ہو سکتا ہے کبھی سامری کو آپ کے ساحل پر لا پھینکیں؟ آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کی شکتیاں آپ کو واپس مل چکی ہیں۔''
''ٹھیک ٹھیک۔'' باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شگفتا چونک گئی اور چھنکار کو دیکھنے لگی۔ تو چھنکار مسکراتے ہوئے بولا۔
''مالکن فکر نہ کریں آپ کے سوا نہ تو میں کسی کو نظر آتا ہوں اور نہ کوئی میری آواز سن سکتا ہے، زور سے بولیں کہ دروازہ کھلا ہے۔''
''کون ہے بھئی آجاؤ دروازہ تو کھلا ہے!''
ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازے کی کنڈی خود بخود بغیر کسی آواز کے کھل گئی اور باہر سے کسی نے ہلکا سا زور دیا تو دروازہ کھل گیا۔ آنے والی سندری تھی!
''تم کس سے باتیں کررہی تھی دیدی؟'' سندری حیرانگی سے بولی۔
''اپنے آپ سے۔'' شگفتا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔
شگفتا نے سندری اور اس کے گھر والوں کو اپنی فرضی آپ بیتی سنائی ہوئی تھی کہ وہ اپنے پتی کے ساتھ کہیں جارہی تھی

کہ راہزنوں نے انہیں لوٹ لیا اور پھر اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی مزاحمت پر اسے آگ لگا دی اور فرار ہو گئے اور اس نے بڑی مشکل سے آگ بجھائی اور اب تم لوگوں کی سیوا کا سے کچھ جلتے بھرنے کے قابل ہو رہی ہوں!

"کیوں ہر وقت بیتی یادوں کو یاد کر کے اپنا جی جلاتی ہو دیدی ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ اب تم یہیں رہ جاؤ میں نے تمہارے لیے ایک رشتہ دیکھ رکھا ہے۔" سندری مسکراتے ہوئے بولی!

"نہیں سندری اب مجھے وواہ نہیں کرنا۔ اگر تم لوگوں کو بوجھ لگی تو کسی مندر کی داسی بن کر جیون بتا دوں گی۔" شگفتلا سر جھکا کر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہیں بوجھ کیوں لگی ہو دیدی۔" سندری نے آگے بڑھ کر شگفتلا کو بانہوں کی والی میں قید کر لیا۔

☆......☆

بات آدھی سے زیادہ بھیگ چکی تھی! چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ سندری بھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ شگفتلا کھلی آنکھوں سے تنی چھت کی کڑیاں گن رہی تھی!

"مالکن آیئے چلیں۔" اچانک چنکاری کی آواز ابھری تو شگفتلا نے گردن موڑی۔

"کہاں؟"

آپ کئی دنوں سے پیاسی ہیں چنکاری پراسرار انداز میں مسکرایا۔ "میں نے سوچا کہ آپ کے تن اور من کو سیراب کر دوں۔" شگفتلا مسکرانے لگی اور پھر سندری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اس کو بے ہوش کر دیتے ہیں تاکہ اس کی آنکھ نہ کھلے۔" اور پھر تھوڑی دیر بعد سندری بے ہوش ہو گئی۔ چنکاری اور شگفتلا باہر نکل گئے۔

☆......☆

"دیدی۔ دیدی۔" سندری دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور رعب سے شگفتلا کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی! اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سینہ دھونکنی کی مانند پھول پچک رہا تھا۔

"کچھ سنا تم نے دیدی آج گاؤں کے کھیتوں سے شنکر کی لاش ملی ہے۔ اس کا خون کسی چڑیل نے پی لیا ہے؟" سندری خوف زدہ تھی۔ اس کی بات سن کر شگفتلا نے انتہائی معصومیت سے بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کون شنکر؟ کیا ہوا اس کو مجھے بھی بتاؤ؟"

"چوڑا چکلا جوان تھا شہر میں پڑھ رہا تھا رات کو وہ گاؤں چھٹی پر آ رہا تھا کہ زمیندار کلیان کے کھیتوں کے قریب کسی چھل پیری نے اس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا۔"

"اچھا......؟" شگفتلا نے آنکھوں کو پھیلا کر مصنوعی حیرت سے کہا اور پھر وہ خاصی دیر تک چڑیلوں اور بھوتوں کی باتیں کرتی رہیں۔

☆......☆

"میرا نام کروندیا ہے اساپ کے بل پر ناک رکھ کر سانس کھینچوں تو سانپ باہر آ جائے سارا جیون سانپوں سے کھیلتے گزرا ہے! شیش ناگ کے منکے جمع کرنا، کروندیا ناگ کو کچا کھا جاتا اور سو سال کی عمر کو پہنچ کر انسانی روپ اختیار کر لینے والے کسی سانپ کی تلاش میرے من بھاتے کھاجے ہیں۔"

یہ ایک چھوٹے قد کا کمزور اور وحشی سا سپیرا جوگی تھا۔ زرد رنگ کا چغہ، گلے میں حنوط شدہ سانپوں کی مالا اور ماتھے پر کنڈل ناگ کا چھوٹا سا نشان کانوں میں سانپوں کی شکل کی بالیاں پہنے اور لئے ہاتھ میں شیش ناگ کی شباہت والا عصا جس کے سہارے وہ چلتا تھا۔ تمام ہو کتا تھا سر کے بال گھنے اور چاندی کی طرح سفید عمر صدی سے اوپر لیکن آواز کڑک دار اور چال میں چستی نوجوانوں جیسی......

"جوگی بابا تم تو انسانی روپ میں آ جانے والے کسی سانپ کی تلاش میں بجری بن کر جنگلوں میں جانے والے تھے لیکن کمز باونڈ میں ہی ڈیرے ڈال لیے ہیں ابھی تو پہلا ہی پڑاؤ ہے۔ لیکن آج کئی دن ہو گئے ہیں تم ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہو۔" کروندیا کا چیلا جو سولہ سترہ سال کا خوب صورت لونڈا تھا! کروندیا کی مٹھی چاپی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"کروندیا جو دیکھ سکتا ہے عام آنکھ نہیں دیکھ سکتی، لونڈے تیرے جیسے تو وہ محسوس نہیں کر سکتے جو کروندیا سونگھ رہا ہے! مجھے اپنے آس پاس دائیں بائیں ناگوں کی ملکہ کی بو آ رہی ہے! میری منزل تو یہی گاؤں لگتا ہے!"

دونوں اس وقت قصبے کی اکلوتی سرائے رام چند کے ایک بوسیدہ کمرے میں بیٹھے تھے اور چیلا گرو کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ دونوں سات دن پہلے اپنے سفر پر نکلے تھے اور ایک قافلے کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ قافلہ ایک دن کھڑ ماؤنڈ میں قیام کے بعد آگے چل پڑا لیکن کروندیا استاد اپنے چیلے کے ساتھ یہیں ٹھہر گیا تھا۔ کروندیا غضب کا سپیرا تھا۔ سارا جیون سانپوں سے کھیلتے گزارا، زہریلے سے زہریلا سانپ بھی اس کے ہاتھوں میں آتے ہی رسی بن جاتا تھا۔ اس وقت بھی کمرے کے ایک کونے میں رکھی تین پٹاریوں سے سانپوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"جا لونڈے سرائے کی رسوئی سے قہوہ بنوا کے لا۔" کروندیا استاد نے اپنے لونڈے کو حکم دیا اور لونڈا اس کے سر پر مالش کے تیز تیز دو چار ہاتھ مار کے بوسیدہ سے کپڑے کے ساتھ ہاتھ پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا! تھوڑی ہی دیر میں لونڈا قہوہ کی چینک اور دو پیالیاں اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ کروندیا استاد اپنی تھوتھنی اٹھائے چاروں طرف گھوم گھوم کر کچھ سونگھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"کیا ہوا استاد۔" لونڈے نے چینک اور پیالیاں زمین پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

کروندیا اپنی منزل کے بہت قریب آ پہنچا ہے پتر کروندیا مشرق کی طرف سے کچھ سونگھتے ہوئے بولا۔

"چل آ میرے ساتھ۔" وہ اپنی بین اور پٹاری اٹھاتے ہوئے بولا۔

"استاد قہوہ تو پی لے۔" لونڈے نے قہوہ پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"بھاڑ میں گیا قہوہ......" کروندیا نے لات مار کر چینک زمین پر گراتے ہوئے کہا! "جلدی کر گیا وقت ہاتھ نہیں آتا سانپ نکل گیا تو لکیر پیٹنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ شیش ناگ کی بو سے میری ناک بجنا شروع ہو گئی ہے! کروندیا نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر قدم بڑھائے!"

لونڈے نے بھی اپنی بین اور پٹاری اٹھائی اور تیزی سے استاد کے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لپکا۔

☆......☆

مکھیا کے ہاں رہتے ہوئے دلاور کو ایک ماہ بیت چکا تھا۔ دلاور کے لیے یہ روپ نہایت اذیت ناک تھا۔ مکھیا اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ گو کہ وہ اس کی زرخرید لونڈی تھی مگر مکھیا کی داشتہ خاص ہونے کی بنا پر اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ زرق برق لباس میں وہ تمام دن حویلی میں پھرتا اور سر شام مکھیا اس کو اپنی خواب گاہ میں لے جاتا اور پھر اس کا جان لیوا سفر شروع ہو جاتا۔ دلاور نے کئی بار خودکشی کر لینے کا سوچا لیکن حرام موت مرنے کو وہ تیار نہ تھا اور اسے قدرت کی آزمائش جان کر دل مسوس کر رہ جاتا۔

اس نے جان لیا تھا کہ ساحر گوشاری اس کی سوچوں سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ اس عرصے میں دلاور کی ساری اکڑ فوں نکل گئی اور وہ دعا کرنے لگا کہ گوشاری کہیں سے آ جائے اور وہ اس کی بات مان لے تاکہ اس جان لیوا بیماری سے جان چھوٹے۔ ایک رات جانے کون سا وقت تھا کہ کمرے میں لگنے والی ایک ضرب سے بلبلا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک اور ضرب اس کے پہلو پر پڑی اور اسے اپنے ارد گرد چند سپاہی نظر آئے جنہوں نے کمر میں تلواریں لٹکا رکھی تھیں اور ہاتھوں میں ڈنڈے تھام رکھے تھے۔ یہ سب دلاور کے گرد دائرے میں کھڑے تھے اور دلاور کسی سڑک کے کنارے راہ گزر پر سویا ہوا تھا۔

"اجیت سنگھ ڈاکو......" ایک لمبا تڑنگا جوان کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "میلے کچیلے روپ میں رہ کر اور داڑھی بڑھا کر تم کیا سمجھتے ہو کہ سرکار کو دھوکہ دے سکو گے! امیت راج نے تجھے پاتال سے نکال کر کوتوال کے سامنے پیش کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

"چل اب اٹھ......" امیت راج ہاتھ میں پکڑی لاٹھی زور سے اس کی ٹانگوں پر مارتے ہوئے بولا۔ جس سے دلاور پھر بلبلا اٹھا۔ ایک لمحے میں اسے ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی کہ گوشاری نے اسے پھر ایک نیا روپ دے دیا ہے اور اس

مار اسے کسی مشہور ڈاکو کی شکل دے کر سپاہ کے ہاتھوں گرفتار بھی کروا دیا ہے۔

سپاہیوں نے پل بھر میں اسے کھڑا کر کے اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر مضبوطی سے کس دیے اور گلے میں چمڑے کا پٹہ ڈال دیا جس کے ساتھ مضبوط رسی بندھی تھی ایک سپاہی نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی رسی تھام لی اور باقی اپنے گھوڑوں پر اس کے پیچھے چل پڑے۔ افسر ڈاکو کو گرفتار کرنے پر بڑا خوش تھا اور بار بار طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی وقفے وقفے سے تفنناً گالی دے کر دلاور کی پشت پر برسا رہا تھا۔

دلاور اس اچانک افتاد سے خوفزدہ ہو چکا تھا ان سرکاری اہلکاروں نے اسے یقیناً کسی ڈاکو کی غلط فہمی میں گرفتار کیا تھا۔ اس نے بہت منت سماجت کی کہ میں امیت سنگھ نہیں ہوں اور نہ ہی ڈاکو ہوں مگر اس کی فریاد نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی تھی۔

امیت راج اس کو کوتوال لے گیا اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں لے جا کر ستون کے ساتھ باندھ دیا اور سلاخوں والے دروازوں پر تالا ڈال کر تمام سپاہیوں سمیت باہر نکل گیا۔ دلاور کی خوف سے گھگی بندھ چکی تھی اسے پورا یقین تھا کہ کوٹھاری اسے ذلالت کی حد تک زچ اور ذلیل و خوار کرنا چاہتا ہے۔ ایک عرصہ اس نے دلاور کو خوب صورت داشتہ کے روپ میں شرمسار کیا اور اب ایک ڈاکو کے روپ میں گرفتار کروا کر اس کی چمڑی ادھیڑنا چاہتا تھا تاکہ دلاور کو اپنی شکتیوں سے مرعوب کر سکے۔ دلاور ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی اور پھر تالا کھلنے کی آواز آئی۔

''دیکھیں جناب عالی علاقے کا مشہور ڈاکو امیت سنگھ جس نے عوام اور حکومت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں کو امیت راج نے کس طرح بے بس کر رکھا ہے۔''

امیت راج کچھ بڑے افسران کے ساتھ آیا تھا تاکہ اپنی فرض شناسی اور بہادری کا سکہ جما سکے۔

''اپنے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو تاکہ ہم ہاتھ نرم رکھیں، ورنہ میں کوئی لحاظ کیے بغیر ہڈیوں پر سے کھال علیحدہ کر دوں گا۔''

''ایک بارعب افسر نے دلاور کی گردن ناپتے ہوئے کہا تو دلاور کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ بھلا کس کا نام اور ٹھکانہ بتاتا لہٰذا اسے اپنی کھال اترنے کا یقین ہو گیا اور وہ دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرنے لگا کہ اب کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا، لیکن معجزہ نہ ہوا اور تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد اس افسر نے ایک سپاہی کو خدمت کرنے کا اشارہ کیا اور ستون سے بندھے دلاور پر پتلی چھڑی برسنا شروع ہو گئی! دلاور کی چیخیں کوٹھڑی میں گونجنے لگیں۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ خاصی ٹھکائی کے بعد افسر نے سپاہی کو رکنے کا اشارہ کیا اور پھر حکم دیا کہ اس کی رسیاں کھول دی جائیں اور پھر اس نے ایک قد آدم پنجرہ منگوایا اور دلاور کو اس میں قید کر کے باہر موٹا تالا لگا دیا گیا۔ اب چند سپاہیوں کی مدد سے پنجرہ کوتوالی کے صحن میں پانی کے حوض کے اندر رکھوا دیا۔ پانی جیسے ہی دلاور کے جسم تک پہنچا تو سردی کی ایک جان لیوا لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی، کیوں کہ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔

حوض کے باہر چند سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا گیا اور پھر تمام افراد اور امیت راج وہاں سے دور ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے اور دلاور کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے، کیوں کہ یخ پانی رگوں میں اس کا خون جمائے جا رہا تھا۔ دلاور سردی سے ٹھٹھرنا شروع ہو گیا اور پھر وہ ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

☆......☆

جسم کو گرمی پہنچی تو دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر وہ خالی ذہن اور خالی نظروں سے چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کو تمام واقعات یاد آنے لگے تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا کیا دیکھتا ہے کہ نہ پانی ہے اور نہ زنداں بلکہ وہ ایک کشادہ کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہے کمرہ نیم تاریک اور خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ دلاور نے سر گھما کر دیکھا تو کمرے میں ایک طرف آتشدان تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑیاں چٹخنے کی آواز کمرے کے نیم تاریک ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ اچانک دلاور کو احساس ہوا کہ کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے۔ اس نے تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے ایک آرام کرسی دکھائی دی، جس پر آدمی نیم دراز ہو کر جھولے لے رہا ہے۔ یہ کرسی آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہی تھی۔ پھر

اسے کسی کے سانسوں کی آواز محسوس ہوئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کرسی پر کوئی نادیدہ انسان بیٹھا ہوا ہے۔ یہ احساس اُبھرتے ہی ولاور کا رواں رواں کھڑا ہو گیا اور وہ خوف سے ہولے ہولے لرزنے لگا۔

"کک.....کون ہے۔" ولاور کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

"گھبراؤ نہیں پت۔ میں ہوں کوٹھاری۔" اور پھر کوٹھاری کا منحوس وجود کرسی پر آہستگی سے نمودار ہونے لگا۔ عالم غیب سے ظہور میں آنے کا یہ پراسرار منظر ولاور کے ماتھے پر قطرے لے آیا۔

"شکر کر۔ تجھے ٹھنڈے پانی سے نکال کر لے آیا ہوں ورنہ اب تک تو جم چکا ہوتا۔"

"کیوں لے آئے ہو مجھے کسی نئی پریشانی سے دوچار کرنے کے لیے..... مر جانے دیا ہوتا مجھے۔" ولاور پھٹ پڑا۔ "میں تو خوشی کی تلاش میں دُکھ کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے موت کی بانہوں میں ایک ہی بار سو جانے دو کوٹھاری میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" ولاور رو پڑا۔ اس کا توانا جسم حالات کی بھٹی میں کوئلہ بننا شروع ہو گیا تھا۔

کوٹھاری نہ چاہے تو موت بھی تجھے نہ آئے گی اور کوٹھاری کی مرضی ہو تو خوشیاں خود تجھے تلاش کریں گی!

"تت..... تم کیا چاہتے ہو۔" ولاور نگاہیں جھکا کر بے بسی سے ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولا۔

"کام میں نے تجھے بتایا ہوا ہے۔ کوٹھاری آنکھیں ولاور کے چہرے پر گاڑھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔"

"پر اس سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"مجھے" کوٹھاری ہنستے ہوئے بولا۔ ایک جن میرے قبضے میں آ جائے گا اور میرے تمام کام پل بھر میں کر دیا کرے گا اور وہی جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے عمل کے وقت میرے قریب ترین ہوگا اور تو بھی پھر کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرے گا۔

☆.....☆

پریہ رات کے وقت اپنی بیٹھک میں موجود تھی کہ ایک کنیز نے داخل ہو کر خسکران کی آمد کی اطلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر میں خسکران مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور تمام غلاموں کنیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پریہ نے گلے مل کر اس کا استقبال کیا۔

"آؤ خسکران بیٹھو۔ شگفتلا جی کے بعد تم ہی میرا واحد سہارا ہو۔"

"شگفتلا کے بارے میں ہی ایک خبر لایا ہوں پریہ رانی۔"

"تخلیہ....." پریہ نے تالی بجا کر کہا تو تمام غلام اور کنیزیں تیزی سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

"اب بتاؤ....." پریہ سرک کر خسکران کے قریب ہو کر اس کا ہاتھ پیار سے ہاتھوں میں لے کر کہتی ہوئی بولی۔

"شگفتلا دیوی یہاں سے ہزاروں کوس دور پنجاب کے شہر ٹیکسیلا کے ایک گاؤں کھڑ ماؤنڈ میں ہے! اسے ناگ دیوتا کی جانب سے سندیس ہے کہ وہ بھیرو رسگاؤں کی حدود سے باہر نکلی تو اس کے جیون کو سخت خطرہ ہوگا۔"

"تم اس سے ملے ہو۔" پریہ کو اپنی گھبراہٹ کا خطرہ تھا۔

"میں اس گاؤں تک گیا ہوں مگر باوجود اپنی شکتیوں کے میں گاؤں کی حدود کے اندر داخل نہیں ہو پاتا ہوں۔ وہاں جا کر میں بے بس ہو گیا تھا اور اس بات کی کوئی وجہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے البتہ ہمارے عقلمندوں نے بتایا ہے کہ ٹیکسیلا نامی گاؤں کو پوجنے والی سرزمین ہے وہاں نادیدہ مخلوق نہیں جا سکتی۔"

"تو پھر انتظار کرنا ہے۔ خسکران ہمیں ابھی کسی شبھ گھڑی کا۔" پریہ اپنی مسرت چھپاتے ہوئے بولی۔

☆.....☆

پریہ خسکران اور بلرام دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی! شگفتلا پر مصائب کی خبریں اس کے لیے خوشی کا پیغام تھیں اسے یقین ہو گیا تھا کہ بری طرح پھنس چکی ہے اور اس کے لیے جلدی جلدی تابانہ واپسی کے امکانات نہیں ہیں لہٰذا پریہ اقتدار پر اپنی گرفت روز بروز مضبوط سے مضبوط کرتی جا رہی تھی!

اپنی مرضی کے نئے آدمی مختلف عہدوں پر مقرر کر رہی تھی جو اس سے ڈرتے ہوں اور اس کے وفادار بھی ہوں۔ سرکاری عہدوں پر جلدی جلدی تبادلے اور نئی بھرتیاں کرتی تا کہ کوئی شخص زیادہ اختیار والا نہ ہو۔ محل کے اندر تمام سپاہی اور

فوجی اہلکاروں کو نکال کر نئے تعینات کیے گئے۔ تمام منڈیوں اور تاجروں سے سو کے قریب کنیزیں اور محل کی ضرورت کے مطابق غلام خرید کر محل کے ایک بہت بڑے اور الگ تھلگ کمرے میں جمع کر لیے گئے۔ انہیں دو دن تک مکمل بھوکا پیاسا رکھا گیا جس سے کئی کمزور بھوک پیاس سے مر گئے۔

پھر ایک دن ان سے کہنے لگی۔ "سنو آج سے تم لوگوں کو میں معاف کرتی ہوں اور تم سب کو اب شاہی محل میں رہنا ہوگا اچھے کپڑے اور کھانے کو بہترین چیزیں ملیں گی۔ لیکن اگر کوئی غداری کی یا محل کی کوئی خبر باہر گئی یا کوئی غلطی کی تو سزا موت ہوگی اور موت بھی تمہیں آہستہ آہستہ تڑپ تڑپ کر ملے گی لہٰذا محل کے باہر سے آنے والے تمام سرکاری اہلکاروں، مہمانوں یا کسی بھی شخص کے سامنے تم نے زبان نہیں کھولنی اور ہمیشہ سات فرشی سلام اور قدموں کو چھو کر حاضر ہونا ہوگا ورنہ تم مجھ سے واقف تو ہو گئے ہو میں جتنی خوب صورت اور معصوم نظر آتی ہوں فطرتاً اس سے بالکل مختلف ہوں تڑپتے انسانی جسم خون کے اڑتے چھینٹے اور موت کی کربناک چیخیں میرے من بھاتے کھاجے ہیں انسانی جان میرے سامنے نالی کے کیڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی میرے ہر حکم پر کتے کی طرح دم ہلاتا ہوگی میرے نزدیک تمہاری وقعت اس سے زیادہ ہے بھی نہیں۔"

☆......☆

اب پریہ مکمل طور پر تابانہ کی مطلق العنان ملکہ بن چکی تھی!

خسکران شگفتلا کی یاد میں بے حال ہو کر اس کی تلاش میں ایک دن نکلا تو پھر واپس نہ آیا۔

اس بات کو بھی خاصا وقت ہو گیا تھا۔ پریہ اب خسکران کو بھی بھولنے لگی تھی!!

خسکران کی عدم موجودگی میں پریہ جان گئی تھی کہ اب کوئی بھی مرد شاہی ان کے ہاتھ میں نہیں۔ لہٰذا اب تمام تر دارومدار اس کی اپنی عیاری و چالاکی پر ہے اور اس سلسلے میں دنیا کے کسی شخص و عورت کو قابل اعتبار نہ سمجھتی تھی۔ تابانہ کو اس نے چھوٹی چھوٹی انتظامی تحصیلوں میں بانٹ دیا تھا اور ہر حصے پر اپنے نائب کے طور پر ایک ایک عورت مقرر کر دی تھی، جو راجکماری کہلاتی تھی! کیوں کہ اس کے خیال میں مرد تعلقات، عقل اور جسمانی طاقت میں عورت سے بہتر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنی ریاست میں مردوں کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اسے پتا تھا کہ یہ کام آہستہ آہستہ کرنا ہے! تاکہ مردوں کو ہوش آئے تو وہ دوسرے درجے کی مخلوق بن چکے ہوں۔

اس مقصد کے لیے اس نے شاہی دربار کے ساتھ ساتھ دیگر محکموں میں بھی ایک ایک کر کے مردوں کو ہٹا کر عورتیں آگے لانا شروع کر دیں، پھر کچھ عرصے بعد ہر لڑکی کے لیے فوجی تربیت لازمی کر دی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ حرب و ضرب کے شعبے میں بھی خواتین کو عہدے ملنے لگے۔ آہستہ آہستہ پوری ریاست تابانہ میں، ہر کلیدی عہدے پر بوڑھی جوان اور نو عمر خواتین کا قبضہ ہو چکا تھا شاہی دربار میں بھی مرد خال خال ہی رہ گئے تھے، جن میں بلگرام نمایاں تھا۔ بلگرام بھی اس تبدیلی پر چونکے بغیر نہ رہ سکا اور ایک دن ملکہ عالیہ کے کمرۂ خاص میں آیا تو بولا۔

"ملکہ عالیہ...... دربار میں عورتیں بہت زیادہ ہیں، کیا یہ مناسب ہے؟" اس کا یہ سوال پریہ کو چبھتا ہوا محسوس ہوا۔

"بلگرام جب تک شگفتلا ہی نہیں آ جاتیں میں ملکہ ہوں اور یہ بات میرے دائرہ اختیار میں آتی ہے۔" پریہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی بہتر......" بلگرام مزید کچھ بھی نہ بول سکا۔

لیکن پریہ نے سوچ لیا کہ بلگرام کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے! اس کو اب راستے سے ہٹا دینا چاہیے اور اس بات میں دیر کرنا پریہ نے مناسب نہ جانا اور اسی رات کو اپنے ارادے پر عمل کر ڈالا۔

رات کو خفیہ طور پر بلگرام کو خواب گاہ میں بلا بھیجا۔ بلگرام خوشی خوشی چلا آیا۔ پریہ نے اسے بے ہوشی کی دوا پلا کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ بلگرام پردھان منتری کے ساتھ سپہ سالار بھی تھا۔ لہٰذا پریہ نے فوجی بغاوت کے خوف سے فوجیوں کے بجائے ایک کنیز اور غلام کی مدد سے اس کی مشکیں کسوا کر ایک تہہ خانے میں پنجرے کے اندر بند کروا دیا۔

اور دوسرے دن بلگرام کی گمشدگی کا اعلان کر دیا گیا جبکہ صبح سویرے غلام اور کنیز کو بلا کر ایک بڑے کے حبشی جلاد کے ہاتھوں ان کا گلا گھونٹ کر مروا دیا۔

اور اسی دوپہر بھرے دربار میں حبشی غلام پر سنگین الزام عائد کر کے فوری طور پر اس کا سر قلم کروا دیا تمام درباری ایسی سزائیں روزانہ دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے! کئی دنوں تک بلگرام کا کسی کو کچھ پتا نہ چلا جبکہ پریہ روزانہ دربار میں آ کر پہلا سوال ہی یہ کرتی کہ بلگرام کا کچھ پتا چلا؟ اور پھر گرد و نواح میں اس کی تلاش کے لیے ہرکارے دوڑاتی۔ اس سے وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ بلگرام کے لیے کتنی پریشان ہے! اس دوران بلگرام تہہ خانے میں بھوک اور پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے بسی کی موت مارا گیا۔ اس دوران پریہ تہہ خانے میں جا کر بلگرام کی بو چھوڑتی لاش دیکھ کر اس کی موت کی تسلی کر آئی تھی اور لاش کے اوپر چونا ڈلوا دیا اور اس کے اوپر والے کمرے کو مضبوط تالے لگا دیے گئے تاکہ وہ اندر ہی گل سڑ کر ختم ہو جائے اور لاش نکالی بھی جائے تو شناخت ممکن نہ ہو۔

اس تمام عمل پر پریہ مطمئن اور مسرور تھی۔ اب یہ نسلاً کنیز ایک مضبوط حکمران بن چکی تھی۔ سپہ سالار کا عہدہ اس نے عارضی طور پر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ تاہم آبانہ کے دس حصوں کے لیے اس نے دس علیحدہ علیحدہ فوجی کمان دار مقرر کر دیے اور یہ تمام براہ راست پریہ کے ماتحت تھے! اس کے علاوہ ہر تحصیل میں شاہی فوج کے دستے بھی تھے۔ جو مقامی راجکماری اور فوجی کمانداروں کو جوابدہ نہ تھے۔ بلکہ ان کی راسیں پریہ کے ہاتھ میں تھیں! اب پریہ تاباد پر اپنے پنجے مکمل طور پر گاڑھ چکی تھی! ہر تحصیل کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کا کچھ حصہ دار الحکومت کو لگتا تھا۔ ان اقدامات کے بعد پریہ نے ہر تحصیل کا دورہ کرنا شروع کیا اور پہلی تحصیل کی طرف پورے لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

رات خاصی جا چکی تھی۔ شگفتلا چارپائی پر لیٹی ماضی حال اور مستقبل کے تانے بانے بن رہی تھی سندری پاس ہی بے خبر سو رہی تھی۔ یہ لڑکی شگفتلا کو پسند آئی تھی کیوں کہ یہ شگفتلا کی بے غرض خدمت داری کر رہی تھی!

شگفتلا سوچ رہی تھی کہ یہاں سے جب بھی جاؤں گی۔ سندری کو کوئی ایسا تحفہ دے جاؤں گی، جو اسے مالا مال بھی کر دے اور شگفتلا کی یاد بھی دلاتا رہے!

اچانک اسے باہر کھٹکا محسوس ہوا۔

"چنکارا" شگفتلا نے ہولے سے پکارا۔

"جی مالکن.......؟"

"دیکھو باہر کیا ہے؟"

مالکن چند ساعت روپوشی کے بعد چنکارا نے حاضر ہو کر کہا!

سندری کا بھائی گگن دبے پاؤں باہر جا رہا تھا کہ پائل کے قطرے کو اس کے پاؤں کی ٹھوکر لگی ہے۔

"گگن......" شگفتلا زیر لب بولی۔ "چنکارا آؤ دیکھیں یہ کہاں جاتا ہے!"

یہ بدھا کے سٹوپے کی طرف جائے گا۔ جہاں ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اس کو اپنے حسن کے جال میں قید کر چکی ہے اور ہر رات۔ اس سے اپنے جسمانی تقاضے بھی پوری کرتی ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے روزانہ اس کا خون چوستی ہے۔

"لیکن چڑیلیں تو مکمل بری ہوتی ہیں چنکارا کیا گگن اس کے پاؤں دیکھ کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا۔"

"نہیں مالکن اس چڑیل نے انتہائی خوب صورت اور بھاری بھر کم دھرتی چھوتا لباس پہن رکھا ہوتا ہے اور خلوت کے وقت مکمل اندھیرا کر دیتی ہے! جس کی وجہ سے گگن کچھ سمجھ نہیں پاتا اور وہ اس کی صورت کا غلام بن کر اپنا آپ موت کے حوالے کر رہا ہے۔"

یہ اچھا نہیں اور ہم اس کو چڑیل کے شکنجے سے بچاؤ۔

"نہیں مالکن۔ ماورائی شکتیوں سے مڈبھیڑ کرنے سے پرہیز کیا کرو۔ یہ تمہارے اپنے ہیں۔"

"مگن کے گھر والوں کا مجھ پر بہت احسان ہے چنکار۔" شکنتلا نے زور دیا۔

"لیکن تم تو سانپ ہو ناگن اور سانپ کو جتنا بھی دودھ پلایا جائے چاہے آستین میں پالا جائے وہ تو پھر ڈستا ہے۔ تمہیں سندری اور مگن سے ہمدردی کیوں ہے۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں چنکار میں تمہیں وضاحت پیش کرنے کی پابند نہیں بلکہ تو میرا غلام ہے بدشکلے۔"

"پھر تم اکیلی ہی چلی جاؤ ناگن تمہاری شکتیاں اس چڑیل کے لیے کافی ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔" شکنتلا فیصلہ کن لہجہ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ میں تمہیں بدھا کے ستوپے تک لے چلوں۔" یہ کہہ کر چنکار نے اچھل کر شکنتلا کا ہاتھ پکڑا تو پلک جھپکنے میں منظر تبدیل ہو گیا..... مگن اپنے سے کچھ دور شکنتلا کو ایک کھنڈر نما عمارت کی سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا۔" چنکار غائب ہو چکا تھا۔"

شکنتلا گہری سانس لے کر مگن کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی! عمارت تک آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا تو گھپ اندھیرا چھایا تھا۔ ناگن ہونے کے ناتے اسے اندھیرے میں ہر چیز دکھائی دے رہی تھی۔ گو اندھیرا اسے بھی محسوس ہوتا تھا لیکن اتنا نہیں کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ مہاتما بدھا کے چھوٹے چھوٹے بت دروازوں حالت میں بنے تھے کہیں شیر اور کہیں عقاب کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ایک کشادہ راہداری تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ انتہائی خستہ تھی، جا بجا مکڑیوں کے جالے اور گرد و غبار سے اٹی تھی۔ شکنتلا کو مگن کہیں نظر نہ آیا شکنتلا اس وقت ایک عام سی دیہاتی عورت کے روپ میں تھی۔ وہ راہداریوں میں تیزی سے چلنے لگی۔ دائیں بائیں کمرے بنے تھے وہ ہر کمرے میں جھانکتی لیکن ویرانی اور اندھیرے کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا۔ اچانک ایک کمرے سے اسے لڑکی کی کھنکتی ہنسی سنائی دی وہ ٹھٹھک گئی کمرے کا چونکہ دروازہ نہ تھا۔ لہٰذا شکنتلا چھپے ہی دروازے والی جگہ پہ آ گئی حیران رہ گئی۔ یہ کمرہ انتہائی آراستہ و پیراستہ تھا۔ قالین، پلنگ، کرسیاں، سامان اور حد درجہ صفائی دکھائی دی۔ سامنے ہی پلنگ پر اسے دو جسم یکجا دکھائی دیے۔ یقیناً ایک چڑیل اور دوسرا مگن ہے۔ شکنتلا نے سوچا اور آہستگی سے دروازے سے اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی!

چڑیل لڑکی کے روپ میں مگن سے مصروف تھی۔ اس لیے ان کی نظر شکنتلا کو نہ دیکھ پائی شکنتلا کے لیے ایک ایک دلچسپی سے بھرپور منظر تھا۔ اس کے جذبات کا ناگ پھن اٹھانے لگا۔ اس کے جسم کے اندر بے چینی شروع ہوئی لیکن یہ وقت ہوش کا تھا جوش کا نہیں۔ یہ سوچتے ہی شکنتلا پرسکون ہوتی چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں مگن بے سدھ ہو گیا اور گہری نیند اس پر چھا گئی تو لڑکی نے سر اٹھایا تو شکنتلا نے دیکھا کہ یہ ایک متناسب جسم والی خوب صورت دوشیزہ کا روپ تھا۔ جو سر تا پا پھولوں کا گجرا لگی تھی، مگن کو دیوانہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن جلد ہی اس کا حسن خوفناکیت میں ڈھلنے لگا۔ لڑکی کے ناخن باہر نکلنے لگے! اس کی خوب صورت سلیقے سے بندھی بالوں کی چوٹی کی گرہیں خود بخود کھلنے لگیں، اور تمام بال آسمان کی طرف کھڑے ہو گئے اور ان سے بدبو دار غلول کرنا شروع ہو گیا! حسین عارض سیاہ سلوٹ دار ہو گئے۔

موتیوں جیسے دانت پیلے پڑ گئے اور دو بڑے دانت آگے کو نکل آئے۔ قد بڑھنے لگا اور وہ خون پینے کی نیت سے مگن کی گردن پر جھکنے لگی۔ شکنتلا پر اس کی نظریں نہیں پڑی تھیں اور ادھر شکنتلا کو بھی شاید اسی لمحے کا انتظار تھا۔ کوئی عام عورت ہوتی تو مارے خوف کے دم توڑ جاتی لیکن شکنتلا کے لیے یہ سب کچھ ایک معمولی ناٹک سے زیادہ نہ تھا۔ اس سے قبل کہ چڑیل اپنے ڈریکولا نما دانت مگن کی گردن کی رگ پر رکھ دیتی۔ شکنتلا نے مداخلت کر دی۔

"اس خون میں میرا حصہ بھی تو ہونا چاہیے چھل پیری دیدی۔" شکنتلا نے خود کو پرسکون و ساکت رکھتے ہوئے کہا تو چڑیل بری طرح چونکی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر شکنتلا پر پڑی تو اس نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی اور پھر اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور وہ اڑتی ہوئی شکنتلا کی طرف آئی تو شکنتلا نے کالی دیوی کا شبد جاپ پڑھ کر فوراً اس کی طرف پھونک ماری تو چڑیل کو آگ لگ گئی اور وہ بری طرح تڑپنے لگی۔ اس کے تڑپنے سے ایک زلزلہ برپا ہو گیا لیکن یہ سب کچھ عارضی لمحات تھے اور تھوڑی ہی دیر بعد فرش پر چڑیل کے جلتے ہوئے اعضاء سے دھواں نکلنے کے سوا کچھ نہ بچا۔

شگفتہ کا من جھوم رہا تھا، وہ سوچنے لگی کہ ابھی میرا دور ختم نہیں ہوا، ابھی میری شکتیاں لامحدود ہیں، ناگ دیوتا اور کالی دیوی مجھے پھر عروج دیں گے۔ کیا ہوا جو میں عارضی طور پر روپوش ہونے پر مجبور ہوگئی ہوں۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر مگن پر پڑی جو کسمسا رہا تھا، چڑیل کی چیخوں سے اس کی آنکھ نہ کھلی تھی۔ وہ چیخیں شاید صرف شگفتہ نے سنی تھیں! شگفتہ کا جی خون کے لیے پھر للچانے لگا لیکن یہ مجھ پر احسان کرنے والے کنبے کا فرد ہے اس کے اندر آواز ابھری لیکن مگن کی شہ رگ اور موٹی گردن کے اندر خون کا سمندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ خون انسانی خون، خون کا خیال آتے ہی شگفتہ کی انسانیت ناگن کا لبادہ اوڑھنے لگی، جوان مرد کی قربت کا لذت آمیز تصور اور انسانی خون سے پیاس بجھانے کا مسحور کن خیال دل میں سجائے شگفتہ کے قدم بے خودی سے فرش پر آڑے ترچھے پڑتے ہوئے۔ مگن کی سمت بڑھنے لگے کہ رات کے اس سناٹے میں شگفتہ کو کہیں دور سے بین کی سریلی آواز سنائی دی آواز سن کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی لیکن پھر مگن کی طرف بڑھنے لگی مگن کی کسمساہٹ اب تیز ہونے لگی شگفتہ پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی اور مگن کو شہوت انگیز نگاہوں سے تکنے لگی بین کی آواز قدرے نمایاں ہوئی، جسے سن کر شگفتہ کا خیال پھر بھٹکا لیکن اب بھی اس نے زیادہ توجہ نہ دی اور اپنا لبادہ الگ کرنے لگی تھوڑی ہی دیر میں وہ کیف و سرور کی وادیوں میں اٹھکیلیاں کرنے لگی، مگن اب پوری طرح ہوش میں آ کر شگفتہ کو پہچان چکا تھا تھوڑا جھجکا لیکن شگفتہ کے حسن اور نشیب و فراز اور وارفتگی نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دی، اور وہ کھلتے کھلتے کھلتا گیا۔ اب شگفتہ کو وہ حیرانی سے تکے جا رہا تھا، لیکن شگفتہ اب آہستگی سے اس کی شہ رگ کی طرف جھکے جا رہی تھی کہ اچانک شگفتہ پر مدہوشی چھانے لگی اس کے حواس گم ہو رہے تھے اس نے زور سے سر جھٹکا لیکن بین کی تیز آواز اور سریلی لے اس کے حواس گم کر رہی تھی اب شگفتہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی تیزی سے بج اٹھی وہ مگن کی شہ رگ کو بھول گئی اسے احساس ہو گیا کہ کوئی بے پناہ مہارت رکھنے والا سپیرا بین بجا کر اس کے ہوش گنوا دینا چاہتا ہے، وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"تم فوراً گھر چلے جاؤ مگن۔" شگفتہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"پر تم یہاں کیسے پہنچیں شگفتہ۔" مگن کو اب یاد آیا کہ یہ گھر سے اس جگہ کیسے آ گئی؟

"پہلے اس طرف دیکھو" شگفتہ نے چڑیل کا جلا ہوا ڈھانچہ دکھایا۔ "یہ کیا ہے۔" مگن حیرانی سے بولا۔

"یہ وہ چڑیل ہے جو تمہارا خون چوس رہی تھی اور تم نوجوان حسینہ سمجھ کر ہر شب ان کھنڈروں میں اس سے خلوت کرتے تھے۔"

"ہیں؟ لیکن؟ مگر؟"

"اگر مگر لیکن ویکن چونکہ چنانچہ یہ باتیں چھوڑو اور فوراً یہاں سے گھر چلے جاؤ۔ باقی باتیں میں تمہیں وہیں بتاؤں گی۔"

"تم بھی میرے ساتھ چلو، کیا ایسے آدھی رات کو گھر جاؤ گی!"

"جیسے یہاں پہنچ گئی ہوں ویسے ہی گھر بھی آ جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر شگفتہ دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل کر کھنڈرات کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

☆.....☆

کروندیا مسلسل بین بجا رہا تھا اور چیلا اپنی بین کی مدد سے اس کی سنگت میں مصروف تھا وہ پہر سے آدھی رات کا عمل شروع ہو چکا تھا اور ان ویران پہاڑیوں کے آس پاس اسے شیش ناگن کی بو محسوس ہو رہی تھی، لیکن اب اس کی بو کی شدت میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔ کروندیا کا جوش بھی کامیابی کے ان دیکھے تصور کے سامنے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اب یہ بو اسے کہیں قریب سے محسوس ہونے لگی اسی اثناء میں کروندیا کو اپنے دائیں طرف تھوڑی ہی دور پہاڑ کی چوٹی پر بنی کسی عمارت کے کھنڈرات دکھائی دیے اور اس وقت وہ بری طرح چونک پڑا جب اس نے دیکھا کہ سینکڑوں چھوٹے موٹے مختلف نسل کے سانپ ان سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے یہ منظر دیکھ کر کروندیا کی بین بجنا بند ہو گئی جبکہ چیلا بدستور دھنیں بکھیرتا رہا۔ لیکن گرو کی کسی خاص سمت پر محویت کو محسوس کر کے چیلے نے گرو کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو اس کے ہاتھوں

کے طوطے اڑ گئے!!

سانپوں کا ایک جم غفیر تھا کہ پہاڑی پر بنی عمارت سے نکل نکل کر نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ تو گرو چیلا کی بولتی بند ہو گئی دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی نظروں میں خوف نظر آ گیا۔ گرو ونڈیا نے ایک دفعہ پھر پہاڑی کی طرف دیکھا تو اسے ان گنت سانپوں کا جلوس پہاڑی پر بنائی گئی سیڑھیوں سے اتر کر اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔۔۔۔
اور۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ دونوں آبادی کی طرف منہ کر کے سرپٹ بھاگنے لگے۔

☆۔۔۔۔☆

شکنتلا کھنڈرات کی بھول بھلیوں میں بدحواس ہو کر بھاگے جا رہی تھی۔ بین کی آواز اس کے اعصاب کو شل کرنے کے درپے تھی۔ وہ بار بار سر کو جھٹک کر اپنے ہوش قائم رکھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چھنکار چھنکار کی صدائیں لگا رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ کوئی طاقت پھر اس کو زیر کرنا چاہتی ہے! چھنکار ہی وہ واحد شکتی شکنتلا کے پاس تھی جو اس مصیبت سے اس کی خلاصی کرا لیتی۔ لیکن چھنکار تو ایسے غائب تھا جیسے برے وقتوں میں دوست غائب ہوتے ہیں۔ اب شکنتلا تھک چکی تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑی ہو گئی ہے۔ یہاں اسے ایک کونے میں مہاتما بدھ کا بت نظر آیا جس کی ناف کی جگہ پر سوراخ تھا۔ قریب ہی سنسکرت میں کوئی مختصر تحریر لکھی تھی۔ شکنتلا نے جیسے ہی تحریر پر طائرانہ نگاہ ڈالی تو اچھل پڑی۔ کیوں کہ یہ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ حالاں کہ شکنتلا سنسکرت نہ جانتی تھی لکھا تھا کہ اگر آپ من کی مراد پانا چاہتے ہیں تو مہاتما بدھ کے پیٹ پر بنے ہوئے سوراخ میں درمیانی انگلی ڈال کر گھمائیں اور اپنی خواہش کو زیر لب دہرائیں۔ شکنتلا جو ہندومت سے تعلق رکھتی تھی نے فوراً ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق درمیانی انگلی ڈال کر بین کی آواز اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا خیال من میں لائی تو اسے فوراً ہی اپنے پیروں میں مانوس سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دیکھا تو یہ ایک بالکل سفید سانپ تھا جو اپنی زبان میں اس سے مخاطب تھا۔ شکنتلا کے دماغ نے سانپ سے نکلنے والی لہریں بولیاں میں ڈھال دیا تھا۔

"اے سانپوں کی ملکہ، اے ناگن دیوی۔۔۔۔ تو اوش چھٹکارا پائے گی۔ یہ تیسیا کی بستی کھنڈر ہے یہاں ناگوں کو پوجا جاتا ہے تو ناگوں کی دیوی کو کوئی پائل کیسے کرے گا تو شانت ہو جا اور عمارت سے نکل کر پہاڑی کی چوٹی تک آنے والی سیڑھیوں پر پہنچ کر تماشا دیکھ۔"

شکنتلا جب بدھا کے کھنڈرات کی ان سیڑھیوں تک پہنچی جو چوٹی سے نیچے تک جا رہی تھیں تو اسے ان سیکڑوں سیڑھیوں پر ہزاروں سانپ پھنکاریں مارتے نیچے جاتے دکھائی دیے جو پتا نہیں کہاں کہاں سے نکل کر آ رہے تھے۔ جہاں شکنتلا کھڑی تھی اس کے پیروں کے دائیں بائیں اور درمیان سے بھی بے حساب سانپ نیچے اتر رہے تھے۔ ادھر شکنتلا کو دو سپیرے اندھا دھند بھاگتے ہوئے دکھائی دیے!!

یہ منظر دیکھ کر شکنتلا کے ہونٹوں پر ایک کراہت رینگ گئی۔

☆۔۔۔۔☆

گرو ونڈیا اور اس کا چیلا شرما ہانپتے کانپتے سرائے رام چند پہنچ گئے اور اپنی کوٹھڑی میں گھستے ہی فرش پر لیٹ کر تیز تیز سانسیں لینے لگے۔

"شرما جلدی اٹھو کر تمام درزیں اور سوراخ بند کر دو کہیں سانپ پیچھے ہی نہ آ جائیں۔" گرو ونڈیا کی آواز میں لرزش تھی۔

"جوگی بابا تم سپیروں کے مہاتما ہو، پھر یہ خوف کیسا۔" شرما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پتر لوبے۔" گرو ونڈیا جو اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ "یہ عام سانپ نہیں سانپوں کا بادشاہ ہے۔ جسے میں غلام بنانے جا رہا ہوں گرو ونڈیا کی تپسیا اپنی جگہ لیکن ناگ بادشاہ کی شکتی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ چیز نہیں جسے ہم انگلیوں سے اٹھا کر پٹاری میں بند کر لیں گے! اور ایک بات اوش یاد رکھنا۔ اس ناگ کو قابو کرنے کی کوشش میں جان بھی جا سکتی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہو تو اب بھی سمے ہے کر لوٹ جاؤ۔"

"نہیں جوگی بابا" شرما اس کے چرن چھوتے ہوئے بولا۔

"شرما بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑنے کا چاہے اس کوشش میں میری ارتھی اٹھ جائے۔ لیکن بابا ناگ بادشاہ کو قابو کرنے کا کیا فائدہ ہے؟"

"فائدہ...... ہاہاہا...... اوئے باؤلے...... انسانی روپ اختیار کرنے والے ناگ عام سانپ نہیں ہوتے۔ یہ شیش ناگ کی ایک نایاب نسل ہے۔ یہ سانپ ہی ہزاروں کا ہوتا ہے اور اس کا منکا آدمی کو لاکھ پتی بنا سکتا ہے اور انسانی روپ اختیار کر لینے والا شیش ناگ کروڑوں سانپوں میں کوئی ایک ہوتا ہے جو ہزاروں سال میں ایک آدھ ہی ملتا ہے۔ یہ روپ دھارن ہوتا ہے۔ ہر جاندار کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہ دھرتی کی تہوں میں چھپے خزانوں کا پتا بتا کر اپنے مالک کو دھرتی کا سب سے امیر آدمی بنا دیتا ہے اور تمام سانپ بھی اس کے غلام ہوتے ہیں۔"

"لیکن گرو جی کیا شیش ناگ کے علاوہ کوئی سانپ روپ دھارن نہیں ہو سکتا...؟"

"ہاں ایک اور سانپوں کی نسل اچھیا دھاری ناگ کی ہوتی ہے۔ یہ بھی سو سال کی تپسیا کے بعد روپ دھارن بن جاتا ہے۔ اس نسل کو...... چھتن چھراپ کہا جاتا ہے۔"

"پرنتو آپ کی وچار کے مطابق جس روپ دھارن سانپ کی بو آپ نے محسوس کی ہے یہ شیش ناگ ہے یا اچھیا دھاری؟"

"یہ تو بالکل شیش ناگ کی بو ہے۔ لیکن بزرگوں سے سنا ہے کہ کھنڈ ماڈھ کے آس پاس ایک اچھیا دھاری ناگوں کا جوڑا بھی روپ دھارن رہتا ہے!"

"لیکن جوگی بابا کیا کبھی کوئی سپیرا ایسے کسی ناگ کو پٹاری کے اندر بند کرنے میں سپھل ہوا ہے؟"

"ہاں...... " کروڈیا نے اپنی پٹاری سے ایک اچھیا دھاری سانپ جو پتلا اور لمبا تھا کو نکال کر اس پر آنکھیں جما کر کہا۔

"سینہ بہ سینہ سنتے آئے ہیں لیکن ایسا کوئی شخص مجھے نہیں ملا اور نہ ہی ایسے شخص کا قصہ سنانے والے نے کسی ایسے آدمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ پرنتو...... کروڈیا نے یہ کام کرنے کی سوگند کھا رکھی ہے!"

"کروڈیا استاد شرما تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔" چیلے نے جوگی کے کچے فرش پر ٹانگیں پسارتے ہوئے کہا۔

"پرنتو اب بات آگے کیسے بڑھے گی۔ اچھیا دھاری اور شیش ناگ کے روپ دھارن سانپوں کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے اور قابو کرنے کا کوئی خاص عمل بھی ہے جبکہ آج پہلی کوشش میں ہی ہمیں اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا ہے۔"

"آج کی بات چھوڑو باؤلے! اب اماوس اور پورن ماشی کی بات کرو۔"

"کیوں کہ پورن ماشی کی رات اچھیا دھاری روپ دھارن سانپوں کی جوڑی انسانی روپ دھار کر چاندنی رات میں اٹھکیلیاں اور ناگ دیوتا کی پوجا پاٹ کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح شیش ناگ کی کوئی جوڑی اگر روپ دھارن بن چکی ہے تو وہ بھی اماوس کی کالی رات کسی سانپوں بھرے جنگل کی کھلی جگہ پر آ جاتی ہے اور شیش ناگ دیپ منی (منکا) اپنے منہ سے نکال کر باہر رکھ دیتا ہے اور اس کی چکا چوند روشنی میں شیش ناگوں کا جوڑا مست ہو کر رقص کرتا ہے۔ صرف یہی وہ سمے ہوتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص انہیں دیکھ سکتا ہے جس پر سانپ کا زہر اثر نہ کر رہا ہو!!"

کیوں کہ روپ دھارن کے رقص کے وقت ہزاروں سانپ ان کی رکھشا کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ان کے گرد دور دور تک گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

"لیکن کروڈیا استاد یہ کیونکر ممکن ہے کوئی انسان ان ہزاروں زہریلے سانپوں کے زہر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو۔"

"ممکن ہے...... لونڈے...... کروڈیا کے لیے ممکن ہے۔"

"ہمارے پاس نسل در نسل بزرگوں کا ایک ایسا خزانہ ہے جو ہمیں ہر سانپ اور اس کے زہر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔"

"خزانہ......؟" شرما منہ کھول کر بولا۔

"ہاں اسے خزانہ ہی سمجھو۔" کروڈیا فخریہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔

"مختلف نسلوں کے ایک ہزار ایک سانپوں کو مار کر اور پھر انہیں سکھا کر پیس لیا جاتا ہے اور پھر سب سانپوں کا برادہ اچھی طرح ملا کر مٹی کے ایک مٹکے میں ڈال کر...... کسی سیم زدہ دلدلی دھرتی میں گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا ہے اور دس سال تک

وہ شکار ہار ہے۔ اس عمل سے ایک ایسا سفوف تیار ہوتا ہے جس میں اگر سمندری پانی ڈال کر کسی ایسے شخص کو دیا جائے جسے زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو تو وہ بندہ بھلا چنگا ہو جاتا ہے اور اگر اس میں صحرائی گدھوں کا خون شامل کر کے سفوف کو جسم پر مل لیا جائے تو ایسی بو انسانی جسم سے نکلتی ہے کہ ہر قسم کا سانپ اس سے دور بھاگتا ہے۔ یہ ایک خزانہ ہی ہے جو ہمارے پاس بزرگوں کی تپسیا کا تحفہ ہے....."

"اس کو کیا کہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے اس سفوف کا نام کیا ہے۔" شرما جو اب اپنے استاد سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا ادب سے بولا۔

"اس کو ہم تریاق کہتے ہیں۔" کروندیا سرسراتی آواز میں بولا اور پھر یکدم چونک پڑا اور بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے بین کی طرف بڑھا۔

☆.....☆

سپیروں کو بھاگتے دیکھ کر شکنتلا کے دل میں سمائی کہ دیکھوں تو سہی کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے تھے۔ سانپوں کی فوج کو اپنے ساتھ دیکھ کر شکنتلا کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ بے سہارا نہیں جہاں اسے مشکل پیش آئے گی کسی بھی قریبی سانپ سے مدد حاصل کرلے گی۔ یہ تو علاقہ ہی سانپوں بھرا تھا۔ یہ سوچتے ہی اس نے ایک عقاب کا روپ دھارا اور تیزی سے پرواز کرتی ہوئی مناسب فاصلے سے سپیروں کا تعاقب کرنے لگی۔ سرائے دام چند میں جب وہ سپیرے داخل ہوگئے تو شکنتلا سانپ بن کر ان کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے کمرے کے روشندان پر جاکر چھپ گئی۔ اس نے دونوں کی پوری گفتگو سنی اور پھر جیسے ہی کروندیا نے چونک کر بین کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شکنتلا سمجھ گئی کہ کروندیا کو اس کی بو آگئی ہے لہٰذا وہ پھرتی سے باہر کی طرف اتر گئی اور سیدھی گگن کے گھر پہنچ کر انسانی روپ میں آگئی۔ گھر میں جب وہ داخل ہوئی تو پو پھٹ چکی تھی، تمام لوگ ابھی سوئے پڑے تھے جبکہ گگن صحن میں چارپائی پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ شکنتلا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی۔

شکنتلا پر تھکن طاری تھی۔ وہ گگن سے کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گگن کی خواہش تھی کہ رات کے واقعہ کے بارے میں شکنتلا سے کوئی بات کی جائے۔ لیکن شکنتلا نے اس کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اور اس کا یہ رویہ دیکھ کر گگن کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اچانک ایک خیال گگن کے ذہن میں چھپاکے کی طرح اُبھرا کہ.....

☆.....☆

دلاور ایک کدال شانے پر رکھے قبرستان کے اندر پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت اور چاروں طرف گھور اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شدید بارش ابھی ابھی رکی تھی۔ اس مہیب سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں سے ٹپ ٹپ کر کے گرتا پانی خوف میں اضافہ کا سبب تھا۔ قبرستان میں بارش کے سبب سخت کیچڑ تھی جس سے دلاور کے کپڑے اور جوتے لت پت ہو چکے تھے وہ قبروں اور ٹہنیوں سے بچتا بچاتا اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں گزشتہ شام ایک نوجوان عورت دفنائی گئی تھی۔

کوٹھاری قبرستان کے حدود سے پرے ہی رک کر اس کا انتظار کر رہا تھا دلاور نہ چاہتے ہوئے بھی آج کوٹھاری کا حکم ماننے پر مجبور ہو چکا تھا۔ کوٹھاری کی شکتیوں نے اسے لاچار اور بے بس کر دیا تھا۔

اچانک سامنے درختوں کے جھنڈ سے ایک بہت بڑا پرندہ برآمد ہوا اور انتہائی نیچی پرواز کرتا ہوا دلاور کے چہرے کی طرف بڑھا۔ دلاور رک کر فوراً ہی اپنے آپ کو نیچے نہ گرا لیتا تو پرندے نے اس کے سر اور منہ کو بری طرح زخمی کر دینا تھا۔ کچھ ہی دیر میں دلاور کو مطلوبہ قبر مل گئی جس کو وہ دن کی روشنی میں دیکھ کر گیا تھا۔ دلاور نے لالٹین ایک جگہ رکھ دی اور پھر اس نے کدال بلند کی اور قبر کی مٹی کھرچنے لگا۔ قبر تازہ ہونے کے سبب دلاور کو زیادہ پریشانی نہ ہوئی اور چند ہی لمحوں میں اس نے تمام مٹی ہٹا دی اور اب پتھر کی سلیں اُٹھانے لگا۔ ذرا سی دیر میں سفید کفنائی میت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ دلاور جلدی جلدی کفن کے بند کھولنے لگا۔ ایک جواں سال عورت تھی۔ جس کا بے جان چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ کسی اچھے گھر

کی لگتی تھی، پتا نہیں اس کو کیا بیماری آ پڑی تھی کہ مر گئی۔ اب دلاور نے زیر جامہ میں سے قینچی نکالی اور عورت کے بالوں کو قینچی سے کاٹنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں بال کاٹ کر اس نے اپنے پاس پہلے سے موجود تھیلے میں ڈال لیے۔ یہ عمل مکمل کر کے وہ اٹھا تو مارے خوف اور احساسِ گناہ سے اس کا رواں رواں پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ کام مکمل کر کے اس نے لالٹین اور کدال وہیں چھوڑیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قبرستان سے باہر آنے والے راستے پر چل دیا۔ کوٹھاری قبرستان سے باہر ایک درخت تلے دلاور کا انتظار کر رہا تھا۔ دلاور کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں مکاری اور نحوست ابھر آئی۔

"آ گیا پت" کوٹھاری نے جھپٹ کر تھیلا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا!! "چل اب تجھے وہ گھر دکھاؤں جہاں سے تو نے کنواری کنیا کو باہر لانا ہے؟"

"کوٹھاری" دلاور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

"وہ کام مجھ سے نہ کروا کہ میرا واپسی کا راستہ ہی بند ہو جائے، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں۔"

"راستے تو اب سارے کھل جائیں گے تمہارے جو سب کے سب خوشحالیوں کی طرف جاتے ہیں اور پاپ اور پن کے چکروں میں پڑنا چھوڑ دے نہیں تو باؤلا ہو جائے گا، چل آ میرے ساتھ۔"

☆......☆

خشکران نے اتنا بے بس اپنے آپ کو کبھی نہیں پایا تھا۔ جب سے شگفتلا گرو ہرن کے شکنجے میں گئی تھی خشکران کو کسی پل اور کسی کل چین نہ تھا۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو شگفتلا پر بری طرح فریفتہ ہو چکا ہے۔ شگفتلا کا قیامت خیز حسن اور تو بہ شکن جوانی خشکران کے اعصاب پر چھا چکی تھی۔ ساحری کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ وہ بھی خوب صورت تھی لیکن شگفتلا کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اس بات کا علم تو خشکران کو تھا کہ شگفتلا ٹیکسیلا کے علاقے میں ہے اور خشکران وہاں گیا بھی تھا لیکن پجاری ان دیکھی شکتیوں نے اسے شگفتلا تک پہنچنے ہی نہ دیا تھا اور وہ ٹیکسیلا کے علاقے میں داخل ہی نہ ہو سکا تھا جیسے ہی وہ ایک خاص جگہ تک پہنچا اس کے وجود کو ایک خطرناک جھٹکا لگتا اور وہ واپس پیچھے کی طرف گر جاتا حالاں کہ اس نے راستے اور زاویے بدل بدل کر جانے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی ہی اس کا مقدر ٹھہری۔ اب خشکران حد درجہ پریشان ہو چکا تھا۔

شگفتلا کی جدائی اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی اس کا کول وجود اور شگفتہ مسکراہٹ خشکران کی نظروں کے سامنے اور خیالوں میں گھومتی رہتی اور خشکران کے جسم میں انگارے بھر جاتے اس وقت خشکران پوری رفتار سے اڑا جا رہا تھا آج اس نے اپنی سلطنت آتشان پہنچ کر عقل داروں سے مشاورت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا باپ اشکران جنوں کا بادشاہ اور مجلس عاقلان کا بڑا تھا۔

اس وقت خشکران جس علاقے کے اوپر سے گزر رہا تھا وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ سرمئی بھربھری اور بنجر پہاڑیاں تاحد نظر ویران ٹنڈ منڈ پہاڑی علاقہ تھا۔ تاہم کہیں کہیں اکا دکا درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بادلوں کی تیز رفتار نقل و حرکت گڑگڑاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ رات دم توڑ رہی تھی اور صبح کا سپیدہ آہستہ آہستہ اس کی جگہ لینے کی کوشش میں تھا۔

اسی اثناء میں بارش شروع ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں بارش زور پکڑ کر موسلا دھار ہونے لگی۔ خشکران خاصی دیر بارش کا مزہ لینے کے بعد اپنی بلندی زیادہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بادلوں کے بیچوں بیچ آ گیا پھر تھوڑا سا مزید بلند ہوا تو اچانک اس کے چاروں طرف چمکیلی دھوپ نکل آئی...... کیوں کہ اب خشکران بادلوں سے بلند ہو چکا تھا۔

چاندی جیسے بادلوں پر سورج کی کرنیں منعکس ہو کر نورانی منظر پیش کر رہی تھیں۔ تاحدِ نگاہ سفید بادلوں کی دبیز تہ خشکران کے دل میں گدگدی کرنے لگی وہ اپنے آپ کو نیل کے اوپر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ عجب رومانویت سے بھرپور نظارہ آنکھوں کے سامنے پا کر خشکران کو پھر شگفتلا یاد آ گئی۔ شگفتلا اور اس کی قربت میں گزرے ہوئے لطیف لمحات اس کے گداز وجود کی بے باکیاں، شگفتلا اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ کہاں ہوگی، کس حال میں، شگفتلا کی یاد اس کے دل و دماغ پر

نشہ بن کر چھانا شروع ہوئی تھی کہ اچانک خشکران کو ایک انتہائی زبردست خوفناک قسم کا جھٹکا لگا جس سے اس کا انجر پنجر ہل گیا۔ خشکران نے چونک کر سنبھلنے کی کوشش کی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے ہی جسم پر اس کی گرفت ختم ہوگئی ہو وہ ڈانواں ڈول ہو گیا جیسے پتنگ کی ایک کنی ٹوٹ گئی ہو۔ خشکران ایک دم مستعد ہو گیا۔ اس نے اپنے تمام حواس از سرِ نو مجتمع کیے اور سیدھی پرواز کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن بے سود، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم بے وزن اور خالی خالی ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ اس نے اپنے آپ کو سیدھا اڑتے اڑتے نیچے آتا محسوس کرنا شروع کیا جیسے کسی طیارہ میں ایندھن ختم ہو چکا ہو اور وہ گلائیڈ کر رہا ہو۔

اور پھر اسے ایک دوسرا پہلے سے بھی خطرناک جھٹکا لگا جس سے اس کا سر زمین اور ٹانگیں آسمان کی طرف ہوگئیں اور خشکران عمودی گرنے لگا۔ نیچے سے زمین اس کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتی محسوس ہوئی اور پھر خشکران کو یوں لگا جیسے اس کے وجود کی ہیئت بدل رہی ہے وہ دھوئیں کی شکل اختیار کر رہا تھا اسے اپنے گرداگرد نیلے رنگ کا حصار نظر آنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا جسم دھوئیں کی سفید لکیر میں تحلیل ہو کر زمین کے بالکل قریب آ گیا۔ یہ ساری باتیں اور عوامل خشکران خود بھی محسوس کر رہا تھا اور وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اب اس نے دیکھا کہ ایک ٹنڈ منڈ لیکن بہت بڑے درخت کے نیچے ایک سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور اس کے پاس ایک نوجوان ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کے بعد خشکران کے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

☆......☆

نوخیز بے ہوش دوشیزہ دلاور باہوں پر اٹھا کر تیز تیز قدموں سے کوٹھاری کے پیچھے چل رہا تھا۔

دلاور کی نظریں لڑکی کے خوف سے پیلے پڑے چہرے پر تھیں۔ کوٹھاری نے دلاور کو ایک الگ تھلگ مکان کے سامنے کھڑا کرتے وقت ایک تیز دھار کٹار دے کر سخت لہجے میں کہا تھا کہ صبح ہونے والی ہے اور مجھے پہنچنے سے قبل اپنا عمل شروع کر دینا ہوگا اس مکان کے اندر کوٹھاری کے علم کے مطابق صرف میاں بیوی اور ایک جواں سال بیٹی ہے۔ بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا، میرا ہاتھ لگانا منع ہے اور اگر بوڑھی عورت مزاحمت کرے تو کٹار اس کی چھاتی میں اتار دینا۔ اگر تو نے دیر کر دی اور صبح ہوگئی تو کوٹھاری تیرے نصیبوں کی مستقل رات کر دے گا۔

اس کے بعد دلاور نے آگے بڑھ کر زور سے کواڑ بجایا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص آنکھیں ملتا ہوا نظر آیا۔ دلاور نے پھرتی سے اسے گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا تو کوٹھاری نے لپک کر اس کی گردن اپنے آہنی ہاتھوں میں دبوچ لی۔ اس شخص کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور اس کے بعد تکلیف ابھر آئی اور بے اختیار اس نے اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے اور کسمسانے لگا لیکن کوٹھاری کی آہنی گرفت کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی، ابھی ان دونوں کی کشمکش جاری تھی کہ دلاور تیزی سے مکان کے اندر گھس گیا!

ڈیوڑھی میں دائیں طرف ایک چھوٹا سا بیٹھک کا دروازہ تھا جس پر تالا پڑا تھا۔ آگے صحن تھا جس کے بائیں طرف رسوئی اور غسل خانہ تھا جبکہ سامنے ایک برآمدہ اور چھوٹے چھوٹے کمرے دیکھ کر دلاور سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا جہاں ایک نوجوان دوشیزہ نیم غنودگی میں بیٹھی تھی شاید دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھل گئی تھی لیکن ابھی نیند کے خمار میں تھی۔ ایک غیر مرد کو دندناتے اندر آتے دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔

"دیکھو لڑکی" دلاور نے کٹار نکال کر لہراتے ہوئے کہا۔

تمہارا باپ مارا جا چکا ہے اور تمہیں میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔

"نہیں۔" لڑکی نے چیختے ہوئے کہا۔ خوف اس کی آنکھوں میں لہرانے لگا اور وہ بستر پر ایک جانب سمٹنے لگی۔

☆......☆

(حیرت کے سچے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ کیجیے)

آپ بیتی جگ بیتی کا سلسلہ
جس میں مرد حضرات خواتین کی بجائے مردوں کے حوالے سے معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات و سانحات بیان کرتے ہیں



کھلاڑی

ممتاز احمد

ایک کھلنڈرے مرد کی داستانِ عبرت اثر گوش حالات

زیرِ نظر کہانی کی شروعات اُس وقت ہوئی، جب میری عمر اڑتیس سال تھی، مگر میری اچھی صحت، عمدہ خوراک اور روزانہ ورزش کے نتیجے میں میری عمر تیس بتیس سال کی ہی لگتی تھی۔

میرا نام عدنان ہے اور میری شادی ہو چکی تھی، ایک ایسی عورت سے جو اچھی، نیک اور پیار کرنے والی بیوی تھی۔ اللہ نے مجھے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی نعمت سے نوازا تھا۔ مکان میرا اپنا تھا، جو معقول اور مناسب کرائے کے عوض خریدا گیا مکان تھا، جسے میری بیوی نے اپنے سلیقہ پن اور حسن کی توجہ سے جنت بنایا ہوا تھا۔ میں واپڈا میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا، جس کی وجہ سے میرا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ میں اپنے موبائل فون پر ہفتہ وار پیکیج لے لیا کرتا تھا اور روزانہ صبح سویرے گڈ مارننگ اور رات کو گڈ نائٹ کا پیغام کسی مفکر کے قول یا کسی اچھی بات یا اقوالِ زریں کے ساتھ اپنے دوستوں، عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کو باقاعدگی کے ساتھ بھیجا کرتا تھا۔

ایک دن میرا گڈ نائٹ کا پیغام کسی غلط نمبر پر چلا گیا تو تھوڑی دیر کے بعد اسی نمبر سے مجھے یہ پیغام موصول ہوا۔

”جی آپ کون.....؟“ تو جواباً میں نے پیغام بھیجا کہ ”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں کہ میں کون ہوں۔“ اس پر جواب آیا۔

”جی آپ کے نمبر سے مجھے گڈ نائٹ کا میسج آیا ہے، مگر میں آپ کو نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں اور آپ نے مجھے میسج کیوں بھیجا ہے؟“ جب میں نے اپنا پیغام بھیجنے والا فولڈر چیک کیا تو واقعی غلطی سے یا کسی طرح اُس نمبر پر میرا میسج گیا تھا۔ اس پر میں نے سوری لکھ کر معذرت کا پیغام بھیج دیا تو اس کے جواب میں مجھے یہ میسج آیا کہ ”کوئی بات نہیں جی بہرحال آپ کا میسج بہت اچھا تھا، مجھے بہت پسند آیا۔ بائی دا وے، ویسے آپ کون ہیں اور آپ کا کیا نام ہے؟“ پھر میں نے اپنا نام، اپنی جاب اور شہر کا نام بتایا۔ جس پر اُس نے مجھے میسج بھیجا کہ ”میں ایک ذوق والا بندہ لگتا ہوں۔“ پھر میں نے اُس کا نام اور شہر پوچھا تو اُس نے اپنا نام نسرین بتایا اور وہ میرے شہر میں ہی رہتی تھی۔ اس طرح ہماری روزانہ میسج کے ذریعے بات چیت ہونے لگی، مزید تعارف پر میں نے اُسے بتایا کہ ”میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو

بچے بھی ہیں اور فلاں علاقے میں میری رہائش ہے۔" پھر اُس نے بتایا کہ "وہ بھی شادی شدہ ہے اور اُس کا خاوند بیرون ملک ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے سسرال میں ہی رہتی ہے۔" پھر میں نے اُس سے کال کرکے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس نے میسج بھیجا کہ جب کچھ ماحول سازگار ہوگا تو وہ مجھ سے بات بھی کرے گی۔

کوئی دو تین روز کے بعد اُس نے مجھے Call Me کا میسج بھیجا تو میں نے فوراً اُس کو کال کی، اس طرح ہماری پندرہ بیس منٹ بات ہوئی۔ اب اکثر ہماری فون پر بات ہونے لگی مگر زیادہ تر ہم رات کو میسجنگ کرتے۔ اس طرح ایک مہینے میں ہم گہرے دوست بن گئے۔

وہ تنہائی کا شکار تھی اور اُسے میری صورت میں ایک اچھا اور بقول اُس کے زندہ دل دوست مل گیا تھا، چونکہ میری کسی اور لڑکی یا عورت سے دوستی نہ تھی لہٰذا میں نے اُس کو بھرپور توجہ اور خلوص دیا۔ جب وہ بھی Call Me کا میسج دیتی تو میں سارے کام چھوڑ کر اُس سے بات کرتا تھا اور اُس کو اگر کبھی بیلنس کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی میں فوراً بھیج دیتا تھا، اس پر وہ بہت خوش ہوتی اور میرا شکریہ ادا کرتی تو جواباً میں اس سے کہتا۔

"نسرین جی دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" ہم دونوں کی یہ خواہش تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھیں۔ اب میں اُس سے ملنے اور ملاقات کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ جس پر وہ کہتی کہ "وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے، مگر بہت جلد مناسب وقت پر مل لیں گے۔" تو میں اس سے بے تاب ہوکر کہتا کہ "وہ مناسب وقت کب آئے گا۔" اس پر وہ



ہنس پڑتی اور کہتی۔

"صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

ایک دن اُس نے مجھے میسج بھیجا کہ وہ اپنی ساس کے ساتھ کچھ ضروری خریداری کے لیے شہر کے مشہور جنرل اسٹور پر جا رہی ہے اور پندرہ بیس منٹ تک وہ وہاں پہنچ جائیں گی، پھر اُس نے اپنا حلیہ، کپڑوں کا رنگ اور نشانی وغیرہ مجھے بتادی، جواباً میں نے بھی اسے اپنے کپڑوں کا رنگ وغیرہ اُسے بتادیا۔ اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ اس وقت چونکہ اُس کی ساس اُس کے ساتھ ہوگی، اس لیے صرف دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے، اس دوران نہ تو کوئی بات کریں گے اور نہ ہی کوئی اشارہ۔

میں اپنے آفس سے اُٹھا اور اپنی بائیک پر دس منٹ کے اندر اندر اُس جنرل اسٹور پر پہنچ گیا اور چھوٹی موٹی چیزوں کی شاپنگ کرنے لگا۔ کوئی پانچ دس منٹ کے بعد وہ بھی اپنی ساس کے ہمراہ آ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور پرکشش سراپے کی گوری چٹی، اچھے تیکھے نقوش والی تیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ جب تک وہ خریداری کرتی رہیں، میں بھی اسٹور میں موجود رہا مگر اُس کی ہدایت کے مطابق کوئی حرکت، اشارہ یا بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح ہماری یہ پہلی خاموش ملاقات صرف ایک دوسرے کو دیکھنے کی حد تک تھی، واپس پر جاتے ہوئے اُس نے مجھے غور سے ایک دل کش مسکراہٹ سے دیکھا اور رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ شام کو جب ہماری فون پر بات ہوئی تو ہم دونوں بہت خوش تھے کیوں کہ ہم ایک دوسرے کو پسند آئے تھے۔

اب میرا اصرار دن بدن بڑھنے لگا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے اُس کا کہنا تھا کہ اکیلے اُس کا گھر سے نکلنا بہت مشکل ہے، بہرحال وہ کوئی نہ کوئی صورت نکالے گی، لہٰذا اُس نے مجھے کچھ روز انتظار کرنے کا کہا۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد اُس نے کہا کہ سب گھر والے ایک شادی میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں اور اُس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر شادی پر جانے سے انکار کر دیا ہے۔ جب تمام گھر والے چلے جائیں گے تو وہ مجھے فون کر کے اپنے گھر پر بلالے گی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد اُس کی کال آئی۔ اُس نے بتایا کہ سب لوگ چلے گئے ہیں اور وہ گھر میں اکیلی ہے، پھر اُس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا، ساتھ ہی اُس نے تاکید بھی کی کہ میں موٹر سائیکل کی بجائے رکشے پر آؤں۔ میں فوراً اس کے گھر کے قریب رکشے سے اُتر گیا۔ وہ ایک پوش اور مہنگے علاقے میں رہتی تھی۔ اُس علاقے میں گھروں کے آگے بہت کشادہ سڑک تھی۔ اور گھر کی پچھلی جانب بھی ایک گلی تھی، جو اکثر سنسان رہتی تھی۔ زیادہ تر آمدورفت سڑک پر ہی ہوتی تھی۔ اُس کی ہدایت کے مطابق میں گلی والے دروازے سے اُس کے گھر میں داخل ہوا، پھر ہم دونوں ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ پہلے تو ہم دس منٹ تک ایک دوسرے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ایک تو تنہائی اور دوسرے اُس کی دل موہ لینے والی ادائیں اور اُس کی خود سپردگی، اس کے بعد پھر ہم دونوں بہک گئے۔

اُس کے شوہر کو دوسرے ملک گئے دو سال ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے وہ بہت تشنہ تھی۔ اُس نے بڑے جوش اور والہانہ پن سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ ہم پورے دو گھنٹے گناہ کی وادیوں میں گھومتے رہے اور خوب جی بھر کے ایک دوسرے کو بھرپور تسکین دی، پھر میں اُسی گلی کے راستے سے واپس اپنے گھر آ گیا۔ اب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ رہا تھا، کیوں کہ تمام اخلاقی اور شرم و حیا کی دیواریں گر چکی تھیں۔ اب ہم پھر ایک دوسرے سے ملنے کو بہت بے تاب رہنے لگے تھے۔ کوئی ہفتہ دس دن کے بعد میری بیوی ایک دن کے لیے اپنے میکے گئی تو پھر میرا گھر خالی تھا۔ میں نے نسرین کو فون کیا اسے بتایا کہ یہ سنہری موقع ہے، تم کسی طریقے سے گھر سے نکلو اور میرے پاس آ جاؤ، پھر وہ کوئی بہانہ بنا کر کسی نہ کسی طرح میرے گھر پہنچ گئی۔ جہاں ہم نے ایک بار پھر شیطانی گناہ کا کھیل خوب جم کر کھیلا۔ اب ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دیوانے ہو گئے تھے اور ملنے کے

لیے بہت بے چین رہنے لگے تھے۔ اس کے بعد نسرین نے ملنے کی صورت یہ نکالی کہ اُس کی ایک جاننے والی ایک بیوٹی پارلر چلاتی تھی۔ نسرین نے بیوٹیشن کا کورس کرنے کے بہانے اپنے سسرال والوں سے اجازت لے کر اُس بیوٹی پارلر پر آنا شروع کر دیا۔ بیوٹی پارلر کی مالکن مہوش ایک خوب صورت، طرح دار اٹھائیس سال کی مطلقہ عورت تھی۔ نسرین نے مہوش کو امپورٹڈ گفٹ وغیرہ دے کر اعتماد میں لے کر مجھے وہاں بلانا شروع کر دیا۔ نسرین کو اُس کا سسر موٹر سائیکل پر پارلر چھوڑ کر جاتا تھا۔ جب مہوش کو پتا چلا کہ میں واپڈا میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں، تو اُس نے مجھ سے کہا کہ "میرے پارلر کا بل بہت زیادہ آتا ہے میں اس کے لیے کچھ کروں۔" میں نے اُس کے پارلر کا میٹر بجلی کا ٹیرف کمرشل سے گھریلو کروا دیا اور میٹر میں بھی کچھ گڑبڑ کروا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا بجلی کا بل بہت کم آنے لگا، اس پر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس طرح ہم اُس پارلر میں ہفتے میں دو تین بار گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونے لگے۔

اب میری مہوش سے بھی کافی اچھی گپ شپ ہو گئی تھی اور وہ مجھ سے اور بھی مختلف نوعیت کے کام کروانے لگی، جو میں خوشی سے کر دیتا تھا۔ اس کے عوض وہ ہمیں پُرسکون جگہ اور تنہا ماحول فراہم کرتی تھی۔ اب میں نے مہوش سے بھی ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے اور جب مجھے موقع ملتا میں اُس کے پاس جا کر اپنی ہوس کی تکمیل کرتا۔

مہوش کے پارلر میں ایک ریحانہ نامی عورت اکثر آیا کرتی تھی۔ مہوش کی معرفت میرا اُس سے بھی تعارف ہو گیا اُس نے مجھے اپنا کزن ظاہر کیا۔ اتفاق سے ریحانہ کے گھر کا بجلی کا بل بہت زیادہ آ گیا تھا۔ جب مہوش نے ریحانہ کو بتایا کہ میں واپڈا میں ملازم ہوں، تو ریحانہ نے اپنے بجلی کے بل کے بارے میں مجھے بتایا تو میں نے اس کا بل کم کروانے کا وعدہ کر لیا اور اگلے روز اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کا بھی نہ صرف بل کم کروا دیا، بلکہ اُس کے میٹر میں ٹھیک ٹھاک گڑبڑ کروا دی۔ اب ریحانہ کے گھر کا بل پانچ

چھ سو سے زیادہ نہ آتا تھا۔ ریحانہ میری اس کارگزاری سے بہت خوش ہوئی اور پھر وہ بھی میری اچھی دوست بن گئی۔ اب بدلے میں وہ بھی مجھے اپنے جسم کی رشوت دینے لگی تھی۔

اب میرے بیک وقت تین انتہائی خوبصورت عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ یہ تینوں ہی مجھے مختلف انداز میں لذت و سرور سے ہمکنار کر لیتی تھیں۔ اب مجھے اپنی بیوی میں ذرا بھی کشش نہ لگتی تھی اور میں اُس سے غافل سا رہنے لگا تھا۔

جس پرائیویٹ اسکول میں میرے دونوں بچے پڑھتے تھے، وہاں ایک لیڈی ٹیچر کی آسامی خالی ہوئی، تو میری بیوی نے مجھ سے اُس اسکول میں نوکری کی اجازت مانگی، چونکہ میری بیوی نے ایم اے کیا ہوا تھا اور وہ لوگ اسے آٹھ ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔

میری بیوی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تنخواہ کی کمیٹی ڈال لے گی اور اس طرح ہم دو تین سال میں بچت کر کے پیسے اکٹھے کر کے کوئی پلاٹ لے لیں گے اور پھر ہاؤس بلڈنگ سے قرضہ لے کر اپنا مکان بنوائیں گے۔ میری بیوی کو اپنے ذاتی گھر کی بہت تمنا، حسرت اور خواہش تھی۔ وہ اپنے گھر کے حصول کے لیے اپنا زیور بھی بیچنے کو تیار تھی اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا چاہ رہی تھی تاکہ ہم جلد از جلد اپنا گھر بنانے کے قابل ہو سکیں۔ بہرحال میں نے کچھ سوچ کر اور اُس کے مکان کے شوق کو دیکھتے ہوئے اُسے جاب کی اجازت دے دی۔ اب ہم دونوں صبح سویرے اُٹھ کر تیار ہوتے، ناشتا وغیرہ کر کے میری بیوی بچوں کو لے کر اسکول چلی جاتی اور میں اپنے آفس چلا جاتا۔ وہ اسکول سے دو بجے واپس گھر آ جاتی تھی اور میں تین ساڑھے تین بجے تک واپس گھر آتا تھا۔ میری بیوی اسکول سے واپس آ کر فوراً دوپہر کا کھانا بناتی اور چار بجے مختلف بچے ٹیوشن پڑھنے کے لیے ہمارے گھر آ جاتے اور پھر رات گئے تک وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف رہتی۔ اتوار کو چھٹی ہوتی، اس لیے وہ اتوار کا سارا دن کپڑے دھونے، استری کرنے

اور دیگر کاموں میں گزار دیتی تھی۔ میری بیوی صبح سے لے کر رات تک محنت کرتی، بچوں کو بھی پڑھاتی، کھانا بناتی اور گھر کی صفائی بھی خود کرتی تھی، نتیجتاً وہ اتنی تھک جاتی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی اُسے گہری نیند آ جاتی تھی۔

جب وہ گہری نیند سو جاتی تو میں موبائل پر نسرین سے خوب باتیں کرتا اور ہماری خوب میسجنگ ہوتی، جبکہ میری بیوی میرے کرتوتوں سے بے خبر اپنا گھر بنانے کی دھن میں اسکول کی ملازمت کر رہی تھی اور بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا رہی تھی۔ ایک دن اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آیا۔ چونکہ میری بیوی کی واپسی دوپہر دو بجے ہوتی تھی اور اس وقت تک میرا گھر بالکل خالی ہوتا تھا، لہٰذا میں نے نسرین کو یہ ساری صورت حال بتادی وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اس طرح اب نسرین بیوٹی پارلر سے میرے گھر آ جاتی اور میں بھی آفس سے کسی بہانے کھسک جاتا۔ چونکہ ہمارا پروگرام پہلے ہی فون پر طے ہو جاتا تھا، لہٰذا میں نسرین کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر اپنے گھر لے آتا تھا، جہاں ہم خوب گناہ کا کھیل کھیلتے تھے۔ اس کے علاوہ اب میں ریحانہ کو بھی اپنے گھر ہی لے آتا تھا اور خوب رقصِ ابلیس کرتا تھا، جبکہ مہوش کے ساتھ اس کے پارلر میں رنگ رلیاں مناتا تھا۔

ان تینوں عورتوں سے میری مختلف اوقات میں فون پر لمبی لمبی بات بھی ہوتی تھی، نیز اس زمانے میں موبائل فون پر پیکیج اتنے زیادہ نہ تھے، جس کی وجہ سے میرا روزانہ پانچ سو روپے کا کریڈٹ خرچ ہو جاتا تھا، بلکہ مجھے نہیں مہوش کو بھی ہر دوسرے تیسرے دن تین سو کے کارڈ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے بھی مجھ سے پیسے بٹورتی رہتی تھی، لہٰذا میں نے اپنے ان ناجائز اخراجات کو پورا کرنے کے لیے رشوت بھی لینی شروع کر دی تھی۔

کہتے ہیں کہ حرام کی کمائی اور بدکاری میں بڑی کشش اور لذت ہوتی ہے۔ میں ان دونوں افعال بد کا خوب خوب مرتکب ہو رہا تھا اور گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ میرا ضمیر مر چکا تھا، گناہ اور ثواب کا تصور میرے نزدیک مٹ چکا تھا، میں ایک لحاظ سے بے حس ہو چکا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے پاک نبی حضرت محمدؐ کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہا تھا۔ میں اپنی بیوی کی امانت میں خیانت کر رہا تھا۔ زنا جیسے قبیح فعل اور گناہ کبیرہ کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی خدا کا خوف نہ آتا تھا اور دوزخ میں جانے والے ان سارے کاموں کے ساتھ رشوت بھی میں خوب لے رہا تھا۔ نماز، روزے اور نیک اعمال کا میری زندگی میں اب دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔

میں اپنی بدکاری کے قصے خوب مرچ مسالا لگا کر اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے سناتا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اللہ پاک ایک مجرم کی رسی کو دراز ضرور کرتا ہے، مگر جب اس کی پکڑ آتی ہے تو وہ بڑی سخت ہوتی ہے، پھر توبہ کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جس گھر میں زنا ہوتا ہے وہاں سے برکت اٹھ جاتی ہے اور پھر بیماری، بھوک، فاقہ اور تنگدستی اس گھر میں ڈیرے ڈال لیتی ہے اور ذلت و رسوائی اس انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ انسان اپنی ہی بداعمالیوں اور گناہوں کی وجہ سے رب کی پکڑ میں آتا ہے۔ اب خدا کی پکڑ سے میں بھی دور نہیں تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ ہمارے گھر کے سامنے رہنے والی خاتون کو تاک جھانک کی بہت عادت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ صبح میری بیوی اسکول پڑھانے کے لیے چلی جاتی ہے اور گھر میرا خالی ہوتا ہے۔ چونکہ میں ہر دوسرے تیسرے دن کبھی نسرین کو لے کر آتا تو کبھی ریحانہ کو لے آتا، اس طرح وہ عورت خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہتی تھی، پھر ایک دن اس نے میری بیوی کو یہ ساری صورت حال بتادی۔ یہ سب سن کر میری بیوی حیران و پریشان ہوگئی، پھر ان دونوں نے مل کر کوئی پروگرام بنایا اور کوئی تین چار دن بعد جب میں نسرین کو لے کر اپنے گھر آیا، تو ہمارے محلے کی عورت نے میری بیوی کو فون کر کے بتادیا، جس پر میری بیوی فوراً اسکول سے چھٹی لے کر آ گئی۔ گیٹ کی ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی اور گھر کے مین دروازے کی بھی ایک چابی وہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ وہ انتہائی خاموشی

سے آئی اور چپکے سے گیٹ کھول کر مین دروازے سے اندر آ گئی۔ اس وقت میں اور نسرین بے لباس رنگ رلیوں میں مشغول تھے اور میری بیوی نے ہمیں رنگے ہاتھوں اس نازیبا اور قابلِ اعتراض حالت میں پکڑ لیا تھا۔ ہماری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں اور ہم شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

میری بیوی نے فوراً نسرین کے کپڑے پکڑ کر اپنے قبضے میں کر لیے اور اُس کو حکم دیا کہ ’’اسی طرح بے لباس واپس اپنے گھر جاؤ۔‘‘ نسرین میری بیوی کے قدموں میں گر گئی اور پاؤں پکڑ کر رو رو کر معافی مانگنے لگی۔ میری بیوی نے کہا کہ ’’معافی مانگنی ہے تو اللہ سے مانگو، مجھ سے کیوں مانگ رہی ہو۔‘‘ اب نسرین بے لباس زمین پر بیٹھی رو رہی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری بیوی نے دھمکی دی کہ وہ ابھی پولیس کو بلا کر ہم دونوں کو ان کے حوالے کرنے والی ہے۔ اس پر نسرین اور زیادہ گڑگڑا کر رونے لگی اور میری بیوی کی منتیں کرنے لگی۔ میں نے فوراً اپنے کپڑے پہن لیے اور اپنی بیوی کی منتیں کرنے لگا اور معافیاں بھی مانگنے لگا۔ میری بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ ’’کب سے یہ شیطانی فعل کر رہے ہو تم؟‘‘

میں نے کہا ’’ایک دو بار ہی کیا ہے۔‘‘ بہرحال میں نے بھی اپنی بیوی کے پیر پکڑ لیے اور منت سماجت کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اس شرط پر نسرین کو کپڑے دیے کہ وہ اپنا نام اور ایڈریس بتائے، ورنہ وہ ابھی شور مچا کر پورے محلے اور پولیس کو بلا لے گی، تو مجبوراً اُسے اپنا نام اور ایڈریس بتانا پڑا، پھر میری بیوی نے اُس کے کپڑے اُسے واپس کر دیے، جو اُس نے جلدی جلدی پہن لیے اور وہ فوراً ہمارے گھر سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میری بیوی نے مجھے خوب خوب سنائیں اور غصے کی حالت میں مجھ سے لڑ کر اسکول سے دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ میں نے اُسے بہت روکنے کی کوشش کی، مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں بہت پریشان سا ہو گیا۔ میں نے دو چار دن اپنی بیوی سے کوئی رابطہ نہ کیا کہ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو میں جا کر اُسے منا لوں گا، تقریباً ایک ہفتے کے بعد میں اپنے سسرال گیا تو کسی نے بھی میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کی اور میری بیوی نے تو مجھ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ میں ناکام و نامراد واپس اپنے گھر آ گیا۔ میری بیوی نے مزید یہ کیا کہ اپنے بھائی اور اپنی ماں کے ساتھ نسرین کے گھر جا کر اس کے ساس اور سسر کو بھی میری اور نسرین کی رنگ رلیوں کی داستان سنا دی۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اسے گھر سے بے عزت اور ذلیل کر کے نکال دیا۔ نسرین نے اپنے میکے جا کر خودکشی کی نیت سے نیند کی بہت ساری گولیاں کھا لیں۔ جب اُس کی حالت بہت بگڑ گئی تو اس کے میکے والے اُسے اسپتال لے گئے۔ جہاں بر وقت طبی امداد ملنے کی وجہ سے اُس کی جان تو بچ گئی، لیکن وہیں پر لیڈی ڈاکٹر نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے، مگر گولیاں کھانے کی وجہ سے اُس کے حمل کو بہت نقصان پہنچا ہے، پھر جب نسرین ہوش میں آئی تو اس کا ابارشن کر دیا گیا۔ اب سب لوگ اس صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھ گئے کہ وہ ناجائز بچہ تھا، جس پر اُس کے میکے والے اپنی عزت کی خاطر خاموش ہو گئے اور نسرین کے خاوند نے اُسے طلاق بھیج دی۔ اِدھر میری بیوی نے گھر واپس آنے سے صاف انکار کر دیا اور مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے اپنے سسرال جا کر اپنی بیوی کو بہت منانے کی کوشش کی۔ اس کی بھرپور منتیں کیں، بڑی معافیاں مانگیں، مگر اُس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ مجھ جیسے بدکار اور راشی شخص کے ساتھ ہرگز زندگی نہیں گزارے گی۔

جب میں نے اسے طلاق دینے سے انکار کیا تو اُس نے عدالت میں میرے خلاف خلع کا کیس دائر کر دیا اور پھر کچھ دن بعد مجھے عدالت سے پیشی کا حکم آ گیا۔ اب مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا جہاں پر اُس کے وکیل نے میرے کردار کی دھجیاں اُڑا دیں، نتیجتاً دو تین پیشیوں کے بعد نہ صرف میری بیوی کے حق میں فیصلہ ہو گیا، بلکہ دونوں بچے بھی میری بیوی کی تحویل میں دے دیے گئے، کیونکہ بقول میری بیوی کے وہ مجھ جیسے بدکار اور رشوت خور انسان کا سایہ بھی اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دے گی۔

بھی نہیں بلکہ اس کے جہیز کا سارا سامان اور زیور وغیرہ بھی مجھے واپس کرنا پڑا، مزید عدالت نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں بچوں کا خرچہ تقریباً دس ہزار روپے ماہانہ ادا کرنے کا پابند ہوں گا، مزید ستم یہ ہوا کہ ایک دن محکمہ واپڈا کے اسسٹنٹ چیف انسپکٹر نے چیکنگ پارٹی کے ہمراہ ریحانہ کے گھر کے بجلی کے میٹر اور مہوش کے بیوٹی پارلر کے میٹر کی گڑبڑ کی چوری پکڑلی۔ ان کے بجلی میٹر اتار لیے گئے اور بجلی کی چوری کے جرم میں بھاری جرمانے کے بل ان پر ڈال دیے۔

ریحانہ اور مہوش نے اسٹیمپ پیپر پر بیان حلفی لکھ کر دیا اور یہ بھی لکھ کر دیا کہ میٹروں میں گڑبڑ میں نے کروائی تھی۔ جس کے بدلے میں ان سے میں رشوت لیتا رہا ہوں، مزید برآں محکمے کو میری بدعنوانیوں اور رشوت خوری کے اور بھی کافی شواہد مل گئے تھے۔ اب میں شرم ساری کے باعث دفتر سے بھی اکثر غیر حاضر رہنے لگا تھا، اس لیے مجھے معطل کر کے میرے خلاف انکوائری کمیٹی بنادی گئی۔

انکوائری کمیٹی نے بڑی باریک بینی سے ہر معاملے کی چھان بین کی اور میرے خلاف انہیں پکے ثبوت مل گئے اور میرا تمام جرم ثابت ہوگیا۔ جس کی پاداش میں مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی، بہت بھاگ دوڑ اور سفارشیں کروائیں، مگر میری اپیل نامنظور کرتے ہوئے اعلیٰ حکام نے خارج کردی۔

اب میں عرش سے فرش پر آگیا تھا۔ ادھر جب میرے تمام رشتے داروں، دوستوں اور عزیز و اقارب کو میرے کالے کرتوتوں کا علم ہوا تو سب مجھ پر تھوتھو کرنے لگے اور سب نے مجھ سے ناتا توڑ لیا۔ اب نہ تو کوئی مجھ سے ملتا تھا اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بیٹھنے دیتا تھا۔ سب کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت اور حقارت ابھر آئی تھی۔ اب میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ ادھر جب میں نے اپنے بچوں کا خرچ ادا نہ کیا، تو مجھے عدالت کے حکم سے جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں میں نے ایک سال بڑی ذلت اور کس مپرسی میں گزارا، پھر اپنے ایک دوست کی وساطت سے میں نے اپنی سابقہ بیوی سے بچوں کا خرچ معاف کرانے کی کوشش کی، پھر مجھے یاد آیا کہ میرے جی پی فنڈ اکاؤنٹ میں تقریباً دو لاکھ روپے موجود ہیں، جو میں نے اپنے اسی دوست کی معرفت نکلوائے اور بڑی مشکل سے ڈیڑھ لاکھ روپے اپنی سابقہ بیوی کو ادا کیے، پھر میں نے عدالت میں اپنی موجودہ حالت اور نوکری چلے جانے کا بتایا۔ آخر کار کافی منت، رونے دھونے اور واویلا کرنے پر میری سابقہ بیوی کو مجھ پر ترس آگیا اور اس نے آئندہ کا خرچ معاف کروادیا۔ اس طرح مجھے جیل سے رہائی نصیب ہوئی، لیکن اس کے باوجود مختلف اخراجات کی مد میں میرے بیس ہزار مزید خرچ ہوگئے، اب صرف تیس ہزار روپے میرے پاس تھے تو میں نے اپنی بچی کچی عزت بچانے کی خاطر اپنا شہر چھوڑ دیا اور راولپنڈی آگیا، جہاں مجھے ایک ہوٹل میں بڑی مشکل سے برتن دھونے کی نوکری ملی۔

میں صبح سے رات گئے ہوٹل میں برتن دھوتا ہوں اور رات کو ہوٹل کے ایک کونے میں سو جاتا ہوں۔ میں اپنے کیے پر بہت روتا ہوں، پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتا ہوں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔

قارئین کرام موبائل فون سے چلنے والی دوستی کا بہت بھیانک انجام نکلا۔ میرا گھر بار اجڑ گیا۔ میرے بچے میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور ہوگئے۔ اس کا رن میری نوکری بھی چلی گئی اور ساتھ ہی عزت بھی گئی۔ مجھے بھرپور ذلت و رسوائی ملی پھر مجھے جیل بھی کاٹنا پڑی۔ کاش نسرین سے میری دوستی نہ ہوئی ہوتی تو میں اس انجام تک نہ پہنچتا، مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی پاکباز بیوی کی قدر نہ کی اور اس کو مسلسل دھوکہ دیتا رہا۔ اس کی امانت میں برابر خیانت کرتا رہا بہرحال میں قصوروار تھا اور ہوں، جو لوگ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں، ان کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر انسان رب کی پکڑ میں آجاتا ہے۔

قارئین کرام یہ یاد رکھیں کہ مرد اور عورت کی دوستی سے ہمیشہ برائی اور گناہ جنم لیتا ہے، لہٰذا ایسی دوستی سے پرہیز کریں اور میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ پاک میرے گناہ معاف فرمائے اور مجھے سکون عطا فرمائے۔

☆☆......☆☆

دوسری مرد کہانی

عشقِ آتش



محمد کاشف مغل

کراچی سے ایک نوجوان کی اشکوں میں ڈوبی حسرت بھری کہانی

آج میرا ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرویو تھا جہاں بڑی منتوں مرادوں کے بعد مجھے یہ بلاوا آیا تھا۔ سو میں سب سے پہلے عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر چادر چڑھانے چلا گیا۔

فاتحہ پڑھ کر نیچے اترا تو میرے قدم سیڑھیوں میں پھنسنے لگے۔ وہ...... وہی تھا یا پھر میرا گمان۔ میں نے اسے خود سے باتیں کرتے دیکھا۔ اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھتا اور انہیں مٹانے کی کوشش کرتا۔ گرد و غبار سے اَٹے بالوں سے ڈھکا ہوا چہرہ بس آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ دھوپ کا احساس نہ دنیا کی فکر۔ گہرے خاکستری رنگ کی جھلسی ہوئی آنکھیں۔ جیسے کسی بڑے مزار پر جا آن کا دیا۔ میں الجھ کر رہ گیا۔ جانے وہ کس سوچ میں ڈوبا تھا؟ میں لپک کر اس کے قریب گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آنکھوں کے بیچ میں شناسائی کی لو جھلکی اور معدوم ہوگئی، پھر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ مجھے پانچ سال پہلے کا وقت یاد آگیا۔ جب اندرون شہر میری لیمینیشن کی دکان پر وہ آیا کرتا تھا۔ سخت گرمی کے دن، یوٹیلیٹی بلز کی آخری تاریخیں، کسٹمرز کی ایک لمبی قطار اور ایک طرف پچو را ما لیا۔

☆......☆

وہ منگل بازار میں گفٹ پیپر کا اسٹال لگایا کرتا تھا۔ ہر طرف سے مختلف آفرز کی آوازیں آتی تھیں۔

"آئیں صاحب لے جائیں۔"

"اپنے بچوں کے سوٹ سستے لگا دیے۔"

پر ان دنوں پچو کو کوئی آواز نہ سنائی دیتی۔ کان تو بس اس پری وش کے جام چھلکاتے ہونٹوں سے نکلتے امرت سے ہی زندہ ہوتے۔ نگاہیں اس طرف لگی رہتیں جہاں سے وہ لولی والا برقع پہنی نمودار ہوتی۔

ان کی پہلی ملاقات تو منگل بازار میں ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ہی انہیں ایک نئی پگڈنڈی پر لے گئی جس پر صدیوں سے لوگ چلتے رہے جہاں نہ راہ پرانی ہوتی نہ جذبات میں کمی آتی ہے۔

پچو اس دن اس کا دیوانہ ہوا جب اس نے سادہ نقاب میں چھپا دولت کا حسن چھلکاتی دوشیزہ کو دیکھا۔ تب پچو نے جانا کاروبار کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جہاں کاروباری باتیں نہیں دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ پر وہ بے چارہ ہرگز نہ جانتا تھا کہ اب جو کاروبار کرنے چلا ہے اس میں صرف نقصان ہی ہوتا ہے۔

آمنہ اکثر کہتی تھی۔ "اے پچو تیرے سے ملنے کو مجھے پورا ہفتہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تیرے کو دیکھنے کو ترس جاتی ہوں۔ کوئی حل نکال نا تاکہ ہم ہفتے میں دو سے تین بار ملا کریں۔"



"میں تو جمعہ اور اتوار بازار میں بھی اسٹال لگاتا ہوں۔ اگر تیرے لیے آسانی ہو تو خریداری کے بہانے آجایا کرنا۔" یہ کہہ کر چوہے نے محبت سے اسے دیکھا تھا۔

اب ملاقاتیں بڑھ گئیں اور ان کی محبت میں روحانیت نے جنم لے لیا تھا۔

☆.....☆

ہمیشہ کی طرح اس دن بھی چوہے کاندھے سے کپڑا اتار کر اسٹول پر بنی دھول جھاڑ کر اپنی طرف کھینچا اور شدت سے انتظار کرنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر بعد آئی اور بیٹھنے کا تکلف بھی نہ کیا۔ کہنے لگی۔ "چوہے میرے پاس وقت کم ہے۔" اس کی کپکپاتی آواز میں کوئی راز چھپا تھا۔ چوہے نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا ہوا آئی ہے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن سے تیرا نمبر بند ہے۔ حیدرآباد سے چوڑیاں منگوائی ہیں تیرے لیے۔ دیکھ تیرا نام بھی لکھوایا ہے۔ پہن کر دیکھ ذرا اور سندر ہو جائے گی تُو۔"

آمنہ نے چوڑیوں کو خالی نظر سے دیکھا اور درد بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ سب یہیں رہ جائے گا اور میں کہیں دور چلی جاؤں گی۔ چوہے۔"

"آمنہ یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔" چوہا حیرت سے بولا۔

آمنہ نے بے چارگی سے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔"

رات میں فون کرتی ہوں۔"

پپو لپک کر بولا۔ "آمنہ...... آمنہ...... آمنہ۔" مگر وہ جا چکی تھی۔

☆......☆

انتظار اب بے چینی میں بدل گیا تھا۔ وقت کیسے گزرے، نظر بھی ڈھلتے سورج کی طرف اور کبھی اپنے موبائل کی اسکرین پر، لیکن کوئی کال نہ آئی۔ کئی بار خود کوشش کی، پر جواب موصول نہ ہوا۔ ایک ایک لمحہ گزرنا سال کے برابر تھا اب۔ بازار بند ہوا، وہ گھر کیسے پہنچا، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ بے چینی مزید بڑھ گئی۔ عجیب و غریب خیالات اس کے دماغ میں جنم لیتے رہے۔ بس اسے فون کا انتظار تھا۔ رات دو بجے کے قریب موبائل کی گھنٹی بجی۔

"آمنہ کیا ہوا تھا۔ نہ کچھ اب تک کھانا نہیں کھایا قسم سے۔" آمنہ روتے ہوئے۔

"میں تیری نہیں ہو سکتی، پپو۔ اگلے ہفتے میں میری شادی طے ہو گئی ہے۔ ماں کو جب میں نے تیرا بتایا تو مجھے بہت مارا پیٹا اور موبائل بھی لے لیا۔ بڑی مشکلوں سے تجھے فون کیا۔ مجھ کو پپو تیرے بغیر میں رہ نہیں پاؤں گی۔"

اس نے آمنہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو پریشان مت ہو، میں بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔ بالکل فکر نہ کر۔" پتا نہیں میں آمنہ کو تسلی دے رہا تھا یا پھر خود کو۔ رات کشمکش میں گزار دی۔ نیند تو آمنہ کے کھو جانے کے ڈر نے اڑا دی تھی۔

☆......☆

صبح ہوتے ہی اس نے ماں کو فون کر دیا۔

"ماں تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔" ماں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"ارے سارے پپو میری سن پہلے۔ لڑکے والوں نے کہا ہے، چھٹی کو بیاہ کے دو جلدی۔ تُو تو جانے ہیں تھاری بہن کتنی لگا ہے۔ اباں کی بیماری کا کچھ پتا نہیں۔ کہتی ہے مارے کوئی دی لازمی چاہیے۔ کچھ منی آرڈر کر دے۔" پپو نے ماں کی بات سن کر دھیرے سے احتجاج کیا۔

"ماں پچھلے مہینے 20,000 بھیجے میں نے تمہارے کو۔" ماں نے اس کا جواب سن کر فوراً کہا۔ "اے پاگل تمہارے اباں کا علاج بھی تو سہر (شہر) کے بڑے اسپتال میں ہو رہا ہے۔ کھیر (خیر) تُو بتا کیا بول رہا تھا تُو۔"

پپو نے فوراً کہا۔ "ماں مجھے ایک لڑکی پسند ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔"

"کیا...... سادی!!! (شادی) سادی کرنا چاہتا ہے تُو۔ ارے پگلا گیا ہے رے تُو۔ ویسے سنے میں دی ہم نے تمہاری بہن۔ سادی (شادی) کرنی ہے تو بانو سے اور کچھ نہ سننا ہمیں۔" روتے ہوئے اماں نے دہائی دی۔ "سچ بولیں ہیں گاؤں کے لوگ سہر (شہر) جا کر بہت خراب ہوت ہیں۔ ہو گیا رے تُو خراب پپو ہو گیا۔"

☆......☆

پپو تو منی کا تو دیوانہ تھا۔ نہ وہ پیچھے ہٹ سکتا تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی اس میں۔ شاید اندر ہی اندر فیصلہ کر چکا تھا کہ زندگی کو گلے لگانا ہے یا اس سے بھاگنا ہے۔ ایک دن مجھے اس کی کال آئی۔ کہنے لگا۔ "فیاض میری کشتی کے پیچھے لے کر پہنچ ریلوے اسٹیشن پر۔ میں جا رہا ہوں۔" میرے پوچھنے پر اس نے صرف یہی کہا۔

"تم کم سے جلدی پہنچ۔"

میں اس کی امانت لیے اسٹیشن پر پہنچا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برقع کے اوپر ایک بڑی چادر لپیٹے آمنہ بھی پپو کے ساتھ تھی۔ میں نے کہا۔ "پپو کہاں جا رہے ہو؟"

پپو نے محبت سے آمنہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم دور جا رہے ہیں۔ ایک نئی دنیا بسانے۔"

ان کے چہرے پر محبت کی جیت پر زمانے کا ڈر تھا۔ درحقیقت وہ جیت چکے تھے۔

ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ آمنہ نے پپو کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھ سے ملنے کے بعد دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔ "ہمارے لیے دعا کرنا۔ ہم واپس نہیں آئیں گے کبھی۔" وہ دونوں چلتی ٹرین کی طرف تیزی سے بڑھے اور پپو مجھے ہاتھ ہلاتا رہا اور دور ہوتا چلا گیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی اک تہ جم گئی۔ وہ آنسو جدائی کے تھے یا پھر خوشی کے، لیکن میرے دل سے ان کی کامیابی کی دعا نکلی۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ پتا نہ چلا پھر پپو مجھے نا ملا اور آج ملا تو وہ پپو نہیں رہا تھا۔ چہرے پر دھول جمی اور پھٹے پرانے لباس میں بیٹھا پپو نہیں کوئی سادھو یا ملنگ لگ رہا تھا۔

"تم پپو ہو نا۔" میں نے جرأت کی۔ "جا بابا تنگ نہ کر۔" اس نے دبے الفاظ میں کہا، لیکن اس کے ہاتھ کی

کافی پر کھد وہ آمنہ کا نام خود گواہی دے رہا تھا کہ آمنہ کو پپو سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں بے اختیار بول اٹھا۔
"آمنہ کہاں ہے اور تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"ادھر ہے وہ۔ کسی کو مت بتانا ورنہ اسے پھر لے جائیں گے وہ لوگ۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ وہ پھر سے چلانے لگا۔
"ماردیں گے اسے، میرے ساتھ رہتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"بھلا محبت کو بھی کوئی مار سکا۔ نا...... نا...... نا۔" اب بھی وہ میرے ساتھ ہے، میں پاگل تا ہوں میں۔" اس کی فرزانگی نے مجھے بھونچکا کر دیا اور میں اس کی یہ حالت دیکھ کر یہ بھی بھول گیا کہ مجھے آج انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ میں نے پپو کو کسی طرح اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کیا اور جیسے تیسے گھر لے آیا۔

☆......☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے پپو کو غسل خانے میں لے جا کر اچھی طرح منہ ہاتھ دھلایا اور اسے ایک حد تک صاف ستھرا کر کے باہر لایا اور اس کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگا۔ اسے زبردستی کھلا کر میں گھر سے باہر لاک کر کے انٹرویو کے لیے نکل گیا۔

☆......☆

آج شاید میری قسمت میرے ساتھ تھی۔ انٹرویو سے کامیاب لوٹنے کے بعد میں اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پپو اور آمنہ کی محبت کیا ہوگی؟؟ یہ سوال میرے ذہن میں چکراتا پھر رہا تھا۔ جیسے تیسے میں گھر پہنچا اور تالا کھول کر اندر آیا۔ دل کو سکون سا مل گیا کیوں کہ پپو گہری نیند میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے سونے دیا۔ جانے کتنے عرصے بعد اسے نیند آئی ہوگی۔

☆......☆

رات کے دس بجے کے قریب پپو کی آنکھ کھلی۔ بشاشت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے اسے کھانا کھلایا اور پھر چائے پینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ پپو شاید کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔
"پپو یار تم بتاؤ نا تمہاری یہ حالت......" میں شدید غم میں گویا ہوا۔ "آمنہ کہاں ہے؟؟" مجھے تو جیسے چین ہی نہ پڑ رہا تھا اور پھر جب میں مایوسی کی اتھاہوں میں پہنچ رہا تھا وہ اچانک بول پڑا اور اس کی بے ربط باتوں سے میں اس کی پوری کہانی کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا جو کچھ یوں تھی۔
جب پپو آمنہ کو لے کر اپنے گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اپنی چھالی پیٹ والی اور آمنہ پر طرح طرح کے الزام لگا کر بہو سمیت گھر سے نکال دیا۔
پپو آمنہ کو لے کر کرائے کے مکان میں آ گیا۔ نئی بندگی روزی چھوڑ کر نئے سرے سے کام ڈھونڈنا خود ایک آزمائش ہوتا ہے۔ پپو بھی بھنور میں پھنس گیا۔ روز صبح کام کے لیے نکلتا، محنت مزدوری کرتا اور گزر بسر کے لیے تھوڑا بہت آسرا ہو جاتا۔ آمنہ کا حسن دنوں میں گہنا گیا تھا۔ مصیبت اور دکھ پریشانی انسان کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ آمنہ اور پپو بھی گھن کی تیزی کی طرح ہو چلے تھے۔
وہ دن اپنے دامن میں پپو کی زندگی میں تاریکی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ پپو صبح آمنہ کو گھر چھوڑ کر کام دھندے کے لیے نکلا۔ شام کو جب گھر آیا تو دروازے پر لوگوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ پپو دیوانہ وار اندر بھاگا۔ دیکھا تو اس کی چیخوں سے آسمان گونج اٹھا۔ آمنہ کی بے حرمت لاش خون میں نہائی پڑی تھی۔ پپو کا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔

☆......☆

قبرستان میں پپو کے قہقہے ہر پل سنائی دیتے تھے۔ آمنہ کی قبر سے لپٹا وہ روتا یا ہنستا رہتا تھا اور پھر ایک مجاور اسے قبرستان سے ایک درگاہ کی اور لے گیا۔ پپو کو سکون میسر آ گیا تھا اور پھر ہوتے ہوتے یہ فقیری حالت میں عبداللہ شاہ غازی پہنچ گیا تھا اور کافی عرصے سے یہیں بسیرا کیے ہوئے تھا اور یہیں وہ مجھ سے ملا تھا۔
اس کی گدلی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو چہرے پر جمی دھول سے راستہ بناتے خشک داڑھی میں جذب ہوئے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور آمنہ آمنہ پکارتا گھر سے باہر چلا گیا۔ پپو مجھ سے ایک بار پھر جدا ہوا اور انسانوں کے بھرے جنگل میں کہیں کھو گیا اور پھر اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہ ملا۔

☆......☆

تایا

خلیل احمد انجم

تنہا تایا کی روح میں اترتی داستانِ عجب گجرات سے

شاہراہ کے اختتام پر پہنچ کر وہ چند ساعتوں کے لیے ٹھہر سا گیا۔ اس کے ٹھہرتے ہی فضا کا ارتعاش بھی تھم گیا اور اس کے اردگرد منڈلاتی ہوئی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بھی، گویا وہ رکا تو اس کی کائنات بھی رک گئی ایک آزردہ کائنات......!

اسے علم تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی موڑ سے چند فرلانگ آگے، بائیں طرف مڑنے والی باریک گلی میں موجود آسودہ حال گھرانوں کے شریر بچے اس کے پرتپاک شرارتی استقبال کے لیے موجود ہوں گے اور گھروں کے بیرونی دہلیزوں پر بیٹھے نہایت بے تابی سے محو انتظار ہوں گے، لیکن جونہی اس کا شکستہ وجود ان کی نگاہوں کے زاویے پر مرتکز ہوگا۔ وہ خوشی سے کلکاریاں بھرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اسے ستائیں گے...... بالکل بے وجہ، بے مقصد...... تنگ کریں گے۔

"ممکن ہے کہ آج پھر کوئی پتھر مار دے۔" اس کے ذہن کے گوشوں میں تحریک پیدا ہوئی اور چہرے کے رنگ میں تغیر بھی نمایاں ہوگیا۔ اس کا وہ زخم ابھی ٹھیک طرح سے مندمل نہیں ہوا تھا۔ جو چار دن پہلے اسے انہی شریر لڑکوں کی قبیح حرکات کے توسط ملا تھا۔ کسی نے اسے کھینچ کر پتھر مارا تھا جو اس کے ٹخنے پر آ کر لگا تھا۔ پتھر چونکہ نوکیلا تھا، جس کے لگتے ہی اس کا ٹخنہ زخمی کر دیا تھا۔

اس کی ضعیف ہڈیوں میں ایسی چوٹوں کو سہنے کی ہرگز قوت نہ تھی، مگر وہ حالات دوراں کی شوریدہ لہروں کے آگے بے بس تھا۔ اس کا بڑھاپا ان لہروں کی شوریدہ سری کو کمزور آنکھوں سے دیکھ تو سکتا تھا مگر ان سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تنہا تھا اور عمر بسری بھی کر چکا تھا، بھلا وہ ایسی صورتحال میں کس طرح ان چالاک و مکار، تیز و طرار لڑکوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

وقت کا سیلاب تھمتا نہیں، جانے کب سے رواں ہے اور کب تلک رہے گا اور رفتہ رفتہ اپنے تیز رفتار ریلے میں ہر ذی روح اور بے جان کو بہاتا چلا جائے گا۔

سیکنڈ منٹوں میں اور منٹوں گھنٹوں کو ارتقا دیں گے اور گھنٹے روز و شب میں ڈھل کر سال، صدیوں کی مدت پوری کرتے رہیں گے اور وقت کا سیلاب اپنی مقررہ رفتار سے بہتا رہے گا۔ وہ بھی وقت کے سیلاب میں پوری طرح غرقاب بہتا چلا جا رہا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے وہیں ساکن کھڑا رہا، پھر کسی نتیجے پر نہ پہنچتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل نہایت برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ دل کی آواز کو وہ اپنی ژولیدہ

سانسوں کے باوجود بھی سن سکتا تھا۔ بائیں طرف مڑنے والی باریک گلی نزدیک آتی جا رہی تھی اور اک انجانے خوف سے اس کی دھڑکن بھی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ پاگل نہیں تھا مگر شرارتی لڑکے اسے پاگل سمجھ کر ستاتے تھے...... اگر وہ پاگل ہے تو وہ کیونکر روزانہ اس طرح اپنے گھر آ جاتا ہے۔ بھلا پاگلوں کا کوئی گھر ہوتا ہے، پاگل تو پتھر مارتا ہے کھاتا تو نہیں۔ اس نے خیال آرائی کی۔ دل کی دھڑکن بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اور پھر

کے بالکل سامنے اختتام پر اس کے گھر کا بلیو رنگ کا گیٹ تھا قم از کم وہ تو تھا ورا!

اس کو یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اسے پتھر نہ کھینچ مارے مگر اس دھڑکے کے باوجود بھی وہ اپنی اسی دُھن میں مشغول تھا کہ وہ گھر پہنچ جائے۔ نیلے رنگ کے دروازے والے گھر، جس سے اس کی زندگی کی تمام یادیں منسلک تھیں۔ ... فضا لڑکوں کی شرارتی آوازوں سے مسلسل گونجتی جا رہی تھی، وہ سب کے سب نہایت غلط الفاظ میں



بائیں طرف مڑنے والی باریک گلی بھی آ گئی اور ایک سماعت کے پردے چاک کر دینے والی صدا نے فضا کو بیزار کر کے رکھ دیا۔

"لو بھئی...... آ گیا ارے بھئی آ گیا جھلا تایا آ گیا۔"

اس کے قدم پوری قوت سے گھسیٹنے لگے۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ جلد از جلد ان شرارتی لڑکوں سے اپنے آپ کو دور لے چلے۔ دور...... تک جھنگ ایک مربع میل آگے دائیں طرف مڑتی ہوئی چھوٹی سی گلی میں...... جس

انسانیت کی عزت و عظمت کے پرخچے اڑا رہے تھے اور ان کی یہ باتیں اس کے کمزور دل پر انتہائی گراں کی صورت تیز دھار نشتر گرا رہی تھیں۔

"لو بھئی آ گیا۔ ارے بھئی آ گیا جھلا تایا آ گیا۔

تایا جھلا جھلا ہے تایا پاگل پگلا ہے گلیاں کھاتا رہتا ہے، گند چھپاتا رہتا ہے۔" وہ طرح طرح ...... مغلظات بک بک کر اس کے کمزور دل کو چھلنی کر رہے تھے اور وہ چپ سادھے ان سے دامن چھڑانے کا خواہاں

تھا وہ جانتا تھا کہ وہ نرگا یا اس نے انھیں اوقات میں رہنے کے لیے کچھ کہا تو وہ حد سے بڑھنے میں بھی دریغ نہیں کریں گے۔ وہ یا تو اسے پتھر ماریں گے یا.... نالیوں کا گھن آلود پانی اس پر اچھالنا شروع کر دیں گے۔

اس کا دماغ کھپانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا اور یہ مشغلہ اس کے لیے سوختہ جاں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ان بدکردار لڑکوں کے ہونٹوں کو سوئی کی آر سے ہی دیتا تاکہ وہ مغلظات بکنے کے لائق ہی نہ رہتے، مگر وہ بے بس تھا۔ وہ نہ تو موچی تھا اور نہ ہی موچی کا اوزار اس کے پاس تھا۔ وہ ان گستاخ لڑکوں کی حرکتوں کا تذکرہ بارہا ان کے سرپرستوں سے بھی کر چکا تھا مگر وہ نہایت مہذب انداز میں اسے مطمئن ضرور کر دیتے تھے، مگر اپنے جگر گوشوں کو ان قبیح حرکات سے منع نہیں کرتے تھے۔ ان پر نہ تو پابندی عائد کی اور نہ ہی کسی قسم کی روک ٹوک..... وہ ہر قسم کی باتوں سے بے نیاز اسے ستاتے تھے اور ستاتے ہی چلے جاتے تھے..... اس کی آمد پر، اس کی روانگی پر اور اس وقت بھی جب وہ دھاگہ لانے کی غرض سے "اظہر بٹ کریانہ اسٹور" پر آتا تھا۔

"لو بھئی آ گیا، ارے بھئی آ گیا، جملا جھپا آ گیا۔"

اور وہ ان کی باتوں پر تلملا کر رہ جاتا تھا۔ اور اندر ہی اندر دل مسوس کر آنسو بہالیتا..... بالکل خشک آنسو.....؟

اتھم و خاطی لڑکیوں کا ٹولہ ان کے تعاقب میں تھا اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، پاؤں کو گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کی طرف گامزن سفر تھا۔ اس کے چہرے پر کرب و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت تکلیف میں تھا، کیوں کہ وہ پاؤں کی سوجن کے عارضے میں مبتلا تھا۔ یہ عارضہ اسے سابقہ ایک سال سے زیر کیے ہوئے تھے اس کے پاس مناسب رقم نہ ہونے کی بنا پر ڈاکٹر نے اس کا بغور معائنہ کیا تھا، بلکہ اسے معمولی سوجن قرار دے کر چلتا کیا تھا۔ تاہم وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ کسی غیر معمولی عارضے میں مبتلا ہو چکا ہے نا کہ معمولی میں.....!

وہ کرب و اذیت میں مستغرق منزل کی طرف رواں دواں تھا اور اپنے پھولے ہوئے پاؤں اور لاغر بے جسم کو گھسیٹ رہا تھا۔ جب "اظہر کریانہ اسٹور" سے اظہر بٹ نمودار ہوا اور پاؤں کی چپل اتار کر ان آفت کے

پرکالوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ "بہت تمہاری خالہ کی.....! بے غیرتو! بزرگوں کو ستاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اظہر بٹ کے اس جارحانہ قدم پر وہ بوکھلا کر پیچھے کی طرف دوڑ پڑے اور ان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اظہر بٹ دوڑتے ہوئے رکا، پاؤں جھاڑ کر چپل پہن لی اور پیچھے سے ہانک لگائی۔

"ذرا آنا سودا سلف لینے..... ملتا ہوں تمہیں۔"

اظہر بٹ کی بات بھی سچ پر مبنی تھی، کیوں کہ ان کے والدین نے اظہر بٹ کی دکان پر ہی ادھار کا کھاتہ کھلوایا ہوا تھا اور جو ادھار دے سکتا ہے وہ خود مختار بھی ہوتا ہے۔

وہ ممنون نگاہوں سے اظہر بٹ کو تکنے لگا جو اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو نے خود بنایا ان کو ڈھیل دی ہوئی ہے، بھلا ایسے چپ چاپ بے غیرت مہذب قوم جان چھوڑتی ہے..... ایک موٹا سا ڈنڈا رکھ اپنے پاس..... پھر دیکھ کون آتا ہے تیرے پاس، بے غیرت اپنے بے غیرتی سے ہی باز آتے ہیں۔"

اس نے اظہر بٹ کی باتیں چپ چاپ سن لیں، جس طرح چپ چاپ اس نے شریر لڑکوں کے مغلظات بھرے الفاظ سنے تھے، وہ اس گہری چپ کے ساتھ ہی خوش تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ مجبوروں کی صدا بے فیض ہی رہتی ہے، پھر اس نے اظہر بٹ سے ایک سفید دھاگے والی نلکی خریدی اور دس کا وہ پرانا سا نوٹ بھی بھنا لیا، جسے وہ گزشتہ ہفتے سے سنبھال رہا تھا، نلکی اسے تین روپے کی ملی تھی، جبکہ سات روپے دو سکوں کی صورت میں اسے اظہر بٹ نے پکڑا دیے تھے۔

وہ جب پاؤں کو گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کی گلی کے سامنے پہنچا تو ایک ریڑھی بردار کھمبے کے ساتھ کھڑا "میٹھے تربوز..... تازے تربوز" کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ سکے ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایک نظر تربوز بھری ریڑھی کو دیکھا اور دوسری نظر ان دو سکوں پر ڈالی جو اس وقت اس کا کل اثاثہ تھے۔ اس کی زندگی کا کل اثاثہ.....!

اس کی نگاہوں میں اپنے چھوٹے بھائی لطیف حسین کے جگر گوشے گھوم گئے، جو اس کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ تین بیٹے اور پانچ

بیٹیاں...... دو بیٹیاں اور دو بیٹے تو شادی شدہ، اپنی خانہ داری میں مشغول تھے، جبکہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ابھی گھر میں ہی تھیں۔ خدا نے انہیں بہت زیادہ حسن و فراست سے نوازا تھا۔ دو بہنیں اور بھائی تو زیر تعلیم تھے، جبکہ ایک امور خانہ داری کے لیے مختص تھی۔ اگر سچ کہا جائے تو اسے علم سے رغبت ہی نہ تھی۔ اسے رغبت تھی تو ٹی وی سے اور بس...... ٹی وی سے۔"

اس کی کمزور نگاہوں میں جب اپنی اولاد جیسی بھتیجیاں اور بھتیجے جھلملائے تو معاً اسے اپنا اصغر اور نسرین بھی یاد آ گئے لیکن جلد ہی اس نے انہیں ذہن کے گوشوں سے جھٹکا اور ریڑھی والے سے مخاطب ہوا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔

"بیٹا! یہ تربوز کس بھاؤ میں دے رہے ہو؟" اس کے لہجے میں استفہام تھا۔

"بابا! تو بھاؤ کو چھوڑ...... بول کتنے لے گا......" نوجوان تیزی سے بولا پھر ہانک لگائی۔ "میٹھے تربوز لے لو...... تازے تربوز...... سرخ تربوز...... آزما کے لو جی...... کھا کے لو۔" پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "بابا کتنے چاہئیں؟ ایک...... دو...... تین؟؟"

"چاہیے تو ایک ہی...... مگر!" اس نے وا ہتھیلی اس کے سامنے کر دی، جس پر دو سکے سورج کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔

"او چاچا......! یہ بھی کوئی سکوں کا زمانہ ہے۔" نوجوان حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ "میرا چھوٹا بچہ صبح اسکول جاتے ہوئے اس کے نوٹ سے کم نہیں لیتا۔ اور تو......"

"بیٹا! میں نے بھی اپنی بچیوں کے لیے ہی لینا ہے۔" اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔ "میں نے کون سا خود کھانا ہے؟"

نوجوان نے اس کے گھمبیر ملتجیانہ چہرے پر نگاہ دوڑائی اور تھوڑی رگڑنے لگا۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا، پھر وہ قدرے خفگی سے بولا۔

"تو پہلا گاہک ہے اور پہلے گاہک کو خالی نہیں موڑنا چاہیے، یہ فروخت کاری کا اصول ہے......" پھر اس نے قدرے ہلکا سا تربوز تلاش کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی رمق لہرا گئی۔ اس نے سکے ریڑھی کے کونے میں رکھے اور رعشہ زدہ ہاتھوں سے لپک کر تربوز پکڑنا چاہا مگر اس کے کپکپاہٹ زدہ ہاتھوں سے وہ پھسلا اور نیچے پختہ گلی کی اینٹوں سے جا ٹکرایا اور شق ہو گیا۔ قبل اس کے کہ وہ نالی کے گھن آلود پانی میں شامل ہوتا وہ بری طرح اس کے اوپر گر پڑا۔ ایک گہرا کرب اس کے پُر مسرت چہرے پر در آیا۔ اس کے مجہول ہاتھوں نے تربوز پکڑ تو لیا تھا مگر اس کے پاؤں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

وہ بڑی مشکلوں سے تربوز کو سنبھالتے ہوئے اٹھا اور پاؤں کو گھسیٹنے لگا۔ فضا میں ایک مرتبہ پھر ارتعاش اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ حاوی ہو آئی تھی، لیکن وہ ان سب سے بے نیاز نیلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆

حالات کی بساط پر مُہرے ہوئے متحرک چہرے کب چالیں کھاتے ہیں، اس کا ادراک مقدر اور تقدیر کے ماسوا کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی بساطِ حالات پر ایک مہرے کی سی حیثیت حاصل تھی، مگر چالیں کھانے کے متعلق چنداں ادراک نہ تھا۔

وہ شریف حسین سے "تایا" کس طرح بنا......! یہ تمام کارستانی تقدیر و مقدر کی ملی بھگت تھی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ وہ ایک بہت ہی پُر مسرت گزرتے دسمبر کی شام تھی، جب لطیف حسین کی اہلیہ و رفیقہ بن کر صغریٰ اسی نیلے رنگ کے دروازے والے گھر میں وارد ہوئی تھی۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک نہایت ہی تیز و طرار لڑکی تھی، جس نے آتے ہی اس کی بیوی رخشندہ پر صدارت کرنی شروع کر دی تھی۔ رخشندہ اس وقت اس کے ایک بیٹے اصغر اور بیٹی نسرین کی ماں تھی۔ اسے اپنی بیٹی نسرین سے بہت پیار تھا۔ بیٹیوں سے پیار کس کو نہیں ہوتا، گو کہ انہیں پرائے گھر کی زینت بننا پڑتا ہے، مگر ہوتی تو اپنا ہی خون ہیں نا......!

صغریٰ بیگم گو کہ اس کی بھابی تھی، لیکن وہ اس کے چبھتے ہوئے الفاظ اکثر محسوس کرتا تھا مگر کہتا کچھ نہیں تھا۔ اسے تھوڑا تھوڑا سا شک ضرور تھا، لیکن اس کا شک اس وقت حقیقت کے روپ میں ڈھل گیا جب اس کی بیوی نے علی الاعلان یہ کہا کہ "یا تو وہ اس گھر میں رہے گی یا پھر

صغریٰ......"

اس نے اپنی بیوی کے علاوہ صغریٰ بیگم کو بھی سمجھایا کہ "حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کرو......" مگر اس وقت اسے منہ کی کھانی پڑی جب اسے اپنی بیوی رخشنداں نے ہی گھر سے اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ "وہ کسی سمجھوتے کی قائل نہیں ہے، وہ اسے علیحدہ کرے یا لطیف حسین کی بیوی صغریٰ کو......"

بساط حالات پر مہرے متحرک رہے تھے اور چلی کھانے کی منہ توڑ کوشش میں مصروف عمل تھے، وہ بے بس تھا، کیوں کہ نہ تو اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی گھر تھا اور نہ ہی مقررہ رقم جس سے وہ کوئی علیحدگی اختیار کر کے سرخ ہو سکتا، نتیجتاً وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا، مہرے چلی کھا گئے۔

رخشنداں اپنے دونوں بچوں سمیت میکے چلی گئی، ستم یہ ہوا کہ اس نے دو ماہ بعد خلع کی اپیل دائر کر دی، عدالتی چارہ جوئی ہوئی۔ وہ عدالت کی طرف سے دیے گئے احکامات کو بر سرپیکار نہیں لا سکتا تھا، مجبوراً اسے طلاق نامے پر دستخط کرنے ہی پڑے، جب ان کاغذات پر اس نے قلم چلایا تھا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ اپنے دل کو چھید رہا ہے۔

اب وہ تنہا و یکتا رہ گیا تھا۔ اس کی عمر ابھی حد تک نہیں گزری تھی کہ وہ دوبارہ شادی کے بندھن میں نہ بندھ سکتا، لیکن وہ دوبارہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو رخشنداں کی یادوں سے شادی کر لی تھی، جس میں اس کا اصغر بھی اسے میسر تھا اور پیاری اور معصوم نسرین بھی......!

وہ ایک درزی تھا اور لوگوں کے تن کو ڈھانپنا اس کا کاروبارِ حیات تھا۔ وہ گھر میں ہی ٹیلرنگ کا کام کرتا تھا۔ رخشنداں کے ہوتے ہوئے وہ بہت محنت کیا کرتا تھا، مگر جونہی وہ گئی، سلائی مشین سے اس کا دل بھرنے لگا، کام سے دل چرا رہا تھا تو عمر کا جوش بھی ڈھل رہا تھا۔ مزید اس پر سوختہ جاں صغریٰ کی باتیں ہوتی تھیں، جو وہ اس پر طعن و تشنیع کے ساتھ مارتی تھی۔ وہ گھر کے ماحول کو مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے چپ پر ہی قائم رہتا، ورنہ وہ تو سربراہِ خانہ تھا، کوئی بھی فیصلہ صادر کرتا تو سب کے لیے مشترکہ عتاب کا پیامبر بن جاتا۔

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ محوِ اڑان رہا اور لطیف حسین کے ہاں یکے بعد دیگرے پانچ بچے پیدا ہو گئے۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں، بعد ازاں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں مزید پیدا ہوئی تھیں۔

قدرت نے انہیں خوب صورت و وجیہ شکل اور فہم و فراست میں بھی نمایاں بنایا تھا۔ اب وہ وقت کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہونے لگا تھا اور لطیف حسین کے بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے تھے اور صغریٰ و لطیف کی کنپٹیاں بھی جب سفید ہونے لگیں تو ایک دن یکدم ہی اسے رخشنداں کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے وہاں گیا اور اس کے جنازے میں شریک ہوا اور وہیں اس نے تقریباً اٹھارہ سال بعد اپنے بیٹے اور بیٹی کا دیدار کیا...... خدا نے لطیف حسین کے بچوں کی طرح اس کے جگر گوشوں کو بھی بہت خوش شکل اور ذہین بنایا تھا! بارہا اس کا من چاہا کہ وہ اپنے اصغر اور نسرین کو سینے سے لگا لے، مگر پھر اس نے اپنی اس خواہش کو اپنے اندر ہی کچل ڈالا اور ہزاروں حسرتوں کو سینے میں دفن کیے ہوئے اسی نیلے رنگ کے دروازے والے گھر میں آ گیا، جہاں پر کبھی اس کا اصغر اور نسرین کلکاریاں بھرا کرتے تھے، ہنستے تھے، مسکراتے تھے اور کھلکھلاتے تھے بالکل تر و تازہ گلاب کی طرح......!

اس کے بھائی لطیف حسین اور گلی محلے کے تمام بچے اسے "تایا" کہہ کر پکارتے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کا "تایا" بن گیا۔ سب اسے "تایا" ہی کہہ کر پکارنے لگے حتیٰ کہ لطیف حسین اور صغریٰ بیگم بھی......!

بساطِ حالات پر بکھرتے ہوئے مہروں نے اسے "تایا" سے منسوب کر دیا تھا اور وہ اس پر معترض بھی نہیں تھا۔ اسے جب صغریٰ بیگم کی باتیں بہت زیادہ تنگ کرنے لگیں تو اس نے راتیں گھر میں گزارنا ترک کر دیں، بلکہ وہ راتیں شہر جا کر بتانے لگا۔

لوگوں نے اسے کئی بار سینما کا گیٹ عبور کرتے ہوئے دیکھا تھا، مگر وہ فلموں کا رسیا نہیں تھا کہ رات بھر فلمیں دیکھتا رہتا...... لیکن کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ فلمیں دیکھتا ہے یا نہیں...... البتہ وہ بنا کسی عذر کے گھر بھی نہیں رہتا تھا اور دن گھر سے باہر بھی نہیں بتاتا تھا۔

☆.....☆

وہ اپنے سوجن زدہ پاؤں کو گھسیٹتا ہوا اپنے بلیو کلر گیٹ والے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہی، شناسائی کی ایک تیز مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو پل بھر کے لیے وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں مستغرق ہو گیا۔ مرحومہ درخشندہ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی یادیں، بیٹی اور بیٹے کے قہقہوں سے مزین ساعتوں کی شناسائی اور دکھ و تکالیف اور عذاب مسلسل سے عبارت ہر پل موت و حیات کی کشمکش میں غرقاب زندگی کی آشنائی.....!

اس کا دل چاہا کہ وہ بلک بلک کر رو پڑے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس نے گو کہ جبر مسلسل میں زندگانی گزاری تھی، مگر کبھی اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ کسی کو کر دیا کچھ نہیں تھا تو کسی سے کچھ لینے کے لیے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا تھا، لیکن پھر بھی اسے دنیا نے غموں، تکلیفوں اور ٹھوکروں کے علاوہ کچھ نہیں دیا تھا۔ اسے ہمیشہ بے صبر گردانا تھا اور ہمیشہ اسے جاں گسل ڈنک مار کر اذیت ناک لمحات سے نوازا تھا۔ وہ اپنی قسمت کی غیر جانبدارانہ روش پر پیچ و تاب تو کھا سکتا تھا مگر اسے حرف غلط کی طرح جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ یہی قسمت ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ ایک عذاب ناک حقیقت..... جس کے پاؤں کے درمیان وہ ٹڈی کی طرح پس کر رہ گیا تھا۔

اس نے حسرت زدہ انداز میں بیلگوں دروازے پر ہاتھ پھیرا، جیسے وہ اسے بے حد عزیز ہو، صد درجہ عزیز اور پھر ساتھ ہی اس کے حسرت زدہ ہاتھوں نے اپنے عزیز کو تھپتھپا دیا۔ فضا میں اس کی تھپتھپاہٹ کی مخصوص آواز گونجی اور پھر ہمیشہ کی طرح اندر سے آصفہ نے کنڈی کھول دی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر محبتوں سے لبریز آواز میں اپنا اثاثۂ جاں اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ..... یہ..... میں..... تمہارے لیے، لایا ہوں۔" اس کے لہجے میں گہری محبت مضمر تھی۔

"مگر..... تایا.....!" وہ دانتوں میں انگلی دباتے ہوئے بولی۔ "یہ..... یہ..... میں تو نہیں کھاتی مجھے تو..... مجھے تو۔" وہ نظریں چرانے لگی، پھر یکدم ہی کھل اٹھی۔

"ہاں..... مجھے تو اس سے ہیضہ ہو جاتا ہے۔"

اس کی کمزور نگاہوں نے پُر شکوہ سے انداز میں اپنے ہاتھ میں موجود تربوز کو دیکھا، پھر اسی سے پُر شکوہ لہجے میں بول پڑا۔

"لو بھئی..... تجھے تو..... کوئی کھانے کو ہی تیار نہیں، اب بتا کیا کریں؟"

آصفہ اس کی اندرونی کیفیات سے بخوبی واقف تھی، لہٰذا بلا کسی توقف کے اس کے ہاتھوں سے تربوز چھینتے ہوئے گویا ہوئی۔

"تایا، ایسا کرتے ہیں کہ اسے کاٹ کر لاتی ہوں، پھر ہم دونوں اسے کھاتے ہیں، ویسے بھی مجھے بھوک لگی ہوئی ہے آپ کو بھی لگی ہوگی۔ اور..... اور....." وہ بات بنانے لگی۔

"ہیضہ کا کیا ہے؟ ہو گیا تو ہو گیا!!"

"مگر....." قبل اس کے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کی بھتیجی تتلی کی طرح اڑ گئی اور اس کی زبان بہت کچھ کہنے کی آرزو میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے لیے تو ہرگز تربوز نہیں لایا تھا۔ وہ تو اپنے بچوں جیسے لطیف کے بچوں کے لیے لایا تھا..... اور وہ بچے تھے کہ بس.....!

وہ ایک پل کے لیے ٹھٹکا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کی شناسائی کی ہر ہر چیز اسے خاموش لفظوں میں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ سیڑھیاں، برآمدہ، ستون اور اس کا صحن کمروں کے درمیان تنہا کمرہ جس میں اس کی سلائی مشین، ویٹ ڈرائنگ کے بجائے، جس پر وہ استری اور مزید مطلوبہ سامان بڑی نفاست سے سجاتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی ٹوٹی ہوئی ادوائن والی شکستہ چارپائی، جو اس کے بڑھاپے کی واحد رفیق تھی، مگر صرف دن کے چند مخصوص پہروں کے لیے.....!

وہ اپنے سوجن زدہ پاؤں کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا اور ازار بند سے بندھی ہوئی چابی کھول کر ہاتھ میں کر لی۔ صغریٰ کے سامنے آصفہ بھی کٹی کھڑی تھی۔ ہاتھ میں وہی توشہ تھا جو اس نے اپنے سونپا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے خوا مخواہ تربوز لا کر بھتیجی کو جھاڑ پلوا دی، صغریٰ بیگم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور آصفہ اس کے سامنے پشیمان کھڑی تھی اور اس کی کڑوی کسیلی باتیں سہہ رہی تھی۔

"اب..... اس مردود کا دماغ چل گیا ہے کہ کیسا کچرا گھر سے پیدا ہوا اٹھا لایا ہے، اس کی حالت نہیں دیکھتی۔ ایسا لگتا

ہے جیسے پانچ سالوں سے غسل ہی نہیں کیا ہے، جا پھینک اسے کچرے کی ٹوکری میں۔ بڑی آئی ہے تایا کا پیار سراہنے والی۔"

یہ سن کر اس کے دل پر جیسے چھریوں کے گہرے وار ہوئے مگر وہ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ اس وقت بھی کچھ نہیں بولا تھا جب وہ بولنے کا اہل تھا اور ابھی تو وہ اس کا اہل بھی نہیں رہا تھا۔ ابھی تو وہ ایک پرایا تھا اور پرایوں سے اپنوں کا سلوک یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا اس نے سوچا۔

صغریٰ بیگم کی کڑواہٹ آمیز باتیں ابھی جاری تھیں اور وہ مسلسل اول فول بکے جا رہی تھی۔

"رات بھر کھانستا رہتا ہے اور صبح ہوتے ہی گھر یاد آ جاتا ہے، ارے..... یہ تو آج کل کی نئی نسل سے بھی گیا گزرا ہے۔ وہ آدھی رات کو پلٹ تو آتے ہیں اور یہ..... یہ تو تف ہے۔ توبہ توبہ۔"

اس نے خاموشی سے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ وہ صغریٰ کے منہ لگنا ہی نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ اس کی تو عادت ہی یہی تھی اکڑی، کڑوی کسیلی باتیں کرنا۔

اس کا سامانِ حیات اسی طرح بے ترتیب انداز میں بکھرا ہوا پڑا تھا، جس طرح وہ بے ترتیب چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور جس طرح بے ترتیب اس کی رخشندہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی، اس نے یاسیت بھری نگاہ سے کمرے کے در و دیوار کو گھورا، جا بہ جا سے اکھڑا ہوا پلستر جہاں موقع غنیمت جان کر کاکروچوں نے اپنے مسکن بنا لیے تھے۔ چھت کے علاوہ کونوں میں بے تحاشا لٹکتے ہوئے مکڑیوں کے جالے اور کمرے کی نم آلود فضا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب اس کمرے میں اس کی شریک حیات ہوتی تھی تو کمرہ کیسے جگمگاتا تھا۔ مسکراتا تھا! اور ابھی اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سلائی مشین اور دیگر بیماری پیٹی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے چارپائی پر جا بیٹھا..... چند ساعت کے لیے وہ کھلے دروازے کو گھورتا رہا، پھر اٹھ کر دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔

اس روز خلافِ معمول اس کے پاؤں میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں گہری تاریکی چھائی گئی۔ اس کے کمرے میں الیکٹریکل سرکٹ موجود تھا مگر بلب فیوز ہو گیا تھا، اس لیے روشنی کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا، اس نے زندگی کے تمام کرب و ملال بڑی خوش اسلوبی سے جھیلے تھے۔ اس لیے اب وہ پاؤں کے درد سے بھی بالکل بے پروا تھا۔ اسے اپنے پاؤں کے عارضے کے متعلق سب کچھ صاف صاف ادراک تھا، مگر وہ دوسروں کو اس کے متعلق کچھ بھی بتانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے تمام کرب تنہا جھیلے تھے اور یہ بھی وہ تنہا ہی برداشت کرنا چاہتا تھا، اسے معالج نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور وہ سمجھ بھی گیا تھا۔

وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور کھلی آنکھوں سے ماضی کے حقیقی سپنے دیکھ رہا تھا۔ جس میں اسے رخشندہ کا پیار بھی میسر تھا اور بچوں کی رفاقت بھی..... مگر حقیقتِ حال میں ایسا ہرگز نہ تھا، وہ اکیلا آیا تھا، بالکل اکیلا..... اپنا کیلے کمرے میں.....!

☆.....☆

وہ دن گزر گیا..... اس سے اگلا بھی گزر گیا، مگر اس نے اگلے دن.....!

"تایا مر گیا، تایا مر گیا" تمام گلیوں میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ نیلا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور عورتیں اس کی لاش کے اردگرد جمگھٹا بنائے بیٹھی ہوئی تھیں اور صغریٰ بیگم انہیں تمام حالات سے مطلع فرما رہی تھی۔

"ارے پرسوں آیا تھا۔ اچھا بھلا تھا، لڑکی کو بڑے پیار سے تربوز بھی لا کر دیا تھا، مگر خود کمرے میں چلا گیا۔ ہم نے سمجھا چلا گیا ہے، مگر۔" وہ پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر عورتیں آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔

"ارے ..... وہ تو بیمار تھا۔ ایسے ہی کہہ رہی ہے کہ اچھا بھلا تھا۔"

"ہاں..... ہاں۔" ایک اور بولی۔ "بے چارے کے پاؤں خراب تھے، بڑی مشکلوں سے چلتا تھا۔"

"ہاں بالکل..... تم ٹھیک کہتی ہو، میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔" ایک اور آواز ابھری اور پھر نجانے کتنی ہی آوازیں ابھریں اور معدوم پڑتی رہیں۔

ان سب سے بے نیاز آصفہ تایا کے کمرے کے سامنے بنے ستون سے ٹیک لگائے کسی ماندے ایک ہی چیز کو تکے جا رہی تھی، اس کی آنکھوں سے نہ تھمنے والا

سیلاب بہہ رہا تھا۔ وہ آہ و بکا تو نہیں کر رہی تھی، مگر وہ دل کے آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اسے اپنے محترم و مرحوم تایا کے مرنے کا از حد افسوس تھا اور سب سے زیادہ اسے رُلانے پر مجبور کچرے کی وہ ٹوکری کر رہی تھی۔ جس میں ایک شق تربوز باسی ہوا پڑا تھا، جس کی مالیت پیار و محبت کی وہ بے انتہا دولت تھی، جس کا بدل وہ کبھی بھی چکا نہیں سکتی تھی۔

وہ تربوز تایا کچرا گھر سے اٹھا کر تو نہیں لایا تھا، مگر اب اس نے کچرا گھر ہی کی زینت بننا تھا۔

☆....☆

تایا دفنائے جا چکے تھے، ان کے بیٹے اصغر حسین نے بھی اُن کی میت کو کندھا دیا تھا اور تینوں بھتیجوں نے بھی۔

فاتحہ خوانی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ جس میں وقت گزارنے کے علاوہ، اخبار وغیرہ سے بھی شغل کیا جا رہا تھا اور کارگاہ حیات میں بھی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، دنیا کی افزائش آ بھی رہی ہے اور جا بھی رہی ہے، بندے جی رہے ہیں اور مر بھی رہے ہیں اور تایا جیسے بے ضرر انسان تو اکثر مرتے رہتے ہیں۔

بیٹھک میں تمام صاحب مشغول و مصروف تھے کہ ایک سفید پوش باریش آدمی اندر آئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے، فاتحہ پڑھنے کے بعد گویا ہوئے۔

''میرا نام ڈاکٹر دلشاد فاروقی ہے، کلیانہ روڈ پہ میرا کلینک ہے، خدائے اعلیٰ و ارفع مرحوم و مغفور کو سایہ رحمت میں جگہ نصیب فرمائے (آمین) مرحوم..... بہت ہی نیک سیرت اور اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے، مجھے اکثر ملتے رہتے تھے بلکہ روز ہی ملتے رہتے تھے، گزشتہ تین دن سے نہیں ملے تو تشویش لاحق ہوئی، پتا چلا کہ شریف صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ خیر..... تشویش تو پہلے بھی تھی۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر متوقف ہوئے، پھر بولے۔

''انہوں نے یقیناً آپ کو بھی بتایا ہوگا کہ وہ ہڈیوں کے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے اور اس کے تمام اثرات ان کے پاؤں پر واقع ہوئے تھے جو جلد یا بدیر دوسری ہڈیوں کو بھی متاثر کرتے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تفصیلی معائنہ بھی کروایا تھا اور انہیں علاج کی بھی پیشکش کی تھی، کیوں کہ میرے دوست نجی ہسپتال میں ہڈیوں کے کینسر کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر افتخار مسعود ان کا نام ہے، مگر انہوں نے میری باتیں سُنی بھی اَن سنی کر دیں اور ابھی وہ اسی عارضے کے باعث۔'' ڈاکٹر دلشاد فاروقی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گئے۔

''مگر ڈاکٹر صاحب، تایا جی بذات خود یعنی میرا مطلب ہے کہ بطور پیشنٹ آپ کے پاس جاتے تھے؟'' لطیف حسین کے صاحبزادے ثاقب نے استفسار کیا۔ اس کے لہجے میں استفہامی گھمبیرتا تھی۔

''ارے نہیں بیٹا، وہ اس حق میں کہاں تھے۔'' ڈاکٹر دلشاد فاروقی صاحب گویا ہوئے۔

''انہیں تو جس طرح اصرار ''میں ڈاکٹر افتخار مسعود کے پاس لے کر جاتا تھا اپنا نام کر کے وہ تو میں ہی جانتا ہوں۔ کہتے تھے کہ خدا نے گر درد دیے ہیں تو وہی درد میٹے گا بھی، معالج کے پاس جانا تو اپنی توہین سمجھتے تھے۔'' وہ رُکے اور پھر نگاہیں چرا کر بولے۔ ''لیکن حقیقتاً وہ کسی کا احسان لینا ہی نہیں چاہتے تھے۔''

''کیا آپ انہیں سینما ہاؤس سے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے؟'' ثاقب نے تیزی سے پوچھا۔

ڈاکٹر دلشاد فاروقی صاحب نے بہت ہی عجیب نگاہوں سے ثاقب کو گھورا، وہ جھینپ سا گیا مگر بولا کچھ نہیں۔

''ارے نہیں برخوردار!'' ڈاکٹر دلشاد فاروقی صاحب نہایت تاسف آمیز لہجے میں بولے۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا وہ تو ''مسجد نور'' میں نماز پڑھتے تھے اور وہاں اس ناتے خدا کی عبادت میں ہی تمام رات گزار دیتے تھے کہ کافی عرصے سے مسجد میں کوئی واہیات قسم کے لوگ چوریاں کرنے لگ پڑے تھے، وہ تو اللہ کے گھر میں ایسی قبیح حرکات کی روک تھام کے لیے خود ہی مامور تھے اور ان کی اس ذمے داری کے بعد وہ خاطی اس سے باز ہونے پر بھی مجبور ہو گئے تھے۔''

ثاقب کو اپنی بات پر خود ہی شرمسار ہونا پڑا، کیوں کہ مذکورہ مسجد سینما ہال کے بالکل عقب میں واقع ہے، جہاں تایا نے اپنی ڈیوٹی از خود لگائی تھی کہ وہ اپنے رب کے گھر کی حفاظت کریں گے، لیکن کم تر ذہنی سوچوں نے اسے تایا کی ذات سے منسلک کر کے سینما کی آڑ لے کر غلط حوالوں سے مشہور کر دیا تھا۔

☆....☆

ملنگنی



ارشد علی ارشد

اپنوں سے حیل اور حقیقت کی تہہ سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز دلچسپ سرگزشت

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 16

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملنگنی ایک نہایت ذہین و سمجھدار اور دوسروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور عجیب حالات رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں ظہیر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور بھابی بتول کے علاوہ غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو ساول سے محبت ہو گئی ہے۔ ملنگنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی مخصوص طاقت سے بڑی اسکرین بنا کر ماضی میں آباد ہڑپا سماج کا ایک منظر دکھاتی ہے۔

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، کہتیں سکھاں اور سمفانوں کے عظیم ماضی، اسلاف کے کارنامے سنتی اور دکھاتی ملنگنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ ساول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ ملنگنی کے بھائی ظہیر کی دلہن دو ماہ قبل سے پہلے شادی کرادی جاتی ہے۔ ملنگنی اسی دوران میں ساول سے کہہ کر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اس سے بدتمیزی کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اسی دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی ذوالفقار خالد کے بیٹے سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز پتا چلتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، ملنگنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ ملنگنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن ملنگنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر ملنگنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تم آؤ گی اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے ملنگنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھڑی کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں ملنگنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ ملنگنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم ملنگنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو ملنگنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ملنگنی ذہنی دیوار بن کر اس کا نظارہ کر کے دکھا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ملنگنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اسے گھر واپس لے آتے ہیں جہاں ملنگنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ ملنگنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا تیج کے باعث بستر پر پانی سے لگ گیا ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا



ہے جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔
ملکی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے جو باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔
ملکی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کہیں اور جا پہنچتی ہے۔ ذہن کی اگلی حسست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی جب اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر رک گئی۔ گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ وڈیرے کے بیٹے بلاول نے ملکی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "ملکی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔" ملکی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا ملکی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ ملکی حیران تھی کہ اس کی ٹانگوں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہی۔ گاڑیوں، رکشا اور سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔
"میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟" یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیزہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ زمین پر گر پڑی اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔
جب ملکی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈ روم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک ادھیڑ عمر جوان اور ادھیڑ عمر کی باوقار ایک خاتون اور شلوار اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ملکی خود سے سوال کرتی ہے۔ پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور ملکی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر ملکی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام امن چندر دہ سنگھل بتاتا ہے۔ وہ ملکی سے کہتا ہے کہ اس کا نام [illegible] ہے [illegible] اس دنوں بعد مکمل ہوش میں آ کر اس نے بات کی ہے مگر اس سے پہلے [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ امن اسے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت ضلع گھوٹکی کے ایک گاؤں کوٹھ چندن میں ہے۔ ملکی امن سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟
امن ملکی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح [illegible] دریا کے کنارے موجود تھے جہاں ملکی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی۔ ملکی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ ملکی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا [illegible] ہے لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے [illegible] میں اہم پیغام پہنچایا جا چکا ہے اور اس کے لیے وہ امن نے انتظار میں کی ہے۔ تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ [illegible] ہو کر ان کے [illegible] پیش ہوتے تھے اس کے لیے ملکی کو ایک خالی سفید دیوار پہلے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو ملکی انہیں اپنے مذہب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ کچھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں، پتھر، پیپل، تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سارے عقیدے توحید ہی پر ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بابت سمجھاتی ہے اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ ملکی کی بات سے وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں تب امن ملکی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ملکی وہاں سے فرار ہو کر انکل فہیم کے گھر جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات [illegible] سے ہوتی ہے جو انکل فہیم کی بیٹی ہے اور جس میں ملکی کی ملاقات [illegible] صورت میں ہوئی تھی۔ انکل فہیم ملکی سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ [illegible] ملکی کو پہچانتی ہے جو ملکی کے متعلق بتاتی ہے کہ یہ [illegible] ملکی ہے [illegible] رحیم اللہ ترکمان کی بیٹی۔ تب بچپن سے لے کر لڑکپن اور جوانی تک کے سارے حالات و واقعات ملکی کی نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔ پھر ملکی کی [illegible] ابو حنیفہ کے بارے میں [illegible] ہے۔
[illegible] ملکی کی [illegible] ہے کہ رحیم اللہ ترکمان کے گھر پیدا ہونے والی عام سی لڑکی کے پاس اس قدر علم کا ذخیرہ موجود ہے۔ ملکی [illegible] سے انسان کے متعلق پوچھتی ہے جو [illegible] سے پیار کرتا ہے۔ ملکی [illegible] سے اپنے گھر جانے کا کہتی ہے۔ [illegible] کے والد فہیم ملکی کو اس کے گاؤں [illegible] چھوڑ آتے ہیں۔ ملکی کو گاؤں میں کوئی نہیں پہچانتا وہ اپنے گھر پہنچتی ہے تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ ملکی یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ تب وہ چوپال میں بیٹھے والے افراد سے چاچا جات ان کے متعلق پوچھتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ملکی [illegible] کو چوہدریوں نے اٹھا لیا تھا۔ رحیم اللہ کا بیٹا بھی اس کی طرح غیرت مند تھا اس نے چوہدری کے گھر میں گھس کر اسے مار ڈالا خود [illegible] جیل میں ہے اور گھر والوں کو راتوں رات چاچا نے کہیں بھیج دیا ہے۔ یہ سن کر ملکی رو پڑتی ہے اور وہاں سے چل پڑتی ہے۔ راستے میں وہ ساون کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہے ساون جیسے ہی اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ ملکی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے ساون ملکی کو اپنے گھر لے جاتا ہے ساون کی ماں [illegible] ملکی کو کہتی ہے کہ تیرے جانے کے بعد تیرا [illegible] گھر پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے تمہارے بھائی مظہر

نے تو چوہدری راحیل کو مروا ڈالا مگر چوہدری نثار بھائی اور باپ کی موت کا بدلہ پورے عہد اور گھر سے لینے لگا۔ گاؤں کا کوئی مرد رات میں نہیں سوتا۔ گاؤں کی ساری عورتیں خوف کے سائے میں زندگی گزار رہی ہیں۔ سانول کا باپ ملسی کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آ جائے۔ سانول ملسی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر ملسی انکار کر دیتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے جہاں تالا لگا ہوا تھا وہ سوچتی ہے کہ رات کے اس پہر تالا توڑنے کی آواز سے سب اٹھ جائیں گے اور پڑوسیوں کو پتا چل جائے گا کہ رحیم اللہ ترکھان کے گھر کے دروازے کا تالا کوئی توڑ رہا ہے۔ ملسی اللہ سے دعا مانگتی ہے۔

(اور اب آگے پڑھیے)

میں نے آنکھیں بند کر کے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت علاء بن الحضرمیؓ کی دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جب آنکھیں کھلیں تو میں گھر کے اندر تھی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا مگر جس جگہ زندگی کی بے شمار حسین اور بیتی گزری ہوں وہاں کا چپہ چپہ ازبر ہو جاتا ہے، میں سیدھا ابا کے کمرے میں داخل ہوئی، یہاں بھی ظلمت کے سائے تھے، مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا وہ چارپائی جہاں ہمیشہ ابا سویا کرتا تھا، اسی چارپائی پر ابا نے آخری ہچکی لی تھی، میں چارپائی پر بیٹھ کر اس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

جب اپنے کمرے میں آئی تو تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے کمرے کی لائٹ جلا دی، البتہ لائٹ جلانے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں سکھاں کی چارپائی پر ٹک گئی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی سکھاں مجھے آواز دے گی، میرے سامنے چونے کی سفید کھردری دیوار تھی، اس دیوار پر سکھاں صلاح الدین ایوبی کو بھاگتے دوڑتے دیکھا کرتی تھی، میں نے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ گھر والوں کو یاد کرتی رہی اور روتی رہی، آخر تھک ہار کر چارپائی پر گر گئی۔ لیٹے ہوئے بھی ذہن ماضی میں گھومتا رہا، خیالات کی دنیا میں بھٹکتی ہوئی مجھے کب نیند آئی پتا ہی نہیں چلا، پتا تب چلا جب زور زور سے ڈھول پیٹے جانے لگے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، کچھ لمحے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیانی احساس میں جتا رہی، ڈھول مسلسل بج رہے تھے، میں نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو رگڑا اور سر کو جھٹکا دیا۔ یہ دورانیہ چند سیکنڈ پر محیط تھا اس کے بعد میں مکمل شعور میں آ گئی، جسے میں ڈھول سمجھ رہی تھی وہ دروازہ تھا۔ جسے بڑی بے دردی سے پیٹا جا رہا تھا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ صبح کا سفیدہ پھیل رہا تھا، باہر سے شور و غل کی آوازیں بھی آ رہی تھیں، میں سمجھ گئی میرا دوگھر اپنوں کو میرے لوٹ آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے حالات سنگین



دے رہے تھے کہ میرے لیے مشکل گھڑی آنے والی ہے۔ دروازے کی ترتراہٹ بڑھنے لگی تھی۔ میں نے قیاس لگایا اگر دروازہ نہ کھولا تو وہ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔ میں نے چادر اوڑھی اور عقبی دیوار کی طرف دوڑ لگا دی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر میں ٹھٹھک کر رک گئی جو کچھ رات میں پڑھا تھا وہ بدحواسی میں ذہن سے نکل گیا۔ اب تھوں اور اونچی دیوار کے اس پار جانا ناممکن تھا۔

"دروازہ کھول ملکئی۔ ہم جانتے ہیں تم اندر ہو۔" باہر سے چیخ کر حکم جاری کیا گیا۔

"تم نے دروازہ نہ کھولا تو ہم اسے توڑ دیں گے۔" یہ دوسری آواز تھی، ساتھ ہی دروازے کو زور سے دھکا لگا۔

"دروازہ توڑ دو یار انتظار کیوں کرتے ہو۔" تیسری آواز کے ساتھ ہی دروازہ بری طرح ہلنے لگا۔

میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا، شاید رات کی طرح میں اس پار چلی جاؤں، مگر اب کی بار کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بدحواسی اور پریشانی میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں کیا کروں۔ میں نے پریشان نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں، ساتھ ہی دھڑام کی آواز گونجی، میں نے گھبرا کر دیکھا، دروازہ صحن میں گر چکا تھا۔ لوگ شور مچاتے ہوئے سیلاب کی طرح گھر میں داخل ہو گئے انہوں نے آتے ہی مجھے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے نگاہیں گھما کر دیکھا، تمام لوگ میرے شناسا تھے۔

نصیر چاچا، صابر چاچا، اسعد کھپ، چاچا بگرا، ماسی کریماں، جنتاں، سب میرے دیکھے بھالے لوگ تھے مگر اس وقت ان کے چہروں پر اجنبیت سفاکی اور بربریت عیاں تھی ماسی جنتاں تقریباً غصے سے بولی۔

"تو پھر آ گئی اے سا بے (ابھی) کتنوں کو مارے گی اور کتنے کار (گھر) اجاڑ کرے گی؟" اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی کہ چاچی پینو درشت لہجے میں بولی۔

"تیرے گھر والے تھے (تو) نس (بھاگ) گئے۔ ساہنوں (ہمیں) مصیبتاں پاؤ واسطے آ گئی ہیں۔" (مصیبتوں میں ڈالنے کے لیے) کہتے ہوئے اس نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا۔ میں پیچھے کھڑی ماسی کریماں سے ٹکرا گئی، اس نے مجھے واپس آگے دھکا دیا۔

"دیکھ ملکئی، تیرے حق وچ یہی بہتر ہے کہ تو یہ راہ (گھر) ہمیشہ کے لیے چھوڑ جا۔" چاچا بگرا جو کبھی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعائیں دیا کرتا تھا، آج بڑی بےدردی سے مجھے حکم دے رہا تھا۔

"یہ ایسے نہیں جائے گی۔ اسے دھکے دے کر میرا گھر سے باہر نکال دو۔"

"ہاں ہاں اسے باہر نکالو۔"

"انہاں دی اینویں عزت ہے نہیں، ساڈی عزتاں نال بھی کھلواڑ کرے گی۔"

لوگوں کی باتیں میرے دل کو لہولہان کر رہی تھیں، میرا اس وقت چپ رہنا ہی عقلمندی تھا۔ اگر بولا جائے تو ان کے تیور بتا رہے تھے، وہ مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیں گے۔ مگر جب ماسی جنتاں بولی تو میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں، ہاں بھراں صابر تو سچ کہہ رہا ہے، ان کی بھلا کیا عزت ہے۔ دو سالاں تو اوپر ہو گئے نے ملکئی کو غائب ہوئے، پتا نہیں کتنے کتنے راتاں گزار کے آئی ہے۔" اس کے الفاظ میرے دماغ میں گولیوں کی طرح برسنے لگے۔ بوڑھی عورت کو اتنی بھی حیا نہ آئی کہ وہ پرائے مردوں میں کھڑی ہو کر کیا بک رہی ہے۔ میرا پارہ چڑھنے لگا اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی، میں چاہتی تو اس کی چھوٹی چھوٹی بےحیا آنکھیں اپنے بڑے ناخنوں سے باہر نکال دیتی، مگر اس کے ہمراہ دوسرے مردوں عورتوں نے مجھ پر دھاوا بول دینا تھا۔ میں نے انتہائی دکھ سے کہا۔

"نہ کر ماسی جنتاں، نہ کر۔ تیری وی اک دھی ہے۔ (تمہاری بھی ایک بیٹی ہے) سوچ ذرا۔"

میری بات بیچ میں اچک کر وہ بولی۔

"ہائے ہائے میری معصوم بچی کے بارے میں کچھ (کچھ) مت کہنا، اس معصوم نے کدی بوہے (کبھی دروازے) سے باہر نہیں جھانکا۔ تو تو دو سال غیروں میں گزار کے آئی ہے۔"

"کم بخت اب تو ہماری بیٹیوں پر الزام تراشیاں کرنے لگی ہے۔" مجمع کے بیچ میں سے کسی نے کہا۔ ماسی جنتاں نے دو ہتھڑی ضرب سینے پر لگاتے ہوئے کہا۔

"ہائے او میرے ربا..... میری معصوم بچی پر الزام....." کہتے ہوئے اس نے مجھے زور کا دھکا دیا، اس بار کا دھکا سابقہ دھکوں سے بھاری تھا۔ میرے پاؤں اکھڑ گئے، میں پیچھے لڑکھڑائی تو کر پر ایک اور ضرب لگی۔ "پرے مر منحوس۔" ان الفاظ کی سماعت کے بعد مجھے نہیں پتا کہ کہاں کہاں اور کس کس کی طرف سے دھکے دیے گئے۔ دھکوں کے دوران میں متفرق آوازیں بھی کانوں سے ٹکراتی رہیں۔

"اسے دھکے مار مار کر مہر داد گھر سے باہر نکالو۔ یہ منحوس ہے، اس نے مہر داد گھر والوں کو اندھیر نگری میں دھکیلا ہے۔" میں دھکے کھاتی رہی آگے بڑھتی رہی اور یہ ہاتھیں تک رہی، حتیٰ کہ مجھے گھر سے باہر گھسیٹ کر پھینک دیا گیا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ تشدد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

مجھے تھپڑ مارے گئے، دھکے دیے گئے اور عورتوں نے طعنے بھی برسائے۔ میری زبان کو چپ کا تالا لگ گیا تھا۔

"آہ! ملکنی تیرا ابا رحیم اللہ ترکھان کتنا غیرت مند شخص تھا۔ تیرا بھائی ابا سے بھی زیادہ غیرت مند ہے، جس نے چوہدری کو کلہاڑی کے وار کر کے عبرت ناک انجام تک پہنچایا، مگر تیرا اب یہ حشر۔ میرے اندر سے ایک پکار اٹھی کہ تن بدن میں آگ جل اٹھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا تانبا میرے حلق میں انڈیل دیا ہے۔ میں بے اختیار چیخ اٹھی۔ میری بلند چیخ انتہائی اذیت ناک تھی۔ لوگ چند لمحے ٹھٹھک کر رک گئے۔ کسی نے چلا کر کہا۔

"مارو مارو اس کے چیخنے چلانے پر مت جاؤ" اس آواز کے ساتھ لوگوں نے پھر دھاوا بول دیا۔

درد کی تیز لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی، ٹھوکریں اس قدر زیادہ تھیں کہ میں زمین پر گر گئی۔ میں لوگوں کے ہجوم میں گری پڑی تھی، شاید مجھے پاؤں سے روند دیا جاتا، ایک آواز نے سب کو ساکت کر دیا۔ "چوہدری مشتاق آ گیا، چوہدری مشتاق آ گیا۔" اس آواز نے مجمع میں کھلبلی مچا دی۔ میرے اردگرد جمی ہوئی ٹانگیں پیچھے ہٹنے لگیں، میں نے بمشکل سر اٹھا کر دیکھا، لوگوں کی توجہ چوہدری مشتاق کی گاڑی کی طرف مبذول تھیں، میں نے ہمت مجتمع کی اور اٹھ کھڑی ہو گئی، بہت سے لوگ چوہدری مشتاق کی گاڑی دیکھ کر کھسک گئے، لوگوں نے گاڑی کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ گاڑی میرے قریب آ کر رک گئی۔

ٹھک ٹھک کی آوازوں سے دروازے کھلے۔ چوہدری مشتاق اپنے کارندوں کے ساتھ باہر آیا۔

چوہدری مشتاق فلمی ولن کی طرح میرے اردگرد گھومتے ہوئے بولا۔

"لے بلے اج تے مہر داد گھر کے بھاگ جاگ اٹھے ہیں، رحیم اللہ ترکھان کی دھی ملکنی آئی ہے۔" چوہدری مشتاق نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر خباثت پوری آب و تاب کے ساتھ جمع تھی، میرے گالوں پر خون کی دھاریں لکیریں بنا رہی تھیں۔ چوہدری مشتاق نے میرے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا مگر میں نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا، وہ ہنس کر بولا۔

"اتھری گھوڑی اور ضدی سوار، اج تو مزہ آئے گا۔ جمیل..... او ئے جمیلے۔"

"حکم چوہدری صاحب!"

"بھاگ کر جا فارم ہاؤس سے میرا گھوڑا لے آ، جلدی جا۔"

"بہتر چوہدری صاحب۔"

"اور سن۔"

"جی چوہدری صاحب۔"

"ساتھ میں رسی بھی لانا۔ آج ہم ملکنی کو مہر داد نگری کی سیر کروائیں گے۔"

چوہدری کے تیور اور ارادے بھانپ کر میں اندر سے کانپ اٹھی، مجھے اپنی موت واضح نظر آنے لگی، میں موت سے بھی

خوف زدہ نہیں ہوئی مگر اتنی ہولناک اور شرمناک موت۔ او میرے اللہ۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا، میں نے تماش بینوں پر نگاہ ڈالی تو میرے اندر اک ہوک اٹھی، مکھنی وہ چلے گئے جو مظلوموں کی آہ پر ظالموں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے، یہاں تیرا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہاں مظلوموں کی دادرسی نہیں کی جاتی، انہیں ظلم و ستم کی آگ میں دھکیلا جاتا ہے۔

نہیں نہیں۔ میں نے جواباً دلیل دی، ذکیہ باجی کے کوٹھوں پر جہاں جسموں کو تولا جاتا ہے، وہاں بھی ایک مرد آہن پیدا کر دیا تھا۔ شاید یہاں بھی کوئی ماں کا لال دلاور کی طرح جاگ اٹھے۔ چوہدری کے بندے مجھے رسیوں سے باندھ رہے تھے تب میں نے چلا کر کہا۔

"واہ میر واہ گمر کے مردو واہ۔ جب بے بس لڑکی تمہارے نرغے میں تھی تو مجھ پر تابڑ توڑ حملے کیے، اب تم لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ مجھے رحیم اللہ کی بیٹی ہونے پر فخر ہے۔ میں لڑکی ہوں مگر ظالم کے سامنے خاموش نہیں رہی، ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے، تم اسی طرح اپنی ماں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت ایسے بے غیرت چوہدریوں کے ہاتھوں لٹواتے رہنا مگر خاموش رہنا۔ کبھی جرأت و بہادری کا مظاہرہ نہ کرنا، رحیم اللہ ذلت کا ترجمان ہے۔ مگر اس کی اولادوں نے کبھی ظلم کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ میں نے تھوڑا توقف کے بعد چیخ کر کہا۔ تھو ہے تم مردوں پہ۔ تھو۔"

"اوئے زیادہ بک بک نہ کر۔ جتنا بولے گی اتنی زیادہ مار کھائے گی، چل اوئے جھلے گھوڑا دوڑا۔" چوہدری نے حکم جاری فرمایا۔ میری باتوں کا لوگوں کے مجمع پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہوا، جھلا گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے آخری حربہ بھی آزمایا۔

"جھلے آج تیرے گھوڑے کے پیچھے مکھنی بندھی ہوئی ہے، یاد رکھنا کل یہاں تیری بہن شائستہ بندھی ہوگی۔ جو عزتوں سے کھیلتے ہیں، ان کی عزتوں سے کھیلا جاتا ہے۔" میری بات کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ وہ حقارت سے بولا۔ "مکھنی تیرا یہی انجام ہونا تھا، کیوں کہ تو اپنی (اپنی) اوقات سے بڑھ کر چلتی ہے۔ آج تیری ساری بوٹی بوٹی ناک کے راستے نکل آئے گی۔" وہ اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لوگوں کے لیے ایک دلچسپ کھیل کا آغاز ہونے والا تھا۔ چوہدری مشتاق یہ نظارہ دیکھنے کے لیے گاڑی میں جا بیٹھا۔

جھلے نے گھوڑے کو ایڑی لگائی، مجھے ایک جھٹکا لگا، جب تک گھوڑے کی رفتار دھیمی تھی میں ساتھ ساتھ بھاگتی رہی، جیسے ہی اس کی رفتار بڑھی میں اڑتی ہوئی منہ کے بل زمین پر گر گئی، لوگوں کی ملی جلی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا وہ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں، مظلوم کو وقت پہنچا کر اور اسے ذلیل و خوار کر کے وہ کس قدر خوش ہوئے جا رہے تھے۔ پہلے مرحلے میں مجھے بے تحاشا چوٹیں آئیں۔ مجھے احساس ہونے لگا، جسم کے کئی حصوں سے خون کا رساؤ جاری ہو چکا ہے، اس احساس کے بعد اصولاً مجھے چیخنا چلانا چاہیے تھا، مگر میرے لب خاموش تھے، البتہ میرے ذہن میں زور زور کے دھماکے ہونے لگے۔ ان دھماکوں سے جسم لرزہ براندام ہوا اور ذہن کے اندر کچھ حرکات و سکنات کا احساس جاگنے لگا۔ ذہن میں یہ اتھل پتھل کیسی ہے، یہ حرکات و سکنات کیا ہیں؟ میری ساری توجہ ذہن کے اندر یوں بند ہو گئی جس طرح پانی کو بوتل میں ڈال کر ڈھکن بند کر دیا جاتا ہے، میرے ذہن میں حضرت بلالؓ بن رباح کی خوب صورت حسین و جمیل شبیہ ابھرنے لگی۔ انہیں والدہ کی نسبت سے بلال ابن حمامہ بھی کہا جاتا ہے، مگر عام مسلمان میں وہ بلال حبشیؓ کے نام سے مشہور ہیں، حبشی ہونے کے سبب ان کا رنگ سیاہ نظر آ رہا تھا، قد لمبا اور قدرے جھکا ہوا۔ گھنے بال جو بیشتر سفید تھے، چمکتا چہرہ جو عجیب و غریب چمک سے دمک رہا تھا، میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی، یہ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ انہیں پتا چلا، بلال مسلمان ہو چکا ہے۔ وہ مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، اپنے غلام کے ایمان لانے کو کیسے برداشت کر لیتا۔ امیہ کو سخت گزند پہنچا۔ حضرت بلالؓ کے ایمان لانے کی پاداش میں انہیں طرح طرح کا ایذا پہنچایا جانے لگا۔ میرے دماغ میں عرب کے ریگستان گھومنے لگے۔ ریگستان آج بھی آگ اگلتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے اُن کی حرارت کا کیا عالم ہوگا۔ حضرت بلال حبشیؓ کو گرم تپتی ہوئی ریت پر سیدھا لٹایا گیا۔ مزید ایذا دینے کے لیے سینے پر پتھر کی بڑی چٹان دھری گئی، ان تکالیف کے بعد حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ اسلام چھوڑ دو۔ مگر بلالؓ کے منہ سے احد احد کے الفاظ سن کر ان پر تشدد کی انتہا میں مزید کس دی گئی۔ رات میں

زنجیروں سے جکڑ کر جسم پر کوڑے برسائے جانے لگے۔ عذاب دینے والوں میں کبھی ابوجہل کوڑا اُٹھا لیتا، کبھی اُمیہ بن خلف وہ تھکتا تو ملازموں کے سپرد کر دیے جاتے۔ دوسری صبح گرم زمین پر لٹا کر کوڑوں سے لگنے والے زخموں کو وسعت دی جاتی تاکہ وہ اسلام سے ہٹ جائیں۔ مگر حضرت بلال حبشیؓ کہتے معبود صرف ایک ہی ہے۔ ان الفاظ سے اُمیہ بن خلف تیخ پا ہو جاتا۔ سخت تشدد کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا تھا۔ حضرت بلالؓ کو مکہ کے لڑکوں کے حوالے بھی کیا تاکہ وہ انہیں طرح طرح سے ستائے۔ سیدنا حضرت حبشیؓ پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے مگر وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں آزاد کروایا۔ وہاں سے آزاد ہوئے تو سرکارِ دو عالم، فخرِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کے مبارک قدموں میں آ بیٹھے۔ حضور ﷺ نے انہیں ہجرت کے پہلے سال مؤذن مقرر فرمایا۔ جب فتح مکہ ہوا تو خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا شرف بھی حضرت بلالؓ کو حاصل ہوا۔

حضرت بلال حضرت محمد ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل تھے۔ حضرت بلالؓ نے اپنے سابقہ آقا اور اسلام دشمن اُمیہ بن خلف کو بیٹے سمیت غزوہ بدر میں قتل کر دیا تھا۔ حضرت بلال حبشیؓ کو آقائے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کے ذاتی خادم، عصا بردار اور خازن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ کی وفات 64ء یا 20ھ میں ہوئی۔ آپ دمشق میں مدفون ہیں۔ حضرت بلالؓ دنیا کے واحد انسان ہیں جن کا حشر تو دمشق سے ہے لیکن محشر مدینہ شریف ہوگا۔

میرے جسم نے ایک زور کا جھٹکا کھایا۔ ذہن میں جب تک حضرت بلالؓ کے واقعات رواں رہے مجھے کسی بھی چوٹ کا احساس نہیں ہوا۔ میرے دل و دماغ سے یہ خیال تک محو ہو گیا کہ مجھے گھوڑے کے ساتھ باندھ کر گھسیٹا جا رہا ہے۔

سارے احساسات مٹ گئے تھے۔ اس لیے میں نے چیخ نہ چلائی۔ جب اپنی پوزیشن کا احساس جاگا تب درد حملہ آور ہوئے۔ میری پوزیشن کا عالم یہ تھا کہ مجھے الٹا لٹا کر ہاتھ پاؤں سے باندھا گیا تھا۔ کہنیاں سینے کے ساتھ پیوستہ تھیں، ہاتھ ٹھوڑی کو چھو رہے تھے اور رسی جسے شہسوار کھینچ رہا تھا میرے ہاتھوں کے درمیان سے گزری گئی تھی۔ متعدد مقامات سے میرے کپڑے پھٹ چکے تھے، زخموں سے جسم کا رواں رواں دکھ رہا تھا، پورا جسم زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ اس وقت میری سوچ اور احساس عجیب حالت کا شکار تھے، میں نہ جینے کی آرزومند تھی نہ موت کی طلبگار۔ شاید میں موت اور زندگی کے درمیانی ان دیکھے خلا میں معلق تھی۔ دفعتاً مجھے ایک اور زور کا جھٹکا لگا۔ میں زمین سے کئی میٹر اوپر اٹھ گئی، جھٹکا لگنے اور زمین سے اوپر اٹھنے کا عمل اتنا وحشت ناک اور اذیت بھرا تھا کہ بے اختیار میرے منہ سے کربناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔

میں چند سیکنڈ فضا میں بلند رہنے کے بعد دھڑام سے زمین پر گری اور گیند کی طرح لڑھکتی چلی گئی، شاید رسی ٹوٹ گئی تھی، میرے جسم نے سیکڑوں قلابازیاں کھائیں۔ مجھے بالکل بھی پتا نہیں چلا کہ میں کہاں گری ہوں اور کس طرف لڑھکتی جا رہی ہوں، ہاں البتہ میری کربناک چیخیں مجھے احساس دلا رہی تھیں، درد زخموں میں بے تحاشا اضافہ ہو چکا ہے، اور درد قطعی برداشت حد تک بڑھ گیا تھا۔ میں اچھلتی کودتی، یہاں وہاں ٹکراتی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے جب رکی تو آنکھوں کے سامنے مکمل اندھیرا تھا۔ لحظہ بھر جسم میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی پھر کچھ پتا نہ چلا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔

☆.....☆

میری آنکھیں کھلی تو جسم کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ سر بھاری اور چہرہ سوجا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خون آلود آنکھوں سے جسم کا جائزہ لیا تو دل ڈوبنے لگا۔ پورا جسم خون میں لت پت تھا۔ کچھ زخموں سے خون کا ہلکا رساؤ ہنوز جاری تھا۔ رسیاں ٹوٹ چکی تھیں، مجھے احساس ہونے لگا چہرے پر بہت سا خون جم گیا ہے۔ خون صاف کرنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی تو ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ بایاں بازو کام نہیں کر رہا تھا۔ دائیں بازو کی آستین سے چہرہ صاف کیا اور جسم کو حرکت دی۔ دوسرا انکشاف ہوا کہ ٹانگیں تو سلامت ہیں مگر بایاں پاؤں حرکت نہیں کر رہا۔ میں کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

مہروادنگر میں کوئی جنگل نہیں تھا۔ البتہ اس سے کوسوں دور ایک جنگل تھا۔ دوسرے علاقوں کی طرح مہروادنگر کے لوگ بھی وہاں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ ماحول کا جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا میں اسی جنگل میں پڑی ہوئی ہوں۔ یہ

جنگلی علاقے کی زمینی سطح سے کافی نیچے تھا۔ گویا میں ڈھلوان میں قلابازیاں کھاتی ہوئی گری تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ جسم کے چند حصے عریاں ہو گئے تھے خوش قسمتی سے ریشم سے سلی گئی بڑی چادر میرے ساتھ لپٹی رہ گئی تھی گو کہ چادر بھی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی مگر بڑی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک سلامت تھی۔ اس کے محفوظ حصوں سے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اب مجھے جنگل سے نکلنا تھا۔ یقیناً میری تلاش جاری ہوگی، چوہدری کے پالتو کتے جنگل کا چپہ چپہ چھان رہے ہوں گے مجھ تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے قریب پڑی ہوئی درخت کی موٹی شاخ اٹھائی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میرا بازو اور ایک پاؤں کام نہیں کر رہے تھے، ایک ٹانگ اور ڈنڈے کے سہارے چلنا محال تھا۔ میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گر چکی تھی، بار بار گرنے سے زخموں کا درد سوا ہو رہا تھا، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے پتا ہے یہاں ہمت ہارنے کا مطلب ہے رات میں مجھے جنگلی جانور نوچ لیں گے۔ میں تمام تر ہمت بروئے کار لا کر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ مجھے شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ ایک تو بازو اور پاؤں کام نہیں کر رہے تھے دوسرا مجھے اوپر کی جانب چڑھنا تھا۔ میں جیسے تیسے اوپر پہنچ گئی۔ یہاں جنگل کا اختتام ہو رہا تھا۔ سامنے چٹیل میدان تھا، یہ میدان میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ مجھے توقع تھی کہ کسی شناسا علاقے میں نکلوں گی لیکن نتیجہ خلاف توقع ملا۔

میں نے چند لمحات سوچا ایک تانگہ گھوڑا کتنے تیز بھاگ سکتا ہے۔ چوہدری کا گھوڑا کتنا تیز اور کب تک بھاگا ہوگا۔ اس کا دورانیہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ زیادہ ہوتا تو میرے جسم کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ صرف دس پندرہ منٹ کی کمل مسافت میں ہم اجنبی علاقے میں کیسے پہنچ آئے؟ یہ سوال میرے ذہن میں کھٹکنے لگا۔

شاید میں اس پر مزید غور کرتی، لیکن میری توجہ چند لوگوں کی طرف مرکوز ہوگئی۔ مجھ سے چالیس پچاس گز دور وہ کام میں مشغول تھے۔ دھیان دینے پر اندازہ ہوا وہ لوگ کنواں کھود رہے ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ دس رہی ہوگی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چٹیل میدان حد نگاہ بے آب و گیاہ تھا، خشک زمین بنجر لگ رہی تھی۔ میدان میں اگر درخت، پودے اور گھاس کبھی اگے بھی تھے تو اب دھوپ کی تیز تمازت نے انہیں بری طرح جھلسا دیا تھا۔ درختوں سے تمام پتے جھڑ چکے تھے۔ گھاس اور پودے جل گئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا یہاں بدترین قحط سالی چل رہی ہے۔ دفعتاً میرے ذہن میں زور زور سے دھماکے ہونے لگے۔ میں بے اختیار سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ او میرے اللہ، میرے منہ سے اختیار نکلا۔ میرا سر بھاری ہونے کے ساتھ چکرانے لگا۔ میں نے ایک بازو کی زمین پر ٹیک لگا کر خود کو سنبھالا۔ آنکھوں میں چند مناظر گھومنے لگے۔

ایک ایسا ہی بنجر شدہ جنگل جس میں، میں ایک ادھیڑ عمر بدحال شخص کے ساتھ چل رہی تھی، اس کے پاؤں میں ہوائی سلیپر تھے۔ وہ انتہائی سست روی سے چل رہا تھا۔ ہم جنگل سے باہر میدان میں نکلے۔ یہاں آٹھ دس آدمی کنواں کھودنے میں مگن تھے۔ مناظر تیزی سے بدلنے لگے۔ کنواں سے پانی نکلا۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور بستی کی طرف برتن لینے کے لیے بھاگے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ڈول پھینک کر کنویں سے پانی نکالا۔ میرے پارٹنر نے مجھے دھکا دیا۔

یہ پانی تیرے لیے نہیں ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس اکیلے شخص نے کنواں بھر دیا۔

زہر آلود پانی... میرے دماغ میں الفاظ ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے۔

مجھے اندازہ ہوا میں جس جنگل سے ابھی ابھی نکل کے آئی ہوں یہ وہی جنگل ہے اور اب اسی میدان میں کھڑی ہوں، ویسے ہی آٹھ دس لوگوں نے کنواں کھودا اور پانی نکلنے کی خوشی میں نعرے لگا رہے ہیں۔

میرے اندر اضطراب ضربیں لگانے لگا۔ یہ پراسرار معمہ کیا ہے؟ کل اور آج کے سارے مناظر یکساں تھے، میں نہ کل کچھ سمجھ پائی تھی اور نہ آج سمجھ پا رہی ہوں۔ میں تب بھی کم فہم، ناقص العقل اور بے بس لڑکی تھی اب بھی میری وہی حالت تھی۔ اس پراسرار سلسلے کی کڑیاں باہم کیسے پیوست ہوئیں یہ سوچنا بعد کی بات ہے۔ فی الحال میرے لیے پریشان کن خیال یہ تھا کہ کنواں سے نکلنے والا پانی زہر آلود ہے۔

ادھر سے لوگ خوشی سے چلاتے لگے۔

''پانی نکل آیا، پانی نکل آیا۔'' وہ خوشی سے رقص کرنے لگے مگر وہ لاعلم تھے کہ اپنی موت پر رقص کر رہے تھے۔ میں



مبارک باد

ہمارے دوست لکھاری ممتاز احمد (سرگودھا) گزشتہ ماہ عمرے کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ادارہ ممتاز احمد کو اس سعادت پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

تفکرات میں گری ہوئی تھی۔ ادھر سے مزید آوازیں آنے لگیں۔

"چلو چلو اپنے برتن لاؤ۔ بستی والوں کو بھی اطلاع پہنچاؤ۔ سب پانی لے کر جائیں۔"

"ہاں ہاں چلو۔"

"اوہ میرے اللہ۔ یہ لوگ چل پڑے ہیں۔" میں بوکھلاہٹ میں کھڑی ہوگئی، میں نے سیکڑوں آدمیوں کو موت سے بچانا تھا، میں چیختی ہوئی ان کی طرف بھاگ پڑی۔

"اے لوگو۔ سنو سنو۔ میری بات سنو۔ کہاں چل دیے۔ رکو ذرا" میں کہتی ہوئی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ اپنی خوشی میں مگن لوگ میری آواز نہ سن سکے مگر میں نے بہت جلد انہیں جا لیا۔ میں نے اپنی اکھڑی سانسیں بحال کرتے ہوئے غصے میں کہا۔

"کب سے پکار رہی ہوں؟ سب کے سب بہرے ہو؟ سنتے نہیں میری بات؟"

مجھے انتہائی حیرانی سے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی اجنبی یا فوق الفطرت مخلوق ہوں۔

میں نے بلاتمہید ان سے کہا۔

"یہ کنواں جو آپ لوگوں نے کھودا ہے اس کا پانی زہر آلود ہے۔ خدا کے لیے یہ پانی مت پیو ورنہ تم سب اپنی بیوی بچوں سمیت موت کے منہ میں جا اترو گے۔" میری بات سن کر وہ سکتے میں چلے گئے۔ ایسے لگا جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔

چند لمحوں بعد ان میں سے ایک بولا۔

"اے لڑکی کیا بکواس کر رہی ہے۔" اس کی آواز سن کر دوسرے بھی ہوش میں آ گئے۔

"چل بھاگ ادھر سے۔"

"ہم نے دن رات کی محنت سے کنواں کھودا ہے۔ اب پانی نکلا ہے تو تُو اپنا منحوس بیچنے آ گئی ہے۔"

"اسے چھوڑو جی، چلو بستی والوں کو پانی نکلنے کی خوش خبری سنائیں۔"

ان لوگوں کی باتیں سن کر ان کے ارادے بھانپ کر میں کانپ اٹھی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

"آپ لوگوں نے ان تھک محنت یقیناً زندگی کو حرارت پہنچانے کے لیے کی ہے نہ کہ موت کے لیے،" کہتے ہوئے میں نے ان کے تھکے ماندے چہروں پر نگاہ ڈالی، تیز دھوپ کے سبب ان کے رنگ جھلس گئے تھے۔ ہونٹوں پر پیاس کی شدت نے پپڑیاں جما رکھی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اصل حقیقت بتانا ضروری تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اس پانی کا کیا فائدہ جسے پیتے ہی بندہ موت کی آغوش میں سو جائے۔"

"ہم کیسے یقین کر لیں کہ پانی زہر آلود ہے؟" میں نے دیکھا ان کے لہجے کا جوش ماند پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض میں جتنی بھی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، سب کی سب قیمتی ہیں۔ لیکن انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان سے کوئی مخلوق افضل نہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، جلدی بولو۔ ہمارے بیوی بچوں کا پیاس سے برا حال ہے۔"

"میں کہنا چاہتی ہوں آپ ایک دو جانور یا پرندے لے آئیں، پہلے پانی انہیں پلایا جائے تاکہ شک رفع ہو۔" میرے لہجے کے اعتماد نے انہیں پسپا کر دیا۔ وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ کچھ کا خیال میرے حق میں تھا اور کچھ کا نفی

میں، لیکن قرعہ بہرحال میری تائید میں نکلا۔ ایک بکری اور گدھا لایا گیا۔ انسانوں کی طرح جانوروں کی حالت زار بھی واضح کر رہی تھی کہ وہ بہت پیاسے ہیں۔ ڈول پھینک پانی نکالا گیا۔ پانی دیکھ کر لوگوں کی بے چینی سوا ہو گئی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ تاہم وہ صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے، پانی جانوروں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ پیاسے جانور غٹاغٹ پانی پی گئے، لوگ عجیب کیفیت میں مبتلا تھے، ان کی بے چین نظریں جانوروں پر جمی ہوئی تھیں۔ پانی پینے کے پانچ منٹ بعد بکری کے منہ سے غرغر کی آوازیں نکلیں، ساتھ ہی سفید جھاگ کا اخراج ہوا، لوگ بے اختیار اس کے قریب چلے گئے۔ بکری لہرا کر زمین پر گری اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی بازی ہار گئی۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی، ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے تھے، کیفیت ایسی تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ شاید وہ چشم تصور میں دیکھ رہے تھے۔ اگر میری بات نہ مانی جاتی تو بکری کی جگہ ان کی لاشیں پڑی ہوئی ہوتیں۔ وہ اپنی حواس باختہ کیفیت سے باہر نکل نہیں پائے تھے کہ گدھے کا حشر بھی بکری جیسا ہوا۔ لوگ میرے پاؤں میں گر گئے۔

''ہمیں معاف کر دو، ہم لاعلم تھے۔ تم علم والی ہو، یقیناً ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم اپنے لیے قبر کھود رہے ہیں۔'' معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے یہاں پر بدترین قحط سالی چل رہی ہے۔ انسان، جانور بھی بھوک و پیاس سے بلبلا رہے ہیں، بھوک برداشت ہو جاتی ہے، مگر پانی کے بنا زندہ رہنا محال ہے۔ اس کنواں کو بند کر دو اور یہاں، میں نے آگے چل کر ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کنواں کھود دو۔ یہ مٹی نرم ہے اور اس کا پانی بھی ٹھنڈا میٹھا ہوگا۔ جو محنت اور مشقت تم لوگوں نے اس کنواں پر صرف کی ہے۔ اسی لگن سے یہاں کام کرو گے تو صرف ایک دن میں پانی نکل آئے گا۔''

''کون سی مہربانی۔''

''آپ ہماری بستی میں قیام کریں۔ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ ہم.....''

''نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے اور بہت سے کام نمٹانے ہیں، میرے کام بہت اور وقت بے حد کم ہے۔ اس لیے مجھے جانا ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے تو عقب سے آواز آئی۔

ذکیہ کے ساتھ بتا دیں آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں اور کہاں جانا ہے۔

ان کے سوالوں پر میں چند لمحے سوچ میں گر گئی کہ انہیں کیا جواب دوں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔

''میں رحیم اللہ ترکمان کی بیٹی ملکشی ہوں۔''

یہاں سے چند کلومیٹر دور پیچھے یا آگے ایک گاؤں ہے مہر داد نگر، میں وہاں سے آئی ہوں، جانا کہاں ہے فی الحال مجھے بھی نہیں پتا۔ میرے جواب پر میں نے دیکھا لوگوں نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ایک نوجوان بولا۔

''یہاں سے چند کلومیٹر دور کوئی بھی مہر داد نگر نام کا گاؤں نہیں ہے، بلکہ ہم یہ نام ہی پہلی بار سن رہے ہیں۔'' نوجوان کی بات جاری رکھتے ہوئے میرے ابا کا ہم عمر ایک دوسرا شخص بولا۔

'چند کلومیٹر کیا سیکڑوں میل دور بھی ایسا کوئی گاؤں نہیں۔'

ان کی باتوں نے مجھے حیرت کی وادی میں دھکیل دیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا واقعی آپ مہر داد نگر سے واقف نہیں ہیں۔''

''نہیں بی بی ہم میں سے کوئی بھی مہر داد نگر سے واقف نہیں۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے دو قدم آگے بڑھ کر بڑے وثوق سے کہا۔ محنت مشقت سے اس کا جسم کافی توانا نظر آ رہا تھا۔ میں نے براہ راست اس سے پوچھا۔

''آپ کے اس گاؤں کا کیا نام ہے۔''

''ہمارا گاؤں سانگھڑ سے کوسوں دور ہے، تم نے تھر کا نام سنا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں حیرت سے اچھل پڑی۔ تھر، سانگھڑ، الفاظ دہراتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں کپکپاہٹ محسوس ہونے لگی تھی مانند تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ یہ کیسے ممکن ہے، مہر داد نگر ضلع راولپنڈی کا مضافاتی گاؤں ہے، میں یک دم پنجاب سے سندھ کیسے منتقل ہو گئی۔ یقیناً وہ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے اب انہیں غور سے دیکھا، ان کا پہناوا، حلیے اور زبان

سے وہ واقعی سندھی لگ رہے تھے، میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اچانک ایک دوسرے خیال نے میرے اندر پریشانیوں کو دراز کر دیا۔ کہیں میں پھر سے اُن کے علاقے میں تو نہیں آ گئی ہوں۔ اس خیال سے میں نے ان سے پوچھا۔

"گوٹھ چندمن یہاں سے کتنی دور ہے؟" سوال کرتے ہوئے میری اندرونی کیفیت بری طرح منتشر تھی، گوٹھ چندمن کا نام سن کر ان میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی، لگ رہا تھا وہ اس نام سے واقف نہیں۔ تاہم ایک شخص چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"گوٹھ چندمن کون سے ضلع میں واقع ہے۔" اپنے حلیے سے یہ شخص پڑھا لکھا دکھائی دے رہا تھا، میں نے چند لمحے سوچ کر اسے بتایا۔

"ضلع گھوٹکی میں۔"

"گھوٹکی، سکھر، خیرپور، نواب شاہ، نوشہرو فیروز یہ پانچ اضلاع سکھر ڈویژن میں آتے ہیں۔ میرپور خاص، تھر، سانگھڑ اور عمرکوٹ یہ میرپور خاص ڈویژن میں واقع ہیں۔ ہمارا گاؤں سانگھڑ کے انتہائی کونے پر تھر کے قریب واقع ہے۔ گوٹھ چندمن ہم کبھی نہیں گئے۔"

اس کی بات سن کر مجھے یاد آیا۔ پاکستان کے دو مشہور صحرا ہیں، ایک وادی سندھ کے جنوب میں واقع تھر دوسرا بہاولپور اور بہاولنگر میں واقع چولستان۔

میرے لیے یہ انتہائی پراسرار اور ناقابل فہم معاملہ تھا کہ میں پنجاب سے سندھ کے علاقے تھر میں کیسے آ گئی ہوں۔ میں ابھی الجھن کا نمونہ بنی ہوئی تھی کہ معاً کسی نے مجھے اندر سے پکار کر کہا۔

"ملکمنی! تو بھول گئی ہے، جس طرح اس کنواں کا پانی زہر آلود ہے۔ اسی طرح وہ پانی بھی زہر آلود ہے جس سے ایک شخص کشکول بھر رہا ہے۔ یہ تو نہیں جانتے کیا اُسے مرنے دے گی؟"

"نہیں...... نہیں......" اندر کی آواز سن کر میں نے تڑپ کر تیز لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی میری نگاہوں میں چند مناظر گردش کرنے لگے۔

میں ایک شخص کے ساتھ بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی ہوں، ہم سے ایک کلومیٹر دور ایک شخص چٹان کی جڑ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے کشکول ہے جس میں چٹان سے آنے والے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، آدمی سے چند میٹر پیچھے ایک عورت پتھر سے ٹیک لگائے بے جان نیم دراز ہے۔

"او میرے اللہ، یہ پانی تو زہر آلود ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے خودکلامی کی۔

"کون سا پانی۔" میری خودکلامی لوگوں نے سن لی تھی۔ ان کے چہروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں، اس بار صاف و شفاف پانی ملے گا۔ مجھے اب جانا ہے۔ مجھے اندازہ تھا وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں، اس لیے چند قدم چلنے کے بعد میں نے پلٹ کر انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے روکنے یا میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرنا۔ جس نے ایسا کیا اپنا نقصان کا ذمہ دار خود ہو گا۔" کہہ کر میں آگے بڑھ گئی میں سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر چل رہی تھی، یہ صحرائی علاقہ ہے۔ جب کہ کشکول میں پانی بھرنے والا شخص پہاڑی علاقہ میں موجود تھا۔ جہاں ہر طرف عمودی چٹانیں نظر آ رہی تھیں، میں سوچوں کے بھنور میں اس قدر الجھ کر چل رہی تھی کہ احساس ہی نہیں ہوا، میں صحرا سے نکل کر پہاڑوں میں داخل ہو گئی ہوں۔ یہ احساس تب جاگا جب ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر میں گرتے گرتے بچی۔ سنبھل کر دیکھا تو ہر طرف عمودی چٹانوں کو کھڑا پایا۔ میرا دماغ پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔

"یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے منتقل ہو رہی ہوں۔ میں سر پکڑ کر ایک نرمے پتھر پر بیٹھ گئی، بیٹھتے ہی مجھے احساس ہوا یہاں میں پہلے بھی بیٹھ چکی ہوں، میں نے فوراً آنکھیں کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ یہ وہی پتھر تھا۔ اس پر میرے ساتھ ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اس نے یہاں اپنی ہوائی چپل جھاڑی تھی، یہاں سے کچھ دور ایک دوسرا شخص کشکول بھرنے کے لیے چٹان کی جڑ میں بیٹھا ہوا تھا، خیال آتے ہی میں نے اس طرف نگاہیں دوڑا دیں۔ نگاہوں کا سفر ختم ہوا تو میں بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اب بھی وہ شخص اُسی پوزیشن میں کشکول زمین پر دھرے ہوئے بیٹھا

تھا۔ اس کے پیچھے ایک عورت بے حال نیم دراز تھی۔

زہر آلود پانی۔ الفاظ پھر سے میرے دماغ میں برسنے لگے۔ میں نے دیکھا وہ شخص کشکول بھر کر نیم دراز عورت کی طرف پلٹ رہا ہے۔ لاو میرے لیے اس پانی میں زہر ہے۔ میں چیختی ہوئی اس طرف بھاگ پڑی۔

اے رکو۔ اس کو پانی مت پلانا۔ یہ پانی زہر آلود ہے۔ میں کہتی ہوئی برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ اس ویرانے میں مکمل سناٹا اور سکوت تھا۔ میری چیخ پکار سن کر اس کے قدم تھم گئے۔ میں ہانپتی کانپتی ان کے قریب پہنچ گئی۔ حیرت کی ساری چمک اس شخص کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"یہ پانی اسے مت پلانا اس میں زہر ہے۔"

"کک۔ کیا۔" وہ حیرت سے اُچھل پڑا۔ "یہ پانی، آپ کون....." وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ پانی زہر آلود ہے۔ اسے پھینک دو۔"

"م۔ مگر۔" وہ کبھی ہاتھوں میں تھامے ہوئے کشکول کو دیکھ رہا تھا اور کبھی نیم دراز عورت کو۔ جس کی پیاس کے سبب حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بتاتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے موڑ۔ موڑ مڑتے ہی ایک ٹھنڈی میٹھی آبشار پہاڑی سے گر رہی ہے۔ آپ وہاں سے پانی لے لیں۔ ہم پچھلے چھ گھنٹوں سے ان چٹانوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے راستہ بھٹک گئے ہیں اور پانی ختم ہو رہا ہے۔ یہ میری ماں ہے۔ اس کی حالت تم دیکھ رہی ہو۔ یہ پانی بڑی مشکلوں سے ملا ہے اور تم کہہ رہی ہو زہر آلود ہے۔" وہ تذبذب میں گھرا ہوا تھا۔ کشکول ابھی تک اس نے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"تم اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ پانی اسے مت پلاؤ، یہ زہر آلود پانی ہے۔" بخدا اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہہ سکی۔ میرے لہجے کے اعتماد نے اسے ڈانوا ڈول کر دیا۔ اس نے تاسف سے مجھے دیکھا، پھر اس جانب جہاں آگے موڑ پڑتی تھی۔

"اس پار جا کر دیکھ لو آبشار ملے گی۔" اس بار وہ خاموش رہا۔ کشکول وہیں رکھ کر موڑ کی جانب چل پڑا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کشکول سے پانی باہر انڈیل دیا اور پانچ منٹ میں پلٹ آیا۔ اس کے چہرے کا جوش و خروش ظاہر کر رہا تھا میری بات سچ ثابت ہوئی ہے۔ وہ آتے ہی خوشی سے بولا۔

"آپ۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں، اس طرف آبشار موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے وہاں لے جاؤ۔" میں نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خود بھی پانی پیو اور اسے بھی سیر ہو کر پلاؤ۔"

"اور آپ۔ آپ وہاں۔"

"مجھے جانا ہے ابھی مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر عورت کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نے اسے روک دیا۔

"پانی۔ پانی۔ لاؤ۔"

"جلدی کرو، دیر مت کرو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ کشکول اٹھا کر آبشار کی طرف بھاگ پڑا۔ میں انہی قدموں سے واپس چلی آئی۔

اب میں جان گئی تھی، تینوں پانی زہر آلود ہیں، دو کا قصہ میں صاف کر چکی تھی، اب تیسرا پانی تھا۔ یہ تیسرا پانی مجھے کہاں ملے گا، میں نہیں جانتی، میں ایک بار پھر ان دیکھی منزل کی جانب چل پڑی۔ مجھے یاد آ رہا تھا پہاڑی علاقے سے ہم چلے تھے تو قبرستان کے نزدیک آبادی میں جا نکلے تھے۔ وہ پانی کی بڑی ٹینکی تھی جسے میرے اسلم نے خالی کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے میری منزل پانی کی وہی بڑی ٹینکی تھی، مگر وہ تھی کہاں یہ میرے علم میں نہیں تھا۔ میرا کام تھا سفر کرنا۔ منزل تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کا کام تھا۔ میرے دل میں یہ بات جڑ پکڑ چکی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ کام لینے ہیں، اس کا بین ثبوت پچھلے

وہ واقعات تھے، جو میرے ساتھ گزر چکے تھے، ورنہ میں تو مہر داد نگر میں چوہدری مشتاق کے گھوڑے کے پیچھے گھسٹی جا رہی تھی، وہ منظر یاد آیا تو میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رک گئی، مجھے یاد آیا تھا جب جنگل سے چلی تھی تو بری طرح زخمی تھی، کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور جسم لہولہان تھا، میرا ایک اور پاؤں کام نہیں کر رہے تھے، میں نے حیرانی سے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ کپڑے بے شک پھٹے ہوئے تھے، مگر بڑی چادر اوڑھنے کے سبب نظروں سے اوجھل تھے، جبکہ میرا پورا جسم صحیح سلامت تھا۔ نہ کہیں زخم کا کوئی نشان، نہ خون کے آثار حتیٰ کہ ہاتھ پاؤں بھی بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ خود کو صحیح سلامت دیکھ کر میں بے اختیار سجدے میں گر گئی۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے وہ جو چاہے کر لیتا ہے۔ میں سجدے میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لا رہی تھی، میری نظر زمین پر رینگنے والی مکڑی پر پڑی۔ میں نے سجدے سے سر اٹھا کر مکڑی کو ہتھیلی پر اٹھا لیا۔ مکڑی کو دیکھ کر میرے ذہن میں عربی کے چند اشعار کا ترجمہ ابھرنے لگا، ابن نقیب نے کیا خوب کہا ہے۔ ریشم کا کیڑا جو ریشم بناتا ہے، اسے پہن کر ہر شخص جمال حاصل کرتا ہے، لیکن مکڑی اس سے زیادہ جلیل الشان ہے کہ اس نے سرکارِ دو عالم فخر دو عالم حضرت محمد ﷺ کے لیے جالا تن دیا۔"

میں نے مکڑی کو بڑی عزت و احترام سے ایک پتھر پر چھوڑا اور اپنی ان دیکھی منزل کی طرف چل پڑی۔

اس سے پہلے جب میں اپنے ہمسفر کے ساتھ ان دیکھی منزل کی جانب چلی تھی تو میری عجیب کیفیت تھی۔ میرا جی چاہا تھا میں اس شخص کے بال نوچ لوں جس نے ایک بے بس و لاچار پیاسے آدمی کا کشکول بار بار گرایا تھا، میں سست روی سے چلنے والے بے پروا شخص کو پیٹ میں زور زور سے گھونسے مارنے کی خواہاں تھی اور پی چاہ رہا تھا اس کے دل و دماغ پر بھی ظلم و ستم کی ساری کائی دھو ڈالوں، مگر میری یہ کیفیت تب تک تھی جب تک میں ایمان تھی۔

میں آج بھی ان دیکھی منزل کی طرف گامزن تھی۔ مگر آج میں اکیلی تھی، میں نے تنہا جنگل، میدان، پہاڑ اور ریگستان کا سفر طے کیا۔ سفر کرتے کرتے میں ایک قبرستان میں جا نکلی، مجھے بہت اچھی طرح سے یاد تھا، اس قبرستان کے سامنے بجھے ہوئے خوشوں کا والا ایک درخت تھا۔ خوشبو کے سائے میں بیٹھ کر میں نے بند آنکھوں سے ایک حسین و جمیل جگہ کا نظارہ کیا تھا۔ درخت کے پاس پہنچ کر میری حلاشی نگاہیں پانی کی ٹینکی کے لیے بھٹکنے لگی۔ میری نظریں جیسے ہی مشرق کی جانب اٹھیں، میں نے بہت بڑی ٹینکی کو جا لیا۔ ہاں وہی ہے بالکل یہی ٹینکی ہے، میں نے خود کلامی کی اور ٹینکی کی طرف تیز قدموں سے چل پڑی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ ٹینکی کو ابھی ابھی بھرا گیا ہے، ٹینکی کے اور فلوں سے پانی گر رہا تھا۔ عنقریب یہ پانی اور گرد کے سو گھروں میں پہنچ جانا تھا۔ میرے تصور میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئی، میں نے بے اختیار ایک جھرجھری لی اور تیزی سے ٹینکی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ قریب کے چند لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے اوپر جاتے ہی ٹینکی کی صفائی والا بند گیٹ والو کھول دیا۔ پانی پوری طاقت سے نیچے گرنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے سپلائی ہونے والے پائپ کا والو بند کر دیا تاکہ پانی کی ترسیل رک جائے۔

اے لڑکی کیا کر رہی ہو، رک جاؤ پاگل ہو گئی ہو کیا۔ تیز آبشار کی طرح گرتے ہوئے پانی کو دیکھ کر نیچے والے چیخ پڑے۔

ارے مارے، بند کرو پانی پاگل، لوگوں کی چیخ و پکار آوازوں کی میں نے چنداں پروا نہیں کی۔

"روکو یار اسے ورنہ یہ بے وقوف سارا پانی ضائع کر دے گی۔"

میں نے نیچے جھانک کر دیکھا، لوگ میری جانب دوڑ پڑے تھے، پانی کی یہ ٹینکی اسٹیل اسٹرکچر کے بلند تاور پر رکھی گئی تھی، یقیناً لوگوں میں سے چند آدمی اوپر آنے کی کوشش کریں گے، اور شاید میں انہیں باز نہ رکھ سکوں، اس لیے میں فوراً سیڑھیاں نیچے اترنے لگی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ پانی کیوں کھول دیا ہے؟" نیچے اترنے ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ تمہیں معلوم ہے یہ پانی یہاں کے سو سے زائد گھروں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ انتہائی غصے میں ایک شخص نے مجھے کہتے کہتے روئے سخن ساتھ کھڑے آدمی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "رستم جاؤ پانی بند کرو۔"

جی ٹھیک ہے، رستم کہتا ہوا جیسے ہی سیڑھیاں چڑھنے لگا میں نے اسے زور کا دھکا دیا، وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

لوگوں کی حیرت سے سٹی گم ہوگئی، انہوں نے مجھے حیرت و غصے میں دیکھا، میرے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

"دل چاہتا ہے تمہیں اُٹھا کر زمین پر پٹخ دوں، مگر تم ہو لڑکی۔"

مجھے تو یہ پاگل لگتی ہے، مٹکے کے نیچے اکیلے کر دیتا کراسے پتھر مار مار کر یہاں سے نکالا جائے، یہ تجویز دینے والے شخص کے قریب جا کر میں نے اس کی چھاتی پر سیدھی ہتھیلی کا وار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پانی زہر آلود ہے، تم لوگ اپنی بچوں کی لاشیں دیکھنا پسند کرو گے۔"

"اے لڑکی! اس سے پہلے کہ ہم تمہیں قتل کر دیں یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"میرا قتل تم لوگوں کی تباہی کو نہیں روک سکتا۔ تم لوگ خود اپنے ہاتھوں سے لاشوں کے ڈھیر اٹھاؤ گے بجز اس کے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے لہجے کے اعتماد نے ان کی زبانوں کو تالے لگا دیے۔ میں نزدیکی راستے کی طرف چل پڑی، مجھے یقین تھا وہ پانی بند کرنے کی جرأت نہیں کریں گے، چند میٹر چلنے کے بعد میں نے مڑ کر کہا۔ ٹنکی خالی ہو جائے تو اسے دھو کر بھر سے بھر لینا، محفوظ رہو گے، میں انہیں حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

مجھے یاد آیا میرے ہمسفر کا نام عبداللہ تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا، اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔ کاش وہ پھر سے مجھے آ ملے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے حیرت بھرے انداز میں سوچا۔

بہت سے بھید مجھ پر اب کھل رہے تھے، میں نے عبداللہ سے جو کچھ سیکھا تھا، آتشیں حالات میں وہ بھول گئی تھی، مگر اب پھر اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ میری یادداشت میں لوٹ آئے تھے، میں نے عبداللہ سے اللہ تعالیٰ کو دلیل سے پہچاننے کے بارے میں پوچھا تھا، اس نے کیا خوب جواب دیا تھا۔

"مطلب اللہ تعالیٰ کو عقل و خرد اور دلیلوں سے نہیں بلکہ عشق و محبت سے پہچانو۔"

عبداللہ نے مجھے مولوی اور صوفی کے بارے میں بار بار بتایا تھا۔ اس نے آخری لمحات میں کہا تھا۔

"میرے اور تیرے پاس جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دولت ہے۔ اس کی نظر عنایت ہے، سر فخر سے کبھی اٹھنے نہ دینا اور وصیت کر جانا۔ جب مٹی سے مٹی بن جاؤ تو ضرور مجھے زیارت کرنی ہو۔ یہ لوگ جنہیں ولی بنا کر بیٹھے ہیں، جنت البقیع میں جا کر دیکھ لینا سب سمجھ جاؤ گی۔" میرے دل میں ایک اور حسرت نے انگڑائی لی۔ کاش میں جنت البقیع کو دیکھ لوں۔

میرا دل کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا، یہ جو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا روک ٹوک پہنچ رہی ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے میں نے سوچا مجھے خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ حالات جس رخ پر لے چلیں چلنا ہوگا۔

☆......☆

چھن چھن چھنا چھن، چھن چھن، چھنا چھن۔ گھنگرو کی لہراتی ہوئی آوازیں، حق اللہ کی پرسوز و دل سوز آواز، ڈھولک کی تھاپ اور بانسری کی لے۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، گلے میں موتیوں کی بے شمار مالائیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے گجرے اور کڑے۔ جسم پر سبز رنگ کا لمبا چغہ۔ ہاتھوں کی ساری انگلیوں میں تیروں والی انگوٹھیاں۔ پاؤں میں چھن چھن کرتے گھنگرو اور لوگوں کے ہجوم میں مست دھمال۔

یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی ہوں، بے شمار لوگ جوق در جوق اندر احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ مرکزی دروازے پر اندر داخل ہونے والے افراد کی پولیس باقاعدہ تلاشی لے رہی تھی، یہاں کا ماحول دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا میں کسی عرس میں آ گئی ہوں۔ نظریں گھما کر دیکھا تو ایک عبارت پر نگاہیں جم گئیں۔

"کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا۔ گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں۔"

شعر پڑھ کر میری نگاہوں میں سید پیر مہر علی شاہ کی قد آور اور بزرگ ہستی جلوہ افروز ہونے لگی۔ پیر مہر علی شاہ صاحب وہ عظیم ہستی ہیں جنہیں آج کے مسلمانوں کا محسن کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ امت مسلمہ پر ان کا عظیم احسان ہے۔ ان کی محنت و بردباری کا نتیجہ ہے کہ اسلام برصغیر میں اپنی اصل حالت میں پروان چڑھا اور ہم تک پہنچا۔

میں نے عبارت سے نگاہیں ہٹا کر دیکھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ زمین سے نکل رہے تھے۔ دل میں اشتیاق نے انگڑائی لی۔ جھانک کر دیکھا تو پتا چلا زیرِ زمین وضو خانہ ہے۔ لوگ باوضو ہو کر نیچے سے اوپر آ رہے ہیں، کچھ کا رخ مسجد کی طرف تھا۔ کچھ کا اس عمارت کی طرف جس میں لوگ بڑی عزت و احترام سے داخل ہو رہے تھے۔

یہ عمارت زمینی سطح سے دو ڈھائی میٹر اونچی تھی، میں بھی اس طرف بڑھ گئی، اندر جا کر پتا چلا یہ کسی کا مزار ہے۔ اندر سبز قالین بچھی ہوئی تھی، کمرے کے وسط میں قبر تھی، جسے چاروں طرف سے جالیوں کا پہرہ دیا گیا تھا۔ اندر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک کا عمل جدا جدا تھا۔ کوئی جالیاں چوم رہا تھا کوئی جالیوں سے ہاتھ رگڑنے کے بعد جسم پر پھیر رہا تھا۔ کوئی جالیوں سے رخسار رگڑنے میں مصروف تھا اور بہت سے افراد سجدے کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ سارے مشرکانہ عمل دیکھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا۔ میں نے قرآن پاک کو جب بھی پڑھا باترجمہ پڑھا۔ اس لیے بہت سی آیات کریمہ کا ترجمہ میرے ذہن میں اکثر تر و تازہ رہتا ہے۔ یہاں لوگوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً "سورۃ حشر کی آیت 19" کا ترجمہ ابھرنے لگا۔ "تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔" میں تھوڑی دیر وہاں کا ماحول دیکھتی رہی، ساتھ ہی سورۃ الزمر کی آیت نمبر 36 کا ترجمہ دل میں دہرانے لگی۔ "کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کافی نہیں۔"

قرآنی آیات کا مبارک ترجمہ ذہن میں تازہ ہوا تو ساتھ ہی کچھ حدیث پاک بھی یاد آنے لگی۔

ترجمہ۔ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکال وہ ناقابلِ قبول ہوگی۔

یہ حدیث اتنی سخت تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں تھر تھر کانپنے لگی۔ میں نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک طرف کونے میں ہو کر بیٹھ گئی، یہاں پر کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی، ہر شخص اپنے حال میں مست تھا۔ میں نے بیٹھ کر سر دیوار کے ساتھ ٹیک دیا اور آنکھیں موند لی۔ آنکھیں بند کرتے ہی ذہن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ایک اور حدیث پاک تازہ ہونے لگی۔ ان سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی، پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے اور پھر اس لکیر کے دائیں جانب کئی لکیریں کھینچیں اور کئی لکیریں بائیں جانب کھینچیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان سب راستوں پر ایک ایک شیطان کھڑا اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے قرآن کی آیت مبارکہ پڑھی۔

"اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اس پر چلو۔"

اتنا کچھ یاد آنے کے بعد مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ آنکھیں کھول کر یہاں کا ماحول دیکھوں۔ میں نے آنکھیں بند کیے رکھیں، چند لمحے سوچیں یونہی ادھر ادھر بھٹکتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور ایسی پاک حدیث ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگی کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نبی آخر الزماں، رحمت اللعالمین، فخرِ دو عالم حضرت محمد ﷺ نے دعا فرمائی تھی۔

"اے اللہ میری قبر کو عرس گاہ نہ بنانا۔" یہ حدیث بخاری شریف میں موجود ہے، میں نے بدک کر آنکھیں کھول دیں، میرا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ میرے قریب ہی ایک شخص سجدے کی حالت میں لوٹ پوٹ تھا، میں نے اسے تھپکی دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

اے بھائی سنو۔ میری آواز پر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اس کی حیرت زدہ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

جی۔ اس نے مختصراً کہا۔

یہ کس کا مزار ہے بھائی؟ میرے سوال پر اس کے چہرے کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ جواب دینے کی بجائے مجھے حیرت و پریشان نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

بولو بھائی۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار وہ چونک کر بولا۔

آپ یہاں آ کر بیٹھ گئی ہیں آپ کو نہیں پتا یہ کس کا مزار ہے۔

نہیں بھائی۔

تو پھر یہاں آئی کس لیے ہو۔

یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بھائی کہ میں یہاں کس لیے آئی ہوں۔

عجیب لڑکی ہو۔

بتاؤ نا بھائی یہ مزار کس کا ہے۔

یہ پیر سید مہر علی شاہ کا مزار ہے۔ جواب سن کر میں نے طویل سانس لی اور ایک بار پھر سر دیوار سے لگا دیا۔ شعر پڑھ کر مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں ایک عظیم ہستی کے مزار میں کھڑی ہوں جسے اس صدی کا مجدد کہا جاتا ہے۔ اب پتا چلا تو مجھے دو شدید جھٹکے لگے۔ ایک یہ کہ میں گولڑہ شریف میں موجود ہوں جو راولپنڈی سے صرف گیارہ میل دور ہے۔ اس کا مطلب ہے میرا گھر سے صرف 25 میل دور ہوں۔ مجھے دوسرا جھٹکا حدیث پاک کے یاد آنے سے لگا۔ فرمان رسول کریم ﷺ ہے۔

"جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی وہ ہماری امت سے نہیں۔"

آہ میں نے انتہائی سرد اور درد بھری آہ کھینچی۔ کہاں پیر سید مہر علی شاہ کی تعلیمات اور کہاں ان کے چاہنے والوں کا مزار مہر علی کے ساتھ یہ حشر۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا، یہ مہر علی شاہ کی تعلیمات اور دینی خدمات کی سراسر حق ہے۔ میں نے کچھ دیر خود پر ضبط کیا مگر رہا نہ گیا تو اس آدمی سے پوچھا۔ آپ کو پیر مہر علی شاہ کی تاریخ ولادت کا پتا ہے۔ میرے سوال پر وہ بوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے تاسف بھرے لہجے میں اسے بتایا۔ خواجہ پیر مہر علی شاہ یکم رمضان المبارک 14 اپریل 1859ء میں پیدا ہوئے۔ 25 واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے اور 35 واسطوں سے حضرت حسن سے۔

تفصیل بتاتے ہوئے شاید میری آواز کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ قریب کے چند دوسرے لوگ بھی ہمارے طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے سوچا اچھا ہے۔ جالیوں کو چوم کر ہاتھوں سے جسم پر پھیرنے والے ان عاشقان مہر علی سے بھی کچھ استفادہ کر لیا جائے۔ میرے ذہن میں اس سلسلے میں جو کچھ پڑھا تھا۔ سب تازہ ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

آپ میں سے کوئی یہ بتا سکتا ہے، پیر مہر علی شاہ نے سلسلہ چشتیہ میں کس سے بیعت لی تھی۔

میرے سوال پر لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تاہم بولا کوئی نہیں، بہت سوں نے بے چینی سے پہلو بدلے اور مجھے متوقع نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

اٹک کی تحصیل حسن ابدال کے نواحی موضع بھوئی میں مولانا محمد شفیع قریشی سے پیر مہر علی شاہ نے ڈھائی سال تک تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے منطق میں قطبی تک اور نحو درسیوں کے درمیان اسباق تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ضلع شاہ پور کا رخ کیا۔ وہاں سے کے ناقہ ہوں کے موضع انگہ میں سلطان محمود انگوی سے استفادہ کیا۔ آپ مولانا صاحب کے ساتھ ان کے مرشد خواجہ شمس الدین سیالوی کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی سے پیر مہر علی شاہ نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ میرے خاموش ہونے پر ایک بڑی عمر کے آدمی نے نرمی سے کہا۔

بیٹی! پیر مہر علی کے بارے میں کچھ مزید جانتی ہو تو ہمیں بتاؤ، تاکہ ہم پیر جی پیر صاحب کے حالات زندگی آگاہ رہیں۔

لوگوں کا بہت بڑا حلقہ لگ گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ میری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ میں نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے سوچا۔ اس رش میں گنتی کے چند لوگ ہوں گے جو پیر مہر علی شاہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے۔ باقی سب اپنی غرض یعنی حاجت منوانے آئے ہوں گے۔ میں نے اپنی معلومات کے مطابق کہنا شروع کیا۔

انگہ سے فارغ ہو کر گولڑہ شریف واپس تشریف لائے تو علوم کے بہت سے درجات ابھی باقی تھے۔ حدیث شریف میں صحاح ستہ، میں آگے بتانا چاہ رہی تھی کہ ایک خیال سے پوچھا۔

صحاح ستہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ جواب ملا۔

بی بی۔ آپ بولتی رہیے، ہم سے کچھ مت پوچھیں۔

حدیث شریف کی چھ مشہور اور سب سے زیادہ مستند مانی جانے والی کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔

ان چھ کتابوں میں ایک مشہور کتاب صحیح بخاری ہے۔ حدیث کی اس مستند کتاب میں 7275 احادیث مبارکہ مذکور

ہیں، اسے امام بخاریؒ نے مرتب فرمایا ہے۔ امامؒ صاحب کی پیدائش 194ھ اور وفات 256ھ ہے۔ اس کتاب کو امام صاحب نے اٹھارہ سالوں میں مکمل کیا تھا۔

دوسری مستند کتاب سنن ابی داؤد ہے۔ اس میں 4800 حدیثیں مذکور ہیں، اس کتاب کو مرتب کرنے والے داؤد سلمان بن الاشعث البحستانی ہیں۔ ان کی پیدائش 204ھ اور وفات 275ھ میں ہوئی۔ تیسری کتاب کا نام ہے سنن ابن ماجہ۔ یہ ابن ماجہ الربعیؒ کی مرتب کردہ کتاب ہے، جن کی تاریخ پیدائش 209ھ اور وفات 273ھ ہے۔ اس تالیف میں 4341 احادیث پاک ﷺ درج ہیں۔

چوتھی کتاب جامع ترمذی ہے۔ تالیف ابوعیسیٰ الترمذی۔ پیدائش 202ھ اور وفات 279ھ ہے۔ اس کتاب میں کتنی احادیث شریف مذکور ہیں مجھے یاد نہیں۔

پانچویں کتاب سنن نسائی ہے۔ اسے ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی نے مرتب کیا ہے۔ ان کی پیدائش 215ھ اور وفات 302ھ ہے۔ افسوس کہ مجھے اس کتاب میں مذکور احادیث کی تعداد بھی یاد نہیں رہی۔ چھٹی کتاب صحیح مسلم ہے۔ یہ مسلم بن حجاج قشیری کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش 206ھ اور وفات 261ھ ہے۔ حدیث کی اس مستند کتاب میں 6500 احادیث مذکور ہیں۔

ایک دوسری بات میں آپ لوگوں کو بتاؤں۔ ماسوائے امام نسائیؒ کے صحاح ستہ کے تمام مصنفین کی وفات خلیفہ المعتمد علی اللہ کے دور خلافت میں ہوئی ہیں۔

ہم بات کر رہے تھے پیر مہر علی شاہؒ کے بارے میں۔

بابا جی۔ ہمیں بتا ئیں بی بی جی۔

میں کہہ رہی تھی پیر صاحب کی تعلیم ابھی ادھوری تھی۔ صحاح ستہ، تفسیر میں بیضاوی، درس نظامی میں فلسفہ، معقول، ریاضی اور فقہ کی آخری کتب وغیرہ باقی تھی، ان کے حصول کے لیے 1290ھ میں مولانا احمد حسن محدثؒ کی خدمت میں کانپور چلے گئے۔ مگر مولانا صاحب کی حج روانگی کے سبب پیر مہر علی شاہؒ، مولانا احمد حسنؒ کے استاد گرامی مولانا لطف اللہ کے پاس علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ مولانا لطف اللہؒ سے قرآن مجید، کتب احادیث، صحاح ستہ اور کچھ خصوصی احادیث کی سندات حاصل کیں۔ پانچ سال بعد فارغ التحصیل ہو کر گولڑہ شریف واپس لوٹ آئے۔ میں کہتے ہوئے خاموش ہو گئی، میں نے دیکھا جو لوگ اپنی عبادت میں مشغول تھے وہ بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے، میں شش و پنج میں گر گئی۔ بات جاری رکھوں یا سلسلہ موقوف کر دوں۔

بی بی۔ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے بارے میں ایسی باتیں کم ہی سننے کو ملتی ہیں، آگے بولو بی بی۔ میں نے لوگوں کے اندر جوش و جذبے کو پروان چڑھتا دیکھا تو کہا۔

مریدین کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کے بارے میں تمام اہم معلومات حاصل کریں اور انہیں یاد رکھیں، مرشد کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی دنیاوی اور اخروی زندگی سنوار سکتے ہیں۔

آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے پیر مہر علی شاہ نے شادی کہاں سے کی تھی؟ میرے سوال پر ایک پچاس پچپن سالہ شخص بولا۔ ضلع اٹک کی تحصیل حسن ابدال پیر مہر علی شاہ کا ننھیال ہے۔ وہیں سید چراغ علی شاہ کی دختر سے شادی ہوئی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ بالکل آپ نے درست فرمایا ہے۔ مجھے ان کی شادی کی حتمی تاریخ تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے۔ 1890ء میں آپ خواجہ عبدالرحمٰن کے ہمراہ مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے تھے۔ روانگی سے غالباً آٹھ دس سال قبل شادی ہوئی تھی۔

”اب میں ایک اور اہم بات بتاؤں۔“

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابل فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

شعلہ ساماں تحریریں

پہلا شعلہ

نظر کا دھوکا



حنا بشریٰ

روحانی باپ کے گرد گھومتی ایک شعلہ ساماں تحریر

سمیرہ سے میری ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے اسلامک ڈپارٹمنٹ میں ہوئی۔ یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا اور میں بے حد نروس تھی۔ میری کوئی کلاس فیلو بھی ساتھ نہ تھی۔ جب کہ پہلی مرتبہ کو ایجوکیشن سے میرا واسطہ پڑ رہا تھا۔ چوں کہ آج کلاس میں پہلا دن تھا، اسی لیے زیادہ تر اسٹوڈنٹس غیر حاضر تھے۔

میں کلاس میں خاموش بیٹھی تھی کہ ایک دل کش نقوش والی لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد میری خاموشی سے اکتا کر وہ خود ہی مجھ سے بولی۔

"میرا نام سمیرہ ہے اور آپ کا؟" وہ میری طرف برابر دیکھ رہی تھی۔

"حنا بشریٰ!" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کافی گھل مل گئے تھے۔ اس میں زیادہ ہاتھ سمیرہ کی ملنساری اور خوش مزاجی کا تھا، ورنہ میں کم ہی لوگوں سے گھلتی ملتی ہوں۔ چند دنوں میں ہمارے گروپ میں نیلم اور کومل کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بھی اچھی طبیعت کی مالک تھیں، مگر سمیرہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سادہ دل بھی تھی۔ ہر کسی پر جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ ہم اُسے سمجھاتے اور منع کرتے تھے کہ یوں ہر کسی پر اعتبار کر لینا اور اپنے طور پر رائے قائم کر لینا مناسب نہیں، مگر وہ ایک کان سے سنتی تھی اور دوسرے سے نکال دیتی تھی۔

☆....☆

اُس دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہواؤں نے ماحول کو بے حد خوب صورت بنا دیا تھا۔ کلاس لینے کے بعد میں باہر لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"اچھا تم یہاں چھپی بیٹھی ہو!" سمیرہ کی شوخ آواز پر میں نے سر اٹھایا سامنے ہی سمیرہ کے ساتھ نیلم اور کومل بھی کھڑی تھیں۔ "اور ہم تمہیں سارے ڈپارٹمنٹ میں ڈھونڈ رہے تھے۔" کومل یہ کہتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"اللہ! موسم کتنا خوب صورت ہو رہا ہے، چلو آؤ کینٹین چلتے ہیں یار۔" سمیرہ نے کہا۔

"نہیں تم لوگ ہو آؤ، میں یہاں بیٹھی ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم بھی یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے سمیرہ اور نیلم بھی بیٹھ گئیں۔ "ویسے حنا، کیا خیال ہے،

ٹیچرز تو تمام اچھے ہیں۔'' نیلم نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں سب ہی اچھے ہیں۔'' میں نے بھی رائے دی۔

''ہاں! مگر پروفیسر وصی احمد کی کیا بات ہے۔ اُن کی شخصیت کی سادگی اور چہرے پر نورانی جھلک انھیں مزید سوبر بنا دیتی ہے۔'' سمیرہ عادت کے مطابق پروفیسر وصی احمد کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھی۔

''سمیرہ اتنی جلدی کسی کے بارے میں رائے نہ قائم کیا کرو۔ بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی سچ نہیں ہوتا۔'' نیلم ناصحانہ انداز میں بولی۔

''اور ویسے بھی ہم یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں کسی کے بارے میں حد سے زیادہ مثبت اور منفی رائے رکھنے کی ضرورت نہیں۔''

یہ کومل تھی، جو اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

''اُفوہ! اب تم لوگ مجھے بور نہ کرو۔'' سمیرہ چڑ کر بولی۔ اُس کے جواب پر نیلم نے میری طرف بڑی حیران کن نظروں سے دیکھا تھا، جب کہ میں بے بسی سے خاموش رہی تھی۔

سمیرہ پروفیسر وصی احمد کے پیریڈ میں بہت نارمل ہوتی تھی۔ اُس کے کہنے کے مطابق ان کا انداز اُسے کنفیوژ نہیں ہونے دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ سمیرہ پروفیسر وصی کی مزید گرویدہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بھی خاصے خاموش مزاج واقع ہوئے تھے۔

☆...☆

اُس دن پروفیسر وصی احمد کی کلاس تھی۔ سمیرہ نے کوئی بات کی تو یک لخت نیلم اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ہمارے ہنسنے پر سمیرہ بھی ہنسنے لگی۔ اس لمحے پروفیسر وصی کی نظر ہم پر پڑی تھی اور ہم ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

''میرے خیال میں میرے لیکچر سے زیادہ ضروری آپ لوگوں کا ہنسنا ہے۔'' پروفیسر وصی احمد نے یہ کہتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور روم سے باہر نکل گئے۔

☆...☆

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے!'' نیلم، سمیرہ پر برس پڑی۔



"میں نے کیا کیا ہے؟" سمیرہ بے بسی سے بولی۔

"تو کیا ضرورت تھی کلاس میں ہنسنے کی!" کنول بھی بول پڑی۔

"سر کیا سوچ رہے ہوں گے ہمارے بارے میں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"چلو آؤ سر کے آفس میں جا کر ان سے ایکسکیوز کر کے آتے ہیں۔" اور پھر ہم چاروں نے سر کے آفس میں جا کر سوری کی۔ ہمارے معذرت کرنے پر پروفیسر وصی احمد کا موڈ بحال ہوا تھا، مگر اس دن کے بعد سے مجھے شک ہو گیا تھا کہ سر بار بار سمیرہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ اسے بار بار بات بے بات مخاطب کرنے لگے تھے۔

ایک دن کہنے لگے۔ "سمیرہ آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"

سمیرہ جو سر جھکا کر نوٹ بک پر کچھ لکھ رہی تھی، سر کی آواز پر چونکی تھی۔

"جی سر!" سمیرہ نے گڑبڑا کر سوال کیا۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ آپ کے نام کا کیا مطلب ہے، بڑا یونیک سا ہے تمہارا نام، اس سے پہلے کبھی سنا نہیں۔" پروفیسر وصی احمد خوش دلی سے بولے۔

"سر میرے نام کا مطلب ہے حسین اور خوب صورت۔" سمیرہ نے بڑی سادگی سے اپنے نام کا مطلب بتا دیا۔

"واقعی صحیح نام رکھا گیا ہے آپ کا۔" پروفیسر وصی احمد کے ذومعنی انداز پر میں چونک گئی تھی، مگر ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوتا سو میں خاموش ہو رہی تھی۔

☆....☆

چوں کہ کلاس میں میل اور فی میل اسٹوڈنٹس کے درمیان میں پردہ حائل ہوتا ہے، اس لیے صرف آواز ہی پہنچ رہی ہوتی ہے۔

اس دن کلاس کے دوران پروفیسر وصی احمد کی بات پر کسی میل اسٹوڈنٹ نے کوئی جواب دیا اور تمام کلاس ہنسنے لگی تھی۔ سمیرہ بھی ہنسنے ہنسانے کے معاملے میں بے حد فراخ دل واقع ہوئی تھی۔

اس وقت پروفیسر وصی احمد نے سمیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"واقعی کچھ لوگ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

وہ کہہ رہے تھے کہ "پہلے جہاں میں پڑھاتا تھا، وہاں ایک اسٹوڈنٹ کو بے حد ہنسی آتی تھی، مگر لڑکیوں کے ہنسنے میں ایک الگ خوب صورتی ہوتی ہے۔" پروفیسر وصی احمد کی بات پھر ذومعنی تھی۔

☆....☆

ہم چاروں کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سمیرہ خوب سموسوں سے انصاف کر رہی تھی، کینٹین میں تو اس کی ہنسی ویسے بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی تھی۔ نیلم کی کسی بات پر سمیرہ بے تحاشا ہنسنے لگی تھی۔ اس کو اس طرح کھل کر ہنستا دیکھ کر میں اور کنول بھی مسکرانے لگی تھیں۔ اسی وقت قریب سے پروفیسر وصی احمد گزر رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر رک گئے۔

"ہمیں بھی بتائیے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" پروفیسر وصی برابر سمیرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہ ظاہر سر کا انداز بے حد سادہ تھا، مگر ان کی آنکھوں میں ایک شاطرانہ چمک نمایاں تھی۔

"سر کچھ خاص نہیں۔" سمیرہ نگاہیں جھکا کر شرمندگی سے بولی۔

پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے چلے گئے تھے۔ سفید شلوار قمیص میں ان کا سراپا نمایاں تھا۔ وہ خاصی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے، مگر مجھے نہ جانے کیوں اس پروفیسر سے نامعلوم سی چڑ ہو گئی تھی۔

"سمیرہ سر سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔" ان کے جانے کے بعد میں سمیرہ سے مخاطب تھی۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" سمیرہ لاپروائی سے بولی۔

"کیا آتے جاتے اس طرح ان کا ہمیں مخاطب کرنا اور بلاوجہ کی بات کرنا کوئی اچھی بات ہے۔" نیلم ناصحانہ انداز میں بولی۔

"دراصل سر بے حد جولی نیچر طبیعت کے مالک ہیں۔ مجھے تو سر کو دیکھ کر اپنے ایک انکل کا خیال آ جاتا ہے، وہ بھی بالکل سر کی طرح خوش مزاج ہیں۔" سمیرہ کا وہی انداز تھا جو پروفیسر کے لیے اس نے پہلے دن سے

رکھا ہوا تھا۔

”ہاں! مگر سر تمہارے انکل نہیں ہیں۔“ میں غصے سے بولی۔

”اچھا اوکی اماں سمجھ فرمایا آپ نے۔“ سمیرا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔

اُس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہماری باتوں کو سنجیدگی سے لینے کو تیار نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دنیا میں رہنے والے کیا کیا روپ بدلتے ہیں۔

☆......☆

ابھی دنوں پروفیسر وصی احمد کی پروموشن ہوئی تھی، تمام ٹیچرز نے مل کر ان کے اعزاز میں پارٹی ارینج کی تھی۔ سمیرا بھی پھول اور گفٹ لے کر سر کے آفس پہنچ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر پروفیسر وصی احمد بے حد خوش ہوئے تھے مگر وہ میل اسٹوڈنٹس کی موجودگی کی وجہ سے اس سے کوئی بات نہ کر سکے۔ مجھے سمیرا پر بے حد غصہ آ رہا تھا کہ اسے کیا ضرورت تھی ان کے آفس میں جا کر انہیں پھول دینے کی، مگر سمیرا کو کون سمجھائے۔

☆......☆

ایک دن پروفیسر وصی احمد بے حد پریشان تھے۔ تمام کلاس کے پوچھنے پر سر نے بتایا تھا کہ اُن کی بیوی بہت بیمار ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ یہ سن کر ہم سب کو بہت افسوس ہوا۔ اگلے دن جیسے ہی ہم یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر وصی احمد کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور تمام کلاس تعزیت کے لیے اُن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سمیرا بھی اس حادثے پر بے حد دل گرفتہ تھی۔ تمام کلاس افسوس کر رہی تھی، سر بے حد نڈھال اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خلافِ توقع سمیرا بے حد خاموش تھی۔ اُس کی خاموشی پر پروفیسر وصی احمد نے بڑی شکوہ کناں آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے اس طرح دیکھنے پر سمیرا کو کیا سمجھ آئی تھی یہ تو مجھے پتا نہیں، البتہ میں اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی تھی۔ مجھے پروفیسر وصی احمد کی سمیرا کی ذات میں حد درجہ دلچسپی زہر لگ رہی تھی۔

اُس دن موسم بے حد ابر آلود تھا، میں اور نیلم تو آئے تھے، مگر سمیرا اور کومل نے شاید موسم کے تیور دیکھتے ہوئے چھٹی کر لی تھی۔ جب پروفیسر وصی احمد کلاس میں آئے تو دورانِ لیکچر بار بار اُن کی نظریں ہماری طرف اُٹھ رہی تھیں، آخر ان سے نہیں رہا گیا اور انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

”حنا آج سمیرا نہیں آئی۔“ پروفیسر وصی احمد نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

”نو سر!“ جواب دیتے ہوئے میں ان کی اس حرکت پر جل بھن کر رہ گئی تھی، کہ سر کس خوشی میں سمیرا کی اتنی فکر کر رہے تھے۔

سر کے اس طرح اچانک پوچھنے پر تمام کلاس نے ہماری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے یہ ان کے لیے بے حد خاص بات تھی۔ کافی اسٹوڈنٹس غیر حاضر تھے مگر کسی خاص کا اس طرح پوچھنا لوگوں کو شک میں مبتلا کرتا تھا۔ یہ سب سمیرا کی ہی بے وقوفی کا نتیجہ تھا۔

☆......☆

اگلے دن سمیرا آئی تو تمام کلاس کے ذریعے اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ سر اُس کے بارے میں کتنے فکرمند تھے۔

”کیا سچ، سر میرا پوچھ رہے تھے واقعی!“ سمیرا حیرت زدہ تھی۔

”جی واقعی!“ میں نے جل کر کہا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ پروفیسر وصی احمد سب سے الگ ہیں اور کتنے کیئرنگ بھی، انہیں اپنے اسٹوڈنٹس کی کتنی فکر ہوتی ہے۔“ وہ مگن تھی اُن کی قصیدہ گوئی میں۔

”تمام اسٹوڈنٹس کی نہیں، صرف ایک اسٹوڈنٹ کی فکر ہے انہیں..... آخر سمیرا تم پروفیسر وصی احمد کو کیوں اتنا فری کر رہی ہو۔“ میں نے بے بسی سے پوچھا۔

”کیوں کہ سر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سر بہت نیک اور اچھے انسان ہیں۔ میں سر کی بہت عزت کرتی ہوں، بالکل اپنے والد کی طرح۔“ سمیرا بہت جذب سے لفظوں میں ڈوب کر بول رہی تھی۔

میں ہمیشہ کی طرح چپ ہو گئی تھی۔ وہ سر کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ ظاہر ہے اُس کے دل

میں کوئی برائی نہ تھی۔

☆.....☆

گرمیوں کی بے حد خوش گوار دوپہر تھی۔ کبھی بادل اور کبھی بارشوں نے گرمیوں کی تپش کافی حد تک کم کردی تھی۔ آم کے درختوں پر آم بہار دکھانے لگے تھے۔ ہم لوگ باغ میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ سمیرا اچانک بولی۔

"آؤ حنا! چل کر آم توڑیں، بڑا مزا آئے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ بہت پُر جوش تھی۔

"کیسے توڑیں گے آم؟" میں نے آم کے پیڑ کی جانب نگاہ کی جو لمبا چوڑا قد لیے کسی دیو کی مانند آموں سے لدا کھڑا تھا۔

اسی لمحے سمیرا کی نگاہ ایک لمبے ڈنڈے کی طرف گئی، جو خاصا بھاری بھی تھا، پھر کیا تھا، نیلم اور کومل بھی اس نیک کام میں شامل ہو گئیں۔ آم تو کیا ٹوٹنے تھے، بس بھاری ڈنڈے کو اٹھانے اور مارنے کی وجہ سے خاصا لطف آ رہا تھا۔ اس کھیل میں خوشی سے ہم بے حد ہنس رہے تھے، پھر میری جو نہی نگاہ پلٹی تھی تو گویا میں ساکت سی رہ گئی تھی، پروفیسر وصی احمد نجانے کب سے کھڑے اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

اتنے میں پروفیسر وصی احمد خاصے ہمارے قریب آ گئے تھے۔

"لگتا ہے بچی آپ سب کو آم بہت پسند ہیں۔ ہمیں کہہ دیتے، ہم آپ کو آم منگوا دیتے۔" پروفیسر بہ ظاہر مخاطب تو ہم سب سے تھے، مگر دیکھ وہ صرف سمیرا کو ہی رہے تھے۔

"نہیں سر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" نیلم شرمندگی سے بولی۔

☆.....☆

"اس دن موسم بے حد ابر آلود تھا۔ چھٹی تک تو اچھی خاصی بارش ہو گئی۔ میں اور سمیرا پوائنٹ کا انتظار کر رہے تھے کہ گاڑی میں پروفیسر وصی احمد پاس سے گزرے۔

"ارے آپ آئیں میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" پروفیسر وصی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

"نہیں سر، شکریہ ہم چلے جائیں گے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں نہیں تکلف مت کریں۔" پروفیسر صاحب بضد تھے۔

"چلو آؤ چلتے ہیں۔" سمیرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر سمیرا!" میں ہچکچا رہی تھی، لیکن سمیرا میرے منع کرنے کے باوجود گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ آگے آ جائیں۔" پروفیسر وصی احمد بولے۔

"سر اب دونوں تو آگے نہیں بیٹھ سکتے!" میں نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا، مگر اندر تو خون کھول رہا تھا، البتہ سمیرا بالکل مطمئن تھی۔ اس کا یہی اطمینان مجھے بے چین کر دیتا تھا۔ سر تھے تو اجنبی، غیر مرد۔ اتنا جلدی یقین کر لینا، تھوڑی بے اعتباری تو رکھنی چاہیے..... مگر سمیرا پر تو..... مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

اللہ اس کی حفاظت فرمائے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔

یکایک میری نگاہ سامنے کی طرف اُٹھی تھی۔ پروفیسر وصی احمد آئینے میں سمیرا کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ گو کہ سمیرا اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، مگر میری نظروں سے سر کی حرکت مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ حقیقت میں مجھے پروفیسر وصی احمد کی اصلیت جان کر بے حد دُکھ ہو رہا تھا۔ مجھے ان کی شخصیت کا کھلا تضاد نظر آ رہا تھا۔ ظاہری شرافت اور لیکچر کے دوران وہ اخلاقی گفتگو، وہ پند و نصائح کیا تھا وہ سب کہ ایک شخص بچی جیسی لڑکی پر غلط نگاہ ڈالتا ہو جب کہ وہ لڑکی اسے باپ کا درجہ دیتی ہو۔ افسوس ہو رہا تھا مجھے کہ کیسے کیسے لوگ شعبۂ تدریس سے منسلک ہیں، جنہیں اس شعبے کے تقدس کا بھی خیال نہیں۔

☆.....☆

انہی دنوں ایک لڑکے نے سمیرا کو چھیڑ دیا۔ سمیرا نے پروفیسر وصی احمد کے آفس میں جا کر اس کی شکایت لگا دی۔ سر نے فوراً اس کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔ ان کا اس قدر غصہ بھی اس موقع پر میری سمجھ سے باہر تھا۔ سمیرا بے وقوف اس بات پہ بے حد خوش

ہو رہی تھی کہ سر کتنے اچھے ہیں، کتنے نیک اور باکردار انسان ہیں کہ انہوں نے اس کے کہنے پر ایک اسٹوڈنٹ کو یونیورسٹی سے باہر کر دیا۔

☆.....☆

میں اور نیلم لائبریری میں اسائنمنٹ مکمل کر رہے تھے کہ سبیرہ اور کومل بھی آ گئیں۔

"ارے یہ پڑھاکو دونوں یہاں موجود ہیں۔" سبیرہ یہ کہتے ہوئے ہمارے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"تم دونوں کہاں تھیں؟" نیلم نے پوچھا۔

"ہم دونوں تو سر وصی احمد کے روم میں تھے۔ کچھ ضروری نوٹس مانگے تھے، اُس کے لیے سر نے ہمیں بلایا تھا۔" سبیرہ نے خوشی خوشی جواب دیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میری مسلسل خاموشی پر سبیرہ نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ویسے ہی بس کام کر رہی ہوں۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اچھا سبیرہ وہ لڑکی کون تھی؟" کومل کو اچانک یاد آیا تھا۔

"کون سی لڑکی؟" سبیرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"ارے وہی لڑکی جو سر وصی احمد کے آفس میں تھی، جو حجاب میں تھی۔" کومل نے یاد دلایا۔

"ہاں، وہ لڑکی جو کافی دیر سے رو رہی تھی۔" سبیرہ کو یاد آیا۔

"ہاں، ہاں وہی۔" کومل جلدی سے بولی۔

"یہ کون سی لڑکی ہے جس کے بارے میں تم دونوں فکر مند ہو رہی ہو؟" نیلم نے کڑے تیوروں سے دونوں کو گھورا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے، دراصل جب ہم سر کے آفس میں گئے، تو وہاں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جو کافی دیر سے شاید رو رہی تھی۔ اور سر اُسے مسلسل اگنور کر رہے تھے۔ ہمارے آنے پر وہ روم سے نکل گئی تھی، پتہ نہیں کون لڑکی تھی؟" سبیرہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو پروفیسر وصی احمد ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اُستاد ہیں، مگر بس انسان کیا کہے!" میں غصے میں بولتی چلی گئی۔

"حنا تم کیوں سر کے خلاف سوچتی ہو، ممکن ہے کوئی اسٹوڈنٹ ہو، کوئی پرابلم شیئر کر رہی ہو۔" سبیرہ رسانیت سے بولی۔

"پتا نہیں مگر مجھے سر کے بارے میں اطمینان نہیں ہو رہا اور تم بھی سر سے دور رہا کرو۔ سر کا تمہیں بار بار مخاطب کرنا مجھے زہر لگتا ہے۔" میں نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اوہ کم آن حنا، کیوں فکر کرتی ہو، ایسا کچھ نہیں ہے، تم خوامخواہ دل بُرا کر رہی ہو۔" سبیرہ ازلی لاپروائی سے بولی۔

☆.....☆

انہی دنوں سبیرہ کی سالگرہ کا دن آ گیا تھا۔ گلابی رنگ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اُس نے کیک کاٹا تھا اور ہم سب نے اُسے تحفے دیے تھے۔ ہماری محبتوں پر اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور پھر اچانک ہی سبیرہ کیک لے کر پروفیسر وصی احمد کے آفس میں چلی گئی تھی۔ ہمیں بھی مجبوراً اُس کی تقلید کرنی پڑی، مگر میں سبیرہ سے سخت خفا ہو رہی تھی۔

پروفیسر وصی احمد کی آنکھوں میں سبیرہ کو دیکھتے ہی چمک آ گئی تھی، جو میری نظروں سے مخفی نہ رہ سکی۔

"آپ اگر ہمیں پہلے بتا دیتیں تو ہم کوئی گفٹ لے آتے۔" پروفیسر وصی احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر، اس کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کی دعائیں ہی ہمارے لیے تحفہ ہیں۔" سبیرہ خوش دلی سے بولی، پھر ہمارے منع کرنے کے باوجود سر نے ہمیں چائے پلوائی تھی اور خاصی دیر تک وہ سبیرہ سے باتیں کرتے رہے۔ اس تمام صورت حال میں سبیرہ نے مجھے مکمل نظرانداز کیے رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ میں نظروں سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی، اس لیے وہ میری طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

اگلے دن نیلم اور کومل چھٹی پر تھیں۔ اس لیے میں اکیلی ہی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ سبیرہ کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ میں نجانے کب تک خیالوں میں ہی کھوئی رہتی کہ پروفیسر وصی احمد کی بھاری آواز میرے قریب ہی اُبھری۔

"تو آج آپ اکیلی آئی ہیں۔ آپ کی دوست نظر نہیں آ رہیں۔"

انہوں نے قریب آ کر پوچھا۔

"یس سر! وہ ابھی تک آئی نہیں۔" گھبراہٹ میں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"اچھا! اگر سمیرہ آئے تو اُسے میرے آفس میں بھیج دیں، کچھ کام ہے۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

سر کے جانے کے کچھ دیر ہی بعد سمیرہ آ گئی تھی۔

"ہیلو محترمہ حنا بشریٰ صاحبہ، کہیے کیسے مزاج ہیں؟" سمیرہ یہ کہتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں۔ تم آج بہت لیٹ پہنچی ہو؟" میں نے جواب دیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں، وہ بس نکلتے نکلتے دیر ہو گئی اور پھر پوائنٹ بھی دیر سے پہنچا۔" سمیرہ نے وجہ بتائی۔

"نیلم اور کومل کہاں ہیں، وہ نہیں آئیں؟" سمیرہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نیلم کی طبیعت خراب تھی اور کومل کو ضروری کام تھا اس لیے وہ دونوں نہیں آئیں۔ تمہیں پروفیسر وصی احمد اپنے روم میں بلا رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ ضروری کام ہے۔" میں نے تیکھی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے، مگر کیوں؟" سمیرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں سنجیدگی سے بولی۔

ناچار مجھے بھی اُس کے ساتھ سر کے آفس جانا پڑا۔

☆......☆

ہمیں دیکھتے ہوئے سر یکدم کھِل اُٹھے تھے۔ ہم سے مُراد صرف سمیرہ ہی ہے۔

"سر آپ نے مجھے بلایا تھا۔" سمیرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"جی ہاں آپ کو ہی بلایا تھا!" پروفیسر وصی احمد خوش دلی سے بولے، سر کے کہنے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"اور سنائیے سمیرہ، اسٹڈی میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟" پروفیسر وصی احمد نے پوچھا۔

"نو سر! ایسی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے اور اگر ہوئی بھی تو آپ ہیں نا!" سمیرہ نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

میں بظاہر اپنی کتاب میں مگن تھی، مگر اُن کی ہر بات سن رہی تھی۔ آج پروفیسر وصی احمد کا انداز ہی نرالا تھا۔ وہ کافی چہک رہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں سمیرہ کہ ہماری یہ دوستی مزید آگے بڑھے۔" پروفیسر وصی احمد زیادہ دیر اپنی اصلیت چھپا نہ سکے۔ اُن کے الفاظ دوستی کہنے پر مجھے اور سمیرہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

اُس نے اچانک میری طرف دیکھا تھا، میری نظروں میں بھی حیرت تھی۔

"سر میں سمجھی نہیں؟" سمیرہ نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے ناسمجھی سے پوچھا۔

"اب آپ انجان نہ بنیں۔ آپ کا مجھے گفٹ دینا، میرے التفات پر خوش ہونا، دوستی نہیں تو اور کیا ہے؟" پروفیسر وصی احمد مزید کھُل رہے تھے۔ انہوں نے سمیرہ کے احترام اور خلوص کے رشتے کو دوستی کا رنگ کس آسانی سے دے دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں سر نے واضح کر دیا تھا کہ مرد و عورت کے درمیان احترام، خلوص، عقیدت اور دوستی سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ سر کی مزید وضاحت پر سمیرہ نے میری طرف دیکھا تھا۔ میں بھی اُس کی طرف متوجہ تھی۔ اُس کے دیکھنے پر میں نے اُسے [illegible] نگاہوں سے گھورا۔

سمیرہ کی خاموشی پر پروفیسر وصی احمد بالآخر خود ہی بول اُٹھے۔

"ارے بھئی! آپ تو سنجیدہ ہو گئیں۔ میرا مطلب ہے، آپ کسی دن میرے گھر آئیں، میرے گھر والے آپ سے مل کر خوش ہوں گے اور مجھے بھی خوشی ہوگی۔" پروفیسر صاحب آج سارے حساب بے باق کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور سمیرہ کے لیے شاید آج Surprising Day تھا...... حیرت پر حیرت۔

"مگر سر!" سمیرہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں، آپ میرے گھر آ رہی ہیں۔" پروفیسر وصی احمد بے حد اپنائیت سے بولتے چلے گئے۔ "دوستی میں کوئی اگر مگر نہیں ہوتا۔" وہ پھر مسکرائے، مجھے اُن کے بار بار دوستی کہنے پر سخت چڑ ہو رہی تھی، مگر میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور سر بھی سمیرہ کی طرف ہی متوجہ تھے، ایسے جیسے کہ روم میں صرف وہ دونوں ہوں۔ میں بھی خاموشی سے آج سر کی تمام حقیقت جاننا چاہ رہی تھی۔

"سر آپ کو پروفیسر عبداللہ بلا رہے ہیں۔"

چپراسی نے اچانک روم میں آ کر ہماری باتوں کے تسلسل کو توڑ دیا تھا۔

پروفیسر وصی احمد فوراً یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ......

"آپ بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔" پروفیسر صاحب نہایت عجلت میں روم سے نکل گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے سمیرہ کو دیکھا جو خاموش بیٹھی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے اُس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی چپ ہوں۔" سمیرا غائب دماغی سے بولی۔

میں اٹھ کر اُس کے پاس آ گئی۔ ٹیبل پر کچھ اسائنمنٹس پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اٹھائی، پہلی اسائنمنٹ غزل صدیقی کی تھی۔ وہ ہم سے سینئرز تھی۔ بہت لائق اسٹوڈنٹ تھی۔ میں نے دیکھنے کے لیے کھولی تو اسائنمنٹ کے درمیان میں سے گلابی رنگ کا لفافہ میز پر گرا۔ میں نے سمیرہ کی طرف دیکھا تو وہ اس طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے وہ لفافہ جلدی سے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ تھی تو غیر اخلاقی حرکت مگر ایک انجانے احساس کے تحت میں نے وہ لفافہ اپنے پاس رکھ لیا۔

"چلو اب چلتے ہیں۔ ٹائم ہے سر توصیف کا۔" میں نے سمیرہ کو مخاطب کیا۔

☆......☆

چھٹی کے بعد گھر آ کر وہ لفافہ میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔

رات میں جب فارغ ہوئی تو مجھے وہ لفافہ یاد آیا، جلدی سے بیگ میں سے وہ لفافہ نکالا اور پڑھنے لگی۔

☆......☆

اُس کے نام جو زندگی سے بڑھ کر عزیز ہے

سر آپ میرے فون کا جواب نہیں دیتے۔ ملنے آتی ہوں تو اگنور کرتے ہیں۔ جانتی ہوں آج کل آپ کی توجہ کا مرکز کوئی اور ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ گھر والے مسلسل شادی پر اصرار کر رہے ہیں اور انکار کی وجہ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم کورٹ میرج کے حوالے سے اپنے گھر والوں کو منالیں گے۔ آپ کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے میں کسی دوسرے کے لیے کیسے ہاں کر سکتی ہوں سر؟ میں بہت پریشان ہوں، پلیز میری کال ریسیو کر لیں اور میرے خط کا جواب دے دیں، ورنہ میں پریشانی میں کہیں خودکشی نہ کر لوں......

بے حد مجبور

غزل صدیقی

☆......☆

خط پڑھ کر میں اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھی۔ پروفیسر وصی احمد کا یہ روپ ہوگا میں نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی ایک اسٹوڈنٹ سے محبت کی اور اس سے خفیہ طور پر نکاح کیا اور اب اس کی پریشانیوں میں اکیلا چھوڑ دیا ہے اور سمیرہ کو اپنا اگلا شکار بنانا چاہتا تھا۔ یہ تو بس جیسے مقدس شعبے سے کس طرح کے لوگ وابستہ ہو گئے تھے، جو روحانی باپ کا کردار نبھانے کی بجائے دل پھینک عاشق مزاج کا کردار نبھا رہے تھے۔ میں سوچتی ہوں کہ ہماری عقیدت اور محبت کو بعض اوقات کیا غلط رنگ دے دیا جاتا ہے۔

اپنے سے آدھی عمر کی لڑکیوں سے عشق لڑانا اور پھر خفیہ طور پر کورٹ میرج کرنا یہ کیا تھا سب۔ مجھے تو سر پہلے ہی چبھتے تھے، اب مزید غصہ آ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سمیرہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے خط اس کے سامنے رکھا۔

"اسے کھولو اور پڑھو!" میں سنجیدگی سے بولی۔

"مگر اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ تم اتنا سسپنس کیوں پھیلا رہی ہو؟"

سمیرہ نے پوچھا۔

"پڑھو گی تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟" سمیرہ نے پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا۔

"یہ آپ کے بہت ہی پیارے اور عظیم استاد محترم پروفیسر وصی احمد کی اصلیت ہے۔" میں ایک ایک لفظ

چبا کر بولی۔

"حنا پلیز کھل کر بات کرو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

سمیرہ نے اُکتا کر کہا۔

"وہ لڑکی یعنی غزل صدیقی جو سر کے روم میں رو رہی تھی وہ سر کی منکوحہ ہے۔ اور اب سر اُس سے جان چھڑانا چاہ رہے ہیں، کیوں کہ وہ خود کو رلیجا اندر مجبور ہے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اسی لیے آج کل آپ سے دوستی نبھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" میں جوش میں بولتی چلی گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سر ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ سر کو اپنا روحانی باپ سمجھا ہے اور اسی لیے اُن کی عزت کرتی ہوں، مگر یہ سب؟" سمیرہ نے پریشانی سے سر جھکا لیا۔

"میں جانتی ہوں تم سادہ دل ہو۔ تمہارا دل صاف ہے، مگر سمیرہ ضروری تو نہیں جو تم سوچ رہی ہو، وہی سر بھی سوچیں۔ سر تو تمہیں صرف ایک مرد کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بس..... اسی لیے میں تمہیں منع کرتی تھی، ان کے قریب جانے سے روکتی تھی کہ بعض اوقات ضروری نہیں ہے، جو نظر دیکھے وہی سچ ہو اور کسی پہ اتنا بھی اعتبار اچھا نہیں ہوتا۔"

سمیرہ خاموش بیٹھی تھی، مگر اُس کی آنکھوں کی نمی بتا رہی تھی کہ وہ بے حد دُکھی ہے۔

"سمیرہ، دل چھوٹا مت کرو۔ یہ زندگی ہے، یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ شکر کرو تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔" میں نے وہ خط واپس سر کی میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔

☆......☆

اگلے دن یونیورسٹی میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ غزل صدیقی نے خودکشی کر لی ہے۔ اس خبر کو جو سن رہا تھا حیران تھا۔ یونیورسٹی کی قابل ترین اور خوب صورت اسٹوڈنٹ تھی وہ۔

اگرچہ میں اور سمیرہ وجہ جانتے تھے، مگر ہم دونوں خاموش تھے۔ ایک بے گناہ لڑکی کی موت سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اب رہ بھی کیا گیا تھا جو ہم یونیورسٹی میں اُس کی رسوائی کرتے۔

☆......☆

چند دنوں کی بات تھی اور پھر غزل صدیقی بھی قصۂ پارینہ ہو گئی تھی۔ پروفیسر وصی احمد پھر سے گاہے بگاہے سمیرہ کو طلب کر رہے تھے۔ بلاوجہ کوئی نہ کوئی جملہ اُچھال دیتے، مگر اب میں مطمئن تھی، کیوں کہ اب مجھے اُسے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

"سمیرہ، آپ ذرا میرے روم میں آئیں!"

پروفیسر وصی احمد کی آواز ہمارے قریب سے اُبھری۔

"سوری سر! مجھے آج گھر جلدی جانا ہے، ضروری کام ہے!"

سمیرہ نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔

جواباً سر وصی احمد کی آنکھوں میں حیرت اُبھری تھی، جسے دیکھ کر میں دل ہی دل میں بے حد ہنسی تھی اور یوں چند دنوں اگنور کرنے کی وجہ سے پروفیسر وصی احمد نے سمیرہ کو طلب کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، شاید وہ سمیرہ سے مایوس ہو گئے تھے، شکر جہاں پاک!

☆......☆

یونیورسٹی آتے ہی سمیرہ میرے گلے لگ گئی تھی۔

"ارے بھئی کیا ہوا؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"بس یونہی تم پر پیار آ رہا تھا۔" سمیرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حنا تم بہت اچھی ہو، مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔" سمیرہ نے نم آنکھوں سے کہا۔

"نجانے نادانی میں مجھ سے کچھ غلط ہو جاتا!" سمیرہ نے اندیشوں میں گھرتے ہوئے کہا۔

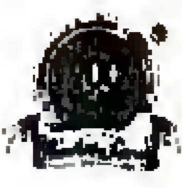
"یہ سب اللہ کا کرم ہے۔" میں نے محبت سے کہا۔

زندگی کی اس تصویر نے مجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی وابستگی دوسرے کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی ہے۔

بالکل صحیح کہا، کیوں کہ صرف ظاہر دیکھ کر باطن کا اندازہ لگانا مشکل ہے، بعض اوقات چہرہ پُرنور اور دل گناہوں سے سیاہ ہوتا ہے۔ اُس دن اگر وہ خط نہ ملتا تو پروفیسر وصی احمد نے تمہیں جال میں پھنسا ہی لینا تھا۔

اور میں سمیرہ کی حفاظت پر دل ہی دل میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کر رہی تھی۔ خدا ہم سب کو آفات و مصائب سے بچائے۔ (آمین)

☆......☆



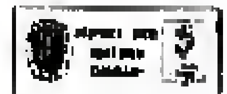






Mohammad Hashim Tajir Surma





بٹوارا

اسلم قریشی

دل کی طرح عورت کا بٹوارا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے دوسرا شعلہ

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی تنہائی اور مایوسی کی وہ شدت یکدم ختم ہو گئی تھی جس سے میں گزشتہ پانچ دنوں سے دوچار تھا۔ آگ و خون کا دریا عبور کرتے اور اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ بارڈر عبور کرتے ہی میں سجدے میں گر گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ میری کل جمع پونجی سیاہ رنگ کے بیگ میں رقم کی صورت میں موجود تھی۔ حالا [illegible] ہی نہ ان نے جلد [illegible] کو عجلت کی حالت میں فراغت کر دیا تھا۔ جس کی مجھے مناسب رقم نہیں مل سکی تھی۔ لیکن بہرحال کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہت بہتر تھا۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے سیاہ بیگ میں موجود رقم میرے لیے کافی زیادہ تھی۔ [illegible] زیادہ بہتر ہوگا کہ مجھے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے لیے زیادہ قربانیاں نہیں دینی پڑیں۔ اس لحاظ سے میں بہت خوش نصیب واقع ہوا تھا۔ پاکستان کا بارڈر لٹے پٹے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ پاکستانی فوج کے جوان ان کی مدد کے لیے کمربستہ تھے۔ بارڈر سے کچھ دور بے سروسامانی کی صورت میں وارد ہونے والے افراد کے لیے کیمپ کا بندوبست بھی تھا۔ میں نے کیمپ کا رخ نہیں کیا۔ بارڈر کے قریب ہی واقع گاؤں میں میرے بچپن کا دوست جاں نثار رہائش پذیر تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھا ہوا انسان تھا۔ ہم نے میٹرک ایک ہی اسکول سے پاس کیا تھا۔ اس نے میٹرک کے بعد پڑھائی وغیرہ کو خیرباد کہہ دیا تھا جبکہ میں نے آگے پڑھنے کے بجائے والد صاحب [illegible] نے ادبی قبول کر لی تھی۔ پہلے [illegible] بھی ختم ہوتا چلا گیا تھا۔ [illegible] جاری رکھی [illegible] میرے [illegible] لئے ان سے [illegible] تک پہنچنے میں کچھ خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ گھروں پر مشتمل اس کا گاؤں [illegible] چند گاؤں کے درمیان واقع تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر [illegible] اور مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر کچھ دیر تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، پھر چلاتے ہوئے وہ میرے ساتھ لپٹ گیا۔ خاصی دیر ہم ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔ پھر میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ محویت کے عالم میں...... میری آپ بیتی سنتا رہا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر کے اندر [illegible] میں لے آیا۔ جاں نثار کے دونوں بچے اور بیوی ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ بھابی نے میرے لیے چائے بنائی اور جاں نثار مجھے گھر کے قریب واقع ان کے



مکانوں کی تفصیل بتانے لگا، جو پاکستان گورنمنٹ کی جانب سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے لیے آسان اقساط کی صورت میں منتقل کیے گئے تھے۔ لیکن چونکہ ابھی تک زیادہ تر مکانات زیر تعمیر تھے۔ اس لیے مکانات کی تقسیم نہیں کی گئی تھی۔ وہ تو جاں نثار جیسے مخلص لوگ ہجرت کر کے آنے والے بے آسرا لوگوں کو تنبو تان کر جہاں بسا رہے تھے ورنہ حکومت کی جانب سے پیش رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی رقم کی فراہمی کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر میرے حوالے کر دیا گیا۔ گھر کی منتقلی کے دوران میں نے کچھ دنوں کے لیے جاں نثار کے گھر بھی قیام کیا تھا۔ گھر کی منتقلی کے فوراً بعد میں بے سروسامانی کے عالم میں وہاں منتقل ہو گیا۔ جب رہائش کا مسئلہ حل ہوا تو روزگار کی جانب سے بھی سوچنا شروع کیا۔ میرا حاصل کردہ مکان ایڈوانس رقم کی فراہمی کے بعد ماہانہ اقساط پر منتقل تھا۔ اس لیے ابھی خاصی رقم میرے پاس بچی رہ گئی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ انہی دنوں گاؤں سے تھوڑی دور چند ایکڑ زمین فروخت ہو رہی تھی۔ میں نے جاں نثار اور بھائی سے صلاح مشورے کے بعد زمین خرید لی اور اپنے آبائی پیشے کھیتی باڑی کا آغاز کر دیا۔ خدا نے پیشے میں برکت ڈالی اور خوشحالی میرے قدموں کو چومنے لگی۔ اب میں اصل

واقعے کا آغاز کرتا ہوں۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ کھیتوں پر کام کرنے کے بعد جب میں تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو گھر سے باہر میں نے جاں نثار کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات تھے۔ اور وہ کچھ پُرجوش بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گھوڑا گاڑی میرے گھر کے سامنے لگے شہتوت کے درخت کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ جاں نثار تانگہ چلاتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی مانند میری جانب کھنچا چلا آیا اور پھر بولا۔

"فوراً سے پیشتر تانگے میں بیٹھو۔ تمہاری بھابی گھر میں شدت سے تمہاری آمد کی منتظر ہے۔ ایک بہت بڑے گمبھیر مسئلے سے دوچار ہونے کے بعد تمہاری دستیابی کے لیے میں کب سے یہاں کھڑا ہوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس نے باگیں دراز کیں اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جاں نثار کا گھر میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور بڑا بچہ دروازے کے باہر ہمارے منتظر تھے۔ مجھے معاملے کی شدت کا احساس اس کے چہرے کو دیکھ کر ہونے لگا تھا لیکن باہر بات کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں نے خاموش رہنے میں ہی بہتری جانی۔ جاں نثار نے تانگے کو گھر کے ساتھ موجود بھیڑ بکریوں کے باڑے میں باندھا اور میرے ہمراہ اندرونِ مکان کی جانب چل دیا۔ بیٹھک میں بیٹھتے ہی فوراً بعد بھابی نے میرے سامنے چائے سے بھرا ہوا کپ رکھ دیا، پھر جاں نثار کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بھیا..... یقین کریں آپ کو یہاں بلاتے ہوئے ہم دونوں کو بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ تمام دن کے تھکے ہارے گھر آئے ہوں گے، لیکن معاملہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اپنے آپ کو منع کرنے کے باوجود روک نہ پائے۔ آپ یقیناً برا نہیں منائیں گے۔"

اب میرا تجسس آخری حدوں کو تقریباً پار کر چکا تھا۔ میں نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"معاملہ کیا ہے؟ میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" بھابی نے دوبارہ جاں نثار کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ جاں نثار نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"میں بتاتا ہوں۔ آج معمول کے مطابق عصر سے کچھ پہلے جب میں گھر کی جانب آنے کے ارادے سے بڑی سڑک سے واپس آ رہا تھا تب میں نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کی چادر میں ملبوس تھی اور کسی حد تک گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ حالات کے لحاظ سے اس وقت کسی مرد کو بھی وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن وہاں ایک لڑکی تھی اور وہ بھی اکیلی..... میں نے وجہ دریافت کرنے کے لیے تانگہ روک لیا اور اس سے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تب وہ رو دینے والے لہجے میں بولی کہ وہ اغوا کاروں سے چھٹکارا حاصل کر کے بمشکل یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے آگے پیچھے موجود بھائی بہنوں اور رشتے داروں کا کچھ اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ اُسے یوں اکیلا چھوڑنا میں نے مناسب خیال نہیں کیا اور اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"رہائشی کمرے میں۔" جاں نثار نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اس کے متعلق کچھ معلومات کیں۔ اُسے بلا سوچے سمجھے گھر لے آنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"لیکن اُسے اکیلا چھوڑ دینا بھی انسانیت کے برخلاف تھا۔" جاں نثار بولا۔ "پھر میں معلومات کہاں سے کرتا۔ وہاں ارد گرد کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لڑکی شکل و صورت سے شریف اور اچھے گھرانے کی دکھائی دیتی ہے۔ اگر کہتے ہو تو میں معلومات کیے لیتا ہوں۔"

میں نے چونک کر بھابی کی جانب دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔ پھر بولیں۔

"بھیا..... کب تک یوں ہی اکیلے رہو گے۔ تمہارے بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد لڑکی کے ساتھ بیاہ کر لو..... یقین جانو..... لڑکی تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گی۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"بھابی کیسی باتیں کرتی ہو۔ بھلا ایک ایسی لڑکی سے میں کیونکر شادی کر لوں، جس کے خاندان کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم..... آپ خود بتائیے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہوگی کہ میں

سوچے سمجھے بغیر..... پوچھ گچھ کیے بغیر شادی کرلوں؟" بھابی قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں، پھر چہکتے ہوئے بولیں۔

"یعنی پوچھ گچھ کرنے کے بعد تم شادی کے لیے بخوشی رضامند ہو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے۔ ہم دونوں آج ہی سے تفتیش کا آغاز کر دیتے ہیں اور اگر اصرار کرو تب لڑکی سے تمہاری بات چیت بھی کروا دیتے ہیں۔" میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جاں نثار نے قہقہہ لگایا اور بھابی مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بھیا..... اب تم فرار نہیں ہو سکتے۔ تمہارے قدموں کو زنجیروں سے جکڑنے والی آ گئی ہے۔ بس شادی رچانے کی تیاریاں کرو۔" میں نے بوکھلا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔

لڑکی زیادہ خوبصورت نہیں تھی، لیکن کم عمر اور کم گو تھی۔ عمر بمشکل اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ چونکہ اس نے رشتے داروں کی موجودگی کے متعلق مکمل طور پر لاعلمی کا اظہار کیا تھا اس لیے گاؤں کے سرکردہ افراد کی موجودگی میں لڑکی سے کچھ سوال جواب پوچھے گئے، جن کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ کیا وہ شادی شدہ ہے؟ یا نہیں..... لڑکی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ دوسرا سوال..... نام کیا ہے؟ لڑکی نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ چاند بی بی..... مجھے اپنے جسم میں لطیف جذبات کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور میں خوبصورت مستقبل کے تانے بانے جوڑنے لگا۔ تیسرا اور آخری سوال جو پوچھا گیا۔ وہ یوں تھا۔ کیا تم اصغر علی کے ساتھ بیاہ رچانے کے لیے رضامند ہو یا نہیں..... اس نے ایک دفعہ پھر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اقرار میں سر ہلا دیا اور کمرہ مبارکباد کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ فوراً سے پیشتر شادی کی تیاریوں کا آغاز کر دیا گیا۔ تیاری میں زیادہ اہتمام یا توجہ صرف کھانے پر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سادگی کو ملحوظ نظر رکھا گیا۔ بہرکیف اسی رات چاند بی بی میری زندگی کے ہمسفر کی حیثیت سے گھر میں داخل کر دی گئی۔ اس کے ہمراہ جہیز کی صورت میں صرف ٹین کا ایک ٹرنک تھا۔ شاید اس میں چاند بی بی کے کپڑے وغیرہ تھے۔ میں نے زیادہ پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں جانا۔ اس کے علاوہ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد صرف اتنا مزید جان پایا کہ اس کے خاندان کا تعلق پٹیالہ سے تھا اور وہ بمشکل ہجرت کر کے ایک قافلے کے ہمراہ پاکستان پہنچ پائی تھی۔ مجھے اس کے خاندان سے بھلا کیا لینا دینا تھا۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔ دن تیزی کے ساتھ گزرنے لگے۔ وہ ایک اچھی رفیقہ حیات کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنے میں مگن تھی۔ نا جانے کیوں مجھے اس کے عادات و اطوار، اٹھنے بیٹھنے، پیار کرنے کے علاوہ عبادت کرنے میں بھی مصنوعی پن کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا تھا۔ شروع کے کچھ دنوں کے دوران میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ محبت کا سر چڑھ کر بولنے والا نشہ جب اترتا چلا گیا۔ تب وہ سب کچھ دکھائی دینے لگا، جو شروع کے دنوں میں محسوس نہیں کر پایا تھا۔

وہ صبح منہ اندھیرے اٹھ جاتی تھی۔ منہ میں نا جانے کیا کچھ بڑبڑاتی تھی، پھر میرے لیے ناشتا تیار کرتی تھی۔ میں ناشتا کرنے لگتا۔ تب وہ سامنے بیٹھی نا جانے کیا سوچتی رہتی۔ اس نے کبھی بھی میرے ہمراہ ناشتا نہیں کیا۔ ہمیشہ بعد میں ناشتا کرتی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں کھیتی باڑی کے اوزار سنبھالتا اور کھیتوں کا رخ کرتا۔ دوپہر کو وہ چھاچھ کی لسی اور مکئی کی روٹی کے ہمراہ اچار بھی لاتی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر بھی اس کے معمولات ویسے ہی تھے جیسے ناشتے پر..... وہ میرے ہمراہ کھانا نہیں کھاتی تھی۔ ان کچھ دنوں کے دوران میں نے مزید یہ بات بھی محسوس کی کہ وہ کم گو ہونے کے علاوہ بلاوجہ بات چیت کرنے سے بھی پرہیز کرتی تھی، پھر کچھ ہی دنوں کے دوران مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اس کی دلچسپی کا مرکز میں نہیں کوئی اور تھا، لیکن اس پر زور زبردستی نہیں کی گئی تھی۔ پنچایت کے دوران اس سے شادی کے متعلق دریافت کیا گیا تھا۔ تب اس نے اپنی مرضی سے ہاں کی تھی۔

پھر اب یہ سرد مہری کی دیوار بھلا کیوں قائم ہوتی جا رہی تھی، شاید میں اس موضوع پر اس سے بات چیت کرتا، لیکن بالکل اچانک ہی مجھے بھابی کے ذریعے معلوم ہوا کہ چاند بی بی اور میں ماں باپ بننے والے تھے۔ اس معاملے میں بھی چاند بی بی نے بے اعتنائی برتی تھی۔ مجھے خبر نہیں ہونے دی تھی۔ حالانکہ وہ ایک مہینے کے حمل سے تھی۔ میں اس دن بہت خوش ہوا۔ ان تمام اختلافات کے باوجود میں چاند بی بی سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگا تھا۔ اب بچے کی خوشخبری کے بعد اس کی قدر و منزلت میری نگاہوں میں مزید بڑھ گئی تھی اور

میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا تھا۔ بچے کی ولادت تک حالات معمول کے مطابق رہے، لیکن ولادت کے بعد کروٹ بدلنے لگے۔

ہمارے ہاں لڑکی ہوئی۔ میں نے اس کا نام مہتاب رکھا تھا۔ چاندنی بی نے اب بھی توجہ دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ میں نے بھی تنقید کرنا بہتر نہیں جانا۔ یہ گرمیوں کی تپتی دوپہر کا واقعہ ہے۔ میرے سر میں صبح سے ہی ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب درد نے شدت اختیار کیا، تو میں نے گھر جانا مناسب خیال کیا اور کام ادھورا چھوڑ کر گھر کی جانب چل دیا۔ گھر پہنچ کر جو منظر میں نے دیکھا وہ... گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور وہاں میری نومولود لڑکی کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے اُسے گود میں اٹھایا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی، لیکن مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ لڑکی بھوک سے بلک رہی تھی۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ چاندنی بی گھر کو یوں کھلا چھوڑ کر باہر چلی گئی ہو۔ یا شاید ایسا پہلے بھی ہوا ہو۔ میں آج سے پہلے کبھی بھی شام سے پہلے گھر واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے چاندنی بی پر غصہ آنے لگا اور کچھ عرصے سے دل میں دبی چنگاری نے دوبارہ دھواں اُگلنا شروع کر دیا۔ میں ایک دفعہ پھر سوچنے لگا۔ یقیناً اس کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ حد تو یہ کہ اب کی دفعہ اُس نے معصوم سی بچی کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں پتا لگا کر چھوڑوں گا کہ وہ کس سے ملنے جاتی ہے۔ وہ ایک بجے کے قریب واپس آئی۔ میری غیر متوقع آمد پر وہ یکدم ہراساں ہو گئی، لیکن پھر کمالِ ڈھٹائی کے ساتھ بولی۔

"میں آپ کے لیے کی لینے جاں نثار بھائی کے گھر گئی تھی۔ وہاں بھابی نے روک لیا۔ اس لیے زیادہ دیر ہو گئی، لیکن آپ جلدی گھر واپس کیسے آ گئے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا...؟"

میرا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھتا چلا گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں لسی سے لبریز مٹی کا برتن موجود تھا۔ مجھے اپنی سابقہ سوچ پر ندامت محسوس ہوئی اور میں اُسے طبیعت کی ناسازی کے متعلق بتانے لگا۔ اُس نے فوراً لسی کا پیالہ زمین پر رکھا اور چادر لپیٹ کر مکان کے دروازے کی جانب چل دی۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟ مہتاب بھوک سے بلک رہی ہے؟"

"سامنے پرچون کی دکان سے ڈسپرین کی گولی لاتی ہوں۔ دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" وہ جواب سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میری گود میں موجود نومولود مہتاب بھوک کو برداشت کرتے کرتے سو گئی تھی۔ میں نے اُسے چارپائی پر لٹایا۔ تب اچانک ہی میری نگاہ چارپائی کے ساتھ رکھے ٹین کے صندوق کے اوپر رکھی کاسنی رنگ کی گٹھڑی پر پڑی۔ وہ گٹھڑی اور اس پر موجود کپڑا میرے لیے یکسر اجنبی تھا۔ میں نے تجسس سے مغلوب ہو کر گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پھرتی کے ساتھ اُسے کھولنے لگا۔ اس کے اندر کچھ مردانہ کپڑے، ایک عدد چھری کی جوڑی، سیندور کی ڈبیا اور منگل سوتر موجود تھا۔ مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ گٹھڑی میں موجود تمام سامان ہندو رسم و رواج کی عکاسی کرتا تھا، لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ ان چیزوں کا ہمارے گھر میں بھلا کیا کام؟ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی، پھر چاندنی بی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ڈسپرین کی گولی موجود تھی اور آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات کے علاوہ خوف بھی موجود تھا۔ میں نے گٹھڑی کو دوبارہ ٹرنک پر رکھ دیا، پھر طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"چندا یہ کیا ہے؟ ہندوؤں کا ساز و سامان... ہمارے گھر میں ان کا کیا کام؟" وہ ہڑبڑا کر بولی۔

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہوں۔ صبح چشمے پر پانی بھرنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے چشمے کے قریب یہ گٹھڑی پڑی ملی، سو میں اٹھا کر یہاں لے آئی۔ اسے کھول کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

"اسے گھر سے دور کہیں چھوڑ آؤ اور دیکھو لڑکی کو بھوک لگی ہوئی ہے اُسے دودھ پلا دینا۔ میں ڈسپرین کی گولی کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا، پھر کھیتوں میں جاؤں گا۔" چاندنی بی نے اثبات میں سر ہلایا اور پانی لانے کے لیے باورچی خانے کی جانب چل دی۔

ایک ہفتہ پُرامن گزر گیا۔ ان کچھ دنوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ چاندنی بی کے طور و اطوار میں نمایاں

تبدیلی کا آغاز ہوا۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھنے لگی اور مجھ سے محبت بھی زیادہ کرنے لگی۔ وہ احساسات جن سے کچھ دن پہلے میں دوچار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے لیکن پھر ایک دن ایسا حادثہ پیش آیا جس نے مجھے دوبارہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ مجھے کھیتوں کی زمین کی زرخیزی کے لیے کھاد کی بوریاں درکار تھیں۔ شہر میں کھاد کی قلت کی بدولت بوریوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن بارڈر پار سے کھاد نہایت ارزاں قیمت پر اسمگل ہو کر پاکستان آ رہی تھی۔ میں نے دوپہر کو کام جلدی جلدی نپٹایا اور بارڈر کی جانب چل دیا جو کہ ہمارے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بمشکل پونے گھنٹے کا راستہ تھا۔ جاں نثار میرے ہمراہ تھا۔ ہم بات چیت کرتے ہوئے بارڈر کی جانب رواں دواں تھے۔ سہ پہر کے قریباً چار بجنے والے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نگاہ سڑک سے کچھ ہٹ کر پہاڑی علاقے کے پاس گھنے درختوں کے جھنڈ کی جانب جاتی ایک عورت پر پڑی۔ وہ سرخ رنگ کے کپڑوں اور سیاہ رنگ کی چادر میں ملبوس تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کاسنی رنگ کی گٹھڑی موجود تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی بدولت چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔ اس کے ہاتھوں میں کاسنی رنگ کی گٹھڑی میرے اندازے کے مطابق وہی تھی، جسے کچھ دن پہلے میں اپنے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا گذشتہ ہفتے کے بعد میں نے چاندنی بی بی کو کپڑوں کے ذخیرے میں سے سرخ جوڑا نکالتے ہوئے بخوبی دیکھا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ باہر جانے کے لیے سیاہ چادر پہنتی تھی۔ میری کاروباری سرگرمیاں کچھ اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ مجھے گھریلو معاملات میں دلچسپی لینے کا موقع کم ہی ملتا تھا لیکن کچھ باتیں ہمیشہ کے لیے لاشعور میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کاسنی گٹھڑی بھی تھی۔ عورت کا رخ درختوں کے جھنڈ کی جانب تھا اور وہ کچھ عجلت میں ہونے کے علاوہ گھبرائی ہوئی بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے جاں نثار کو تانگہ روکنے کے لیے کہا۔ اس نے حیرت بھری نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے باگیں کھینچ دیں، پھر بولا۔

”خیریت تو ہے، مجھے تمہارے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔“ میں جواب دیے بغیر تانگے سے نیچے اتر گیا، پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس وقت کچھ بتانا ممکن نہیں ہے۔ میں رات کو تم سے ملنے کے لیے گھر آؤں گا۔ معاملہ کچھ گمبھیر ہے۔ تم میرا انتظار کرنا۔“

میں اس کا جواب سنے بغیر درختوں کے جھنڈ کی جانب چل دیا۔ جس کی طرف میں نے عورت کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سڑک کچھ اونچائی پر تھی۔ وہاں سے نیچے کھیتوں کا سلسلہ موجود تھا، پھر کھیتوں کے بعد بنجر زمین، اس کے بعد درختوں کا وسیع و عریض سلسلہ...... وہاں آبادی نا ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے ارد گرد ہو کا عالم تھا۔ مجھے جھنڈ تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے۔ جھنڈ کے قریب پہنچ کر میں نے رفتار آہستہ کی اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہاں زمین زرخیز تھی اور گھاس کے قطعات بھی موجود تھے۔ جن کی بدولت قدموں کی آہٹ سن لیے جانے کا خدشہ بھی دور ہونے لگا تھا۔ جھنڈ کے وسیع و عریض قطعہ زمین پر جا بجا خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ موجود تھے۔ ایسے ہی ایک جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا اور کان آواز کی جانب لگا دیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مدھو تی...... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہوں لیکن اتنی جلدی تمہیں بارڈر کے پار لے جانا ممکن نہیں ہے۔ ابھی ہمیں مزید کچھ وقت لگے گا۔ میرا اکیلے یہاں آنا ہی بہت زیادہ دشوار ہے لیکن کسی جوان لڑکی کے ہمراہ واپس جانا ممکن نہیں ہے۔ بارڈر کے حالات دن بدن خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قسم کا رسک لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ کچھ دن اور انتظار کر لینا ہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔“ عورت کی آواز سنائی دی۔

”میرے خیال میں مزید انتظار کرنا ہم دونوں کے حق میں مناسب نہیں ہوگا۔“ مجھے اپنے سر پر بجلی گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ آواز بلاشبہ چاندنی بی عرف مدھو تی کی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

”میرے شوہر کو کسی وقت بھی تمہارے وجود کے

متعلق آگاہی ہوسکتی ہے۔ تم یقین جانو...... کہ وہ شک و شبے کے گرداب میں پھنس چکا ہے۔ اُسے صرف ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا تم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔"

میں نے احتیاط کے ساتھ جھاڑیوں کے جھنڈ کے دوسری جانب جھانکا۔ وہ دونوں جھنڈ کے دوسری جانب گھنے درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے میری جانب تھے۔ وہ حویلی یا پھر میری چندا ہاتھوں میں کاسنی گھڑی تھامے کھڑی تھی۔ اُس کا الٹا ہاتھ سامنے کھڑے لڑکے کے ہاتھوں میں تھا۔ اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لیے میں نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب جانا۔ سڑک پر جاں نثار موجود نہیں تھا۔ میں پیدل گاؤں کی جانب چل دیا۔ میرا دماغ تیز و تند آندھیوں کی لپیٹ میں تھا۔ مجھے اپنی بے وقوفانہ فطرت پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایسی لڑکی پر اعتبار کیا، جس کے متعلق میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھی؟ اور کہاں سے آئی تھی؟ اس کا شادی کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ اس کی پُراسرار شخصیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہمسایہ ملک کی ایجنٹ ہو۔ بہر کیف، میں گاؤں کیسے پہنچا مجھے کچھ معلوم نہیں، لیکن میں نے گھر جانے کے بجائے جاں نثار کے گھر کا رُخ کیا۔ اُس کا تانگہ جانوروں کے باڑے کے قریب بندھا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ بھابی نے کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چہکتے ہوئے بولیں۔

"بھیا...... آج تم راستہ بھول کر اپنے گھر جانے کے بجائے ہمارے گھر بھلا کیوں چلے آئے۔ خیریت تو ہے نا؟"

"بھابی خیریت نہیں ہے۔ مجھے جاں نثار سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟" بھابی نے میرے چہرے پر پریشانی کی دبیز تہ کو فوراً محسوس کر لیا۔ اور کوئی بات کیے بغیر مجھے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جاں نثار بیٹھک میں موجود عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ ایک جانب دری پر رکھے تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بھابی چائے بنانے کے لیے کچن کی جانب چلی گئیں۔ جاں نثار نے سلام پھیرا پھر دعا مانگنے کے بعد مصلا اُٹھاتے ہوئے میری جانب دیکھا اور بولا۔

"کبھی کبھی مجھے تمہاری شخصیت کے متعلق شک سا ہوتا ہے۔ پتا نہیں تم ذہنی طور پر صحت مند ہو بھی...... یا نہیں۔"

"آج تو کچھ ایسا ہی شک مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔" میں ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

"تم یقین نہیں جانو گے کہ میں آج کتنا پریشان ہوں۔ میری بیوی گھر پر موجود نہیں ہے اور تو مولود لڑکی گھر میں تنہا پڑی بھوک کی شدت سے بلک رہی ہے اور میں عنقریب خودکشی کرنے کے متعلق بھی سوچ رہا ہوں۔" جاں نثار نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا، پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔

"خیریت تو ہے...... بھابی کہاں ہے؟ اور مہتاب گھر میں اکیلی کیوں ہے۔" میری آنکھوں کے آگے موجود وہ بند جسے میں نا جانے اب تک کیسے قائم رکھے ہوئے تھا، اچانک ہی مٹی کا ڈھیر بنتا چلا گیا اور آنسوؤں کا سیلاب اُمڈتا چلا آیا۔ جاں نثار نے گھبرائے ہوئے چہرے کے ساتھ میری جانب دیکھا، پھر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟ معاملہ کیا ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔" میں نے آنسوؤں کو پونچھا اور ہچکیاں لیتے ہوئے اُسے سب کچھ بتانے لگا۔ اسی اثنا میں بھابی بھی چائے کے ہمراہ کمرے میں آ چکی تھیں۔ میں نے اُن سے بھی معاملے کو پوشیدہ رکھنا مناسب نہیں جانا اور سب کچھ لفظ بہ لفظ دونوں کو بتا دیا۔ جاں نثار اور بھابی کا یہ عالم تھا کہ انہیں ہاتھوں میں چبھتی ہوئی سوئی کی تکلیف بھی اُس سے محسوس نہیں ہو پائی۔ اُن دونوں کی آنکھیں حیرت کی شدت سے قریباً پھٹنے کے قریب تھیں۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھابی بولیں۔

"تمہاری باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا، لیکن اگر تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آئے ہو تب یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ حالانکہ چاندنی بی کو میں اس کچھ عرصے کے دوران اچھی طرح جان چکی ہوں اور میرے اندازے

کے مطابق وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، لیکن آج کل کے مردوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھی ذہنیت کی لڑکیوں کو ورغلانے کے گُروں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں، لیکن بھیا تم بغیر سوچے سمجھے اور ہم سے صلاح و مشورے کے بغیر کوئی بھی انتہائی قدم اُٹھانے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے کہ مل بیٹھ کر افہام و تفہیم کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور تنکھیوں نگاہوں سے جاں نثار کی جانب دیکھنے لگا۔ جاں نثار طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"کیا وہ اِس وقت تک گھر واپس آ گئی ہوگی۔ میرے خیال کے مطابق معاملہ سامنے ہونے کے باوجود ابھی تک کھل نہیں پایا۔ ہم تینوں اندر کی بہت سی باتوں سے بے خبر ہیں۔ اِن باتوں سے پردہ اُسی صورت میں ہٹ سکتا ہے۔ جب کھل کر بات چیت کا آغاز کیا جا سکے۔"

"میرے اندازے کے مطابق اب تک اُسے واپس آ ہی جانا چاہیے۔ مہتاب گھر میں اکیلی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے کچھ پہلے گھر کا رُخ کرے۔ اُسے مہتاب کی رتی بھر بھی پروا نہیں ہے۔ جاں نثار کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

"پھر تمہارے گھر چلتے ہیں، تاکہ وہاں چاند بی بی سے آمنے سامنے بات چیت ہو سکے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُن دونوں کے ہمراہ گھر کی جانب چل دیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا، لیکن دروازے پر تالا موجود نہیں تھا صرف باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ میں نے کنڈی کھولی اور صحن میں داخل ہو گیا۔ سامنے موجود باتھی کمرا بچی کے رونے کی آواز سے گونج رہا تھا۔ وہ یقیناً مچھلی والی کی طرح بھوک سے بلک رہی تھی۔ بھابی نے بھاگ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور عجلت میں لڑکی کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا، پھر غصیلے لہجے میں بولیں۔

"ورندگی کی انتہا ہے۔ کوئی ماں ایسے اپنی بچی کو بھوک سے بلکتا چھوڑ کر گھر سے باہر جا سکتی ہے۔ میں تو سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

"وہ ماں نہیں، ایک ہندو لڑکی ہے۔ میرے ساتھ

شادی اُسے مجبوراً کرنی پڑی اور شادی کے بعد ماں بننا ایک فطری عمل ہے۔ جس میں شاید اُس کی رضامندی بھی شامل نہ رہی ہو، لیکن میرے سب دوستانہ عمل دخل کی بھی انتہا ہے۔" جاں نثار نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا، پھر بولا۔

"میں تمہارے احساسات کے متعلق اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن اب بھی یہی کہوں گا کہ بات کھلنے تک اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہو سکتا ہے۔ معاملہ وہ نہ ہو جو دکھائی دے رہا ہے۔" میں غصیلے لہجے میں بولا۔

"معاملہ وہی ہے جو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ بھوک سے بلکتی لڑکی تمہارے سامنے موجود ہے۔ اگر مزید جانکاری کرنا چاہتے ہو تب میں تمہیں وہ جگہ بتائے دیتا ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے محبت کا ڈرامہ دیکھ کر آ سکتے ہو۔ وہ یقیناً درختوں کے جھنڈ کے درمیان اپنے محبوب کے ہمراہ موجود ہوگی۔" جاں نثار نے کمرے میں موجود جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

"غصہ حرام ہے، اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ سزا دینے والی ذات خدا کی ہے۔ تم معاملے کو خدا پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔" اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ صحن میں قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ وہ سرخ کپڑوں اور سیاہ رنگ کی چادر میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں کانچ کی تھری بھی موجود تھی۔ ہم تینوں پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا چلا گیا اور قدم جہاں تھے...... وہیں رُک گئے۔ وہ پتھر کی مورتی بنی ایک ٹک میری جانب دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ہاتھوں میں موجود پانی کا گلاس حلق میں انڈیلا، پھر جاں نثار کی جانب دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔

"اب تم خود معاملے کی تحقیق کر سکتے ہو۔ میں اپنے غصے پر کنٹرول کر چکا ہوں۔" جاں نثار نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا، پھر نرم گرم لہجے میں بولا۔

"بات چیت اگر بیٹھ کر ہو جائے تب زیادہ بہتر ہوگا۔ مہتاب سو گئی ہے۔ اِسے بستر پر لٹا دو۔" اِس دفعہ

اُس نے بھابی سے مخاطب ہو کر کہا اور بھابی نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا۔ چارپائی کے ساتھ دری پر تکیے رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنا لی گئی اور ہم چاروں دری پر بیٹھ گئے۔ چاند بی بی کے چہرے پر موجود گھبراہٹ عزم و استقلال کی صورت اختیار کر چکی تھی اور اب وہ کسی حد تک مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ جیسے بہت سے فیصلوں پر غور و خوض کرنے کے بعد اب وہ حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ کمرے میں کچھ وقت کے لیے خاموشی طاری ہوتی چلی گئی، پھر جاں نثار گلے کو کھنکھارتے ہوئے بولا۔

"بھابی...... معاملہ کچھ گمبھیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ آپ کے شوہر کے دماغ میں بہت سے وسوسے اور گلے شکوے ایسے موجود ہیں، جنہیں اگر ابھی دور نہیں کیا گیا تو آپ کی گھریلو زندگی تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ گھریلو زندگی کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرنے والی دو چیزوں میں سے ایک کا نام اعتبار کا رشتہ ہے، جو آپ دونوں کے درمیان متزلزل ہے۔ اور دوسرے نمبر پر پیار و محبت ہے، جو اعتماد کے رشتے سے ہی پروان چڑھتا ہے۔ معاف کرنا بھابی...... لیکن آپ اپنا اعتبار گنوا چکی ہیں۔ اب اگر محبت کے رشتے کو قائم رکھنا چاہتی ہیں تو اعتبار کو دوبارہ بحال کرنا ہوگا۔"

"میں بھی یہی...... " چاند بی بی نے کمال معصومیت کے ساتھ پوچھا۔ جاں نثار نے طویل سانس لی پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"کالی رنگت کی اس بچی کا کیا راز ہے؟" میری معلومات کے مطابق امیر علی نے آپ کو اسے پھینک دینے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے حکم کی خلاف ورزی بھلا کیوں کی؟" چاند بی بی نے نظر جھکا لیں، پھر کمزور لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں اب مزید کچھ چھپانا بہتر نہیں ہوگا۔ میں سب کچھ لفظ بہ لفظ بتائے دیتی ہوں، ورنہ غلط فہمیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔"

"میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔" جاں نثار بولا۔ "سب کچھ سچ سچ بتا دیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یقیناً بے قصور ہوں گی۔" چاند بی بی نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

اور اداسی کا ایسا عالم ان میں پوشیدہ تھا۔ جس نے مجھے ایک دفعہ پھر اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ بکھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"قصور تو میرا اپنا ہی ہے۔ بہت سے ایسے فیصلوں کی سزا مجھے بھگتنا پڑ رہی ہے، جو سراسر نافہمی پر مبنی تھے۔ میں شروع سے اپنی کہانی سناتی ہوں۔

میرا نام مدھو ہے اور میرا تعلق ایک ہندو گھرانے سے ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی یک دم آزادی نے جہاں مسلمانوں کو پریشان کر دیا۔ وہاں ہندو بھی صدمے کا شکار ہوئے۔ میرا گاؤں یہاں سے کچھ دور شاد اب نگر کے قریب واقع ہے۔ آزادی کے بعد جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارا گاؤں پاکستان کی سرزمین میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تب ہمارے خاندان والوں کو شدید دھچکا لگا اور انہوں نے عجلت میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ فائدہ کچھ نہیں ہوا لیکن گھبراہٹ میں ہم سب بکھرتے چلے گئے۔ میں یکدم لوگوں کے ہجوم میں اکیلی ہو گئی۔ گھبراہٹ کے عالم میں بازار کا رخ کیا۔ تب جاں نثار بھائی سے ملاقات ہوئی۔ اگر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتی تب جان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو حالات کے تیز دھارے کے سپرد کر دیا۔ آپ میں سے کسی نے بھی میرے دین دھرم کے متعلق پوچھنے کی کوشش نہیں کی اور مجھے اپنے گھر لے آئے۔ حالات کے دھارے پر اپنے آپ کو چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے بالکل ہی حالات سے پردہ پوشی کر لی تھی۔ میرا دماغ وقتی طور پر ماؤف ہو گیا تھا لیکن آنکھیں کھلی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ایسے گھر میں موجود تھی۔ جس کے مکینوں کا مذہب مخالف تھا۔ اگر میرا پول کھل جاتا تب شاید میں یہاں سے زیادہ باہر نہ جا سکتی۔ اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لیے مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر شادی کی حامی بھر لی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں پہلے سے شادی شدہ تھی۔"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی، لیکن مجھے کمرے میں زلزلے کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے جسم میں سے جان نکلتی چلی جا رہی تھی۔ میری بیوی نا صرف ہندو تھی، بلکہ پہلے سے شادی شدہ بھی

تھی اور مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں یکسر لاعلم تھا۔ یقیناً اس وقت جو کیفیت میری تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے جاں نثار اور بھابی بھی دوچار تھے۔ اُن کے منہ ہونقوں کی مانند کھلے تھے اور آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیل کر کانوں تک پہنچنے والی تھیں۔ چاند بی بی یا پھر مدھوتی دوبارہ ہمکلام ہوئی۔

"شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے اپنے گھر والوں کا بہت انتظار کیا، لیکن اُن میں سے کوئی نہیں آیا۔ شادی کے بعد میں راہ تکتی رہی۔ بارڈر پر حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ ایسے عالم میں ناجانے کیسے اور کیوں میرا سابقہ شوہر رامو بارڈر عبور کر کے مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک چلا آیا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ گلے شکوے ہوئے، الجھن طعن ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اُس سے کچھ بھی چھپائے بغیر سب کچھ بتا دیا۔ وہ طیش میں آ گیا۔ مجھے مارا پیٹا بھی..... لیکن پھر غصہ اتر جانے کے بعد وہ مجھے دلاسا دینے لگا۔ وہ اب بھی مجھے قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ بارڈر عبور کرنا کچھ آسان نہیں تھا، لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بھی اُس نے صبر و سکون سے انتظار کی تلقین کی۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ کاسنی رنگ کی اس گٹھڑی کے اندر سیندور، منگل سوتر اور میرے سابقہ شوہر کے کپڑے موجود تھے۔ میں انہیں اپنے ہمراہ یہاں لائی تھی۔ شوہر سے ملاقات کے بعد میں نے جاناں کے تھما دیا، لیکن حالات موافق نہ ہو پائے تو وہ اُس نے واپس کر دیے۔ آج بھی میں اُسے گٹھڑی واپس کرنے کی نیت سے گئی تھی، لیکن بات چیت کے دوران اُس نے خفیف قدموں کی آہٹ سن لی اور میں نے آپ کو سڑک کی جانب جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے رامو کے ساتھ مشورہ کیا۔ رامو نے مجھے کچھ رقم تھماتے ہوئے گاؤں کے قریب کہیں اور گھر کرائے پر لینے کی تلقین کی اور دو دن بعد واپس آنے کا وعدہ کرنے کے بعد بارڈر پار چلا گیا۔ چاند بی بی خاموش ہوگئی۔ کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ میرا دماغ تیز و تند بگولوں کی زد میں تھا۔ جاں نثار خلاؤں میں گھورتا ہوا نا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے بھابی بھی دوچار تھیں۔ چاند

بی بی اپنے ہاتھوں میں موجود چوڑیوں کو گھور رہی تھی۔ پھر جاں نثار نے لمبا سانس کھینچا اور پہلے میری جانب دیکھنے کے بعد چاند بی بی سے ہمکلام ہو کر بولا۔

"تمہارے سابقہ شوہر رامو کی نصیحت کے مطابق اس وقت تمہیں گاؤں سے دور کرائے کے گھر میں ہونا چاہیے تھا، لیکن تم اس کی نصیحت پر عمل نہ کرتے ہوئے اس وقت یہاں ہمارے سامنے موجود ہو..... کیوں؟"

چاند بی بی کی آنکھوں میں آنسو بھرتے چلے آئے۔ اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں کچھ دنوں سے آزمائش کی تلخ گھڑیوں سے دوچار ہوں۔ اپنی بچی اور شوہر کو دھوکا دینا میرے لیے ممکن نہیں؟ آپ سب کے میرے اوپر بہت احسانات ہیں۔ میں انہیں فراموش کر کے آپ سب کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے رامو کے کہنے کے باوجود یہاں چلی آئی۔ اب یہاں جو کچھ بھی ہوگا۔ آپ سب کی مرضی کے مطابق ہوگا۔"

کمرے میں ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہوئی۔ اب یہاں سانسوں کی سنسناہٹ تھی یا پھر چوڑیوں کی کھنکھناہٹ..... علاوہ ازیں گمبھیر خاموشی..... جاں نثار حسبِ عادت اب بھی خلاؤں میں گھور رہا تھا، جبکہ میرا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ بھابی کے چہرے پر اپنی ہم جنس کے لیے رحمدلانہ جذبات موجزن تھے۔ جاں نثار کا ہنکھارتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں اس معاملے کے متعلق کچھ بھی کہنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ اب فیصلہ پنچائیت کرے گی۔ آپ اپنے سابقہ شوہر رامو کو کل یہاں بلا لیں۔ میں اس کی جان کی ضمانت دیتا ہوں، لیکن اُس کی موجودگی کے بغیر فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔" چاند بی بی نے اقرار میں سر ہلایا اور کمرے میں ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہوتی چلی گئی۔

دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد گاؤں کے درمیان بنی چوپال میں گاؤں کے سرکردہ افراد کے علاوہ گاؤں والے بھی موجود تھے۔ معاملہ گاؤں کے پنچوں کے علاوہ گاؤں والوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا اور وہ کسی حد تک اشتعال میں دکھائی دیتے تھے۔ چاند بی بی اور اس کے

سابقہ شوہر راموکو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اُن کو منظرِ عام پر لانا حالات کو بگاڑنے کے مترادف تھا۔ لیکن اُن دونوں کی عدم موجودگی میں بھی کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے گاؤں کے سرکردہ پنچوں کے حکم کے مطابق انہیں پنچایت میں بلانے کے لیے مختصر وقت دیا گیا تھا، تاکہ دونوں سے پوچھ گچھ کے بعد کسی حتمی فیصلے کو سامنے لایا جاسکے۔ گاؤں کے سب سے بڑے پنچ کا نام مولوی عبدالرحمٰن تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی اور چہرے پر نور کی شدت تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی اور پرہیزگار ہونے کے علاوہ گاؤں کی اکلوتی مسجد کی امامت کا اعزاز بھی رکھتا تھا۔ چوپال میں دو چارپائیاں موجود تھیں، جن پر پنچوں کے علاوہ میں، جاں نثار اور گاؤں کے متمول حیثیت رکھنے والے اشخاص بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ باقی تمام گاؤں والے زمینوں پر بیٹھے مقدمے کی شروعات کے منتظر تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن نے آیات کی تلاوت کے بعد گاؤں والوں کی جانب نظر دوڑائی۔ پھر بولا۔

"میرے خیال میں آپ سب امیر علی کے مسئلے کے متعلق سب کچھ جانتے ہی ہیں۔ اب میری آپ سب سے یہ درخواست و التجا ہے کہ اپنے جذبات پر حتی الوسع قابو رکھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ہمارا مذہب بھی ہمیں اسی بات کی تلقین کرتا ہے۔" پھر اس نے مجمع کی جانب سے نگاہ ہٹا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔

"امیر علی ولد شبیر علی..... چاندنی بی بی یا پھر سابقہ مدھومتی کا شوہر ہے۔ میں اسے پنچوں کے سامنے آنے کی درخواست کرتا ہوں، تاکہ معاملے کو سلجھانے کے لیے پیش رفت کی جائے۔" میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ہوا پنچوں کی چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن نے تیکھی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا، پھر بولا۔

"امیر علی..... کیا شادی سے قبل یہ بات تمہارے علم میں تھی کہ تمہاری ہونے والی بیوی چاندنی بی بی یا مدھومتی ایک ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں بہت سی باتوں سے باخبر ہوں، لیکن تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے اس بات سے یکسر لاعلم رکھا گیا، بلکہ شادی کے بعد بھی پتا نہیں چلنے دیا گیا۔ وہ تو خدا کی مرضی اور حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے بات کھلتی چلی گئی، ورنہ مجھے اب بھی معلوم نہیں ہو پاتا اور چاندنی بی بی خاموشی کے ساتھ بارڈر کے پار چلی جاتی۔" مولوی عبدالرحمٰن نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔

"اب تمہاری اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ تمہارا نکاح بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ ہندو لڑکی کے ساتھ اس وقت تک نکاح جائز نہیں..... جب تک وہ اسلام کے دائرہ کار میں قدم نہ رکھ دے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لیے تمہارے نکاح کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب میری نصیحت صرف یہی ہے کہ تم جو کچھ بھی کرنا..... وہ اسلامی دائرہ کار میں رہ کر کرنا۔" میں نے افسردہ نگاہوں سے پنچوں کی جانب دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"فیصلہ حتمی ہے اور قانون کے مطابق بھی ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ طلاق لیے بغیر دوسرا نکاح جائز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندو بھی ہے۔ میری عقل و فہم کے مطابق ملک کا بٹوارا ممکن ہے، لیکن عورت کا بٹوارا ممکن نہیں ہے۔ اُسے ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، باقی آخری فیصلہ میں پنچوں کی عقل و دانش پر چھوڑتا ہوں۔" میں خاموش ہو گیا۔ مولوی عبدالرحمٰن نے بتایا اور چار پنچوں کے ساتھ سر جوڑ کر مشورہ کیا، پھر مجھے اپنی جگہ بیٹھنے کا حکم دیا اور چاندنی بی بی سابقہ مدھومتی اور اس کے شوہر راموکو بلانے کی ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد چوپال میں مدھومتی کے علاوہ اس کا شوہر رامو داخل ہوا۔ فضا میں کشیدگی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ گاؤں والوں میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی تھی، جو بارڈر پار ہندوؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہوئے پاکستان آنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اُن کا اشتعال فطری طور پر درست تھا۔ موقع کی نزاکت کو جانچتے ہوئے پنچوں نے پہلے ہی دونوں میاں بیوی کی حفاظت کے اقدامات کر رکھے تھے۔ چوپال میں میاں بیوی کے ہمراہ پولیس کے دو اہلکار بھی ہاتھوں میں رائفل تھامے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر مشتعل افراد واپس زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔ رامو چھوٹے قد اور کالے سیاہ رنگ کا..... دوسروں کی

زمینوں پر کام کرنے والا ہاری دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکینیت کی دبیز تہہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپتا ہوا دھوتی کے ہمراہ چلتا ہوا پنچوں کی چارپائی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن نے دونوں میاں بیوی کا جائزہ لیا، پھر نرم گرم لہجے میں بولا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں اتنے ہی محفوظ ہو جتنے اپنے ملک میں...... اگر معاملہ گمبھیر نہیں ہوتا تب تم دونوں کو پنچایت میں بلانا ضروری نہیں تھا، لیکن اب چونکہ معاملہ کچھ غیر معمولی نوعیت اختیار کر چکا ہے۔ اس لیے میں اسے تم دونوں پر چھوڑتا ہوں۔ یقیناً تم دونوں موجودہ مسئلے پر غور و خوض کرتے ہی رہے ہو گے۔ اب کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر دو تاکہ ہمیں بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

"رامو تم بتاؤ۔ تمہارے مسئلے کا حل کیا ہو سکتا ہے؟"

رامو نے تھوک نگلتے ہوئے پنچوں کی جانب دیکھا، پھر کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سرکار...... آپ جیسے عقلمند اور اچھے لوگوں کی موجودگی میں...... میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ یقیناً جو بھی فیصلہ کریں گے، ہمارے حق میں بہتر ہی ہو گا۔ ہمارا اپنا فیصلہ آپ کے فیصلے کے ساتھ منسلک ہے۔" مولوی عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے راموکی جانب دیکھا پھر بولا۔

"میں نے فیصلے کی نہیں...... صرف رائے کی بات کی ہے۔ مسئلہ پیچیدہ ہے اور قصور سراسر تمہاری بیوی کا ہے۔ وہ بیک وقت طلاق لیے بغیر دو شادیوں کی مرتکب ہوئی ہے اور ایسا ہونا ممکن نہیں...... لیکن ہو گیا ہے، لہٰذا ہمارے مذہب میں معافی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر یہ طلاق لینے اور مسلمان ہونے کے بعد دوبارہ نکاح کر کے امیر علی کو اپنا لے۔" رامو ہڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جو حضور کو منظور ہو۔ اگر مجھ ناچیز کی رائے کی کچھ بھی اہمیت آپ لوگوں کی نگاہوں میں موجود ہے۔ تب مجھے اپنی بیوی کے ہمراہ واپس جانے دیا جائے۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

مولوی عبدالرحمٰن نے اس دفعہ چاند بی بی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"چاند بی بی تم کیا کہتی ہو؟ یہ یاد رکھنا۔ دوسرے شوہر سے تمہاری ایک معصوم بچی بھی موجود ہے۔ یا یوں سمجھو کہ تمہیں ایک شوہر نہیں بلکہ ایک مذہب کا انتخاب کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ اتنا آسان کام نہیں ہو گا، جتنا دکھائی دیتا ہے۔ بہرکیف پھر بھی مسئلے کے فیصلے میں تمہارا اقرار یا پھر انکار بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"

چاند بی بی کے چہرے پر سوچ و بچار کے تاثرات ابھرے، پھر وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ شاید کل صبح تک...... لیکن اتنی جلدی میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتی۔" مولوی عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر بولے۔

"یقیناً یہی درست ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں، موجودہ مسئلے کا حل تمہاری ہاں...... یا نا میں پوشیدہ ہے۔ تم آج رات اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر اپنے سابقہ شوہر کے ہمراہ بارڈر پار جانا چاہو تب صبح خاموشی کے ساتھ تم اس کے ہمراہ جا سکتی ہو۔ علاوہ ازیں اگر امیر علی کے ہمراہ رہنا چاہتی ہو۔ تب رامو سے طلاق لینے کے بعد امیر علی کے ہمراہ صبح مسجد میں آ جانا، تاکہ اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ نکاح پڑھایا جائے۔ اس کے بغیر تم ہمارے درمیان نہیں رہ سکتی ہو۔ اب تم جا سکتی ہو۔ آج کی رات امیر علی کے گھر رہنا۔ صبح تمہارا فیصلہ منظر عام پر آ جائے گا۔ پنچایت برخاست کی جاتی ہے۔" مولوی عبدالرحمٰن نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا اور چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ رات یقیناً فیصلے کی رات تھی۔ دوسرے دن کسی ایک سے سب کچھ چھننے والا تھا۔ میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ ماتھے پر فکر انگیز لکیروں کا جال تنا ہوا تھا اور جسم میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ اگر میری بیوی چندا مجھے چھوڑ کر اپنے سابقہ شوہر رامو کے ہمراہ چلی گئی۔ تب میری دودھ پیتی بچی کا کیا ہو گا؟ وہ تو اپنی ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کے سائے سے محروم ہو جائے گی اور خود میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں ایک دفعہ پھر اسی مقام پر پہنچ جاتا۔ جہاں سے چلا تھا۔ بٹوارے کے بعد جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ تب سب کچھ قربان کر کے یہاں آیا تھا۔ اب

دوبارہ سرزمین قربانی مانگ رہی تھی۔ لیکن اس دفعہ میری نومولود لڑکی کو بھی قربانی کی بھینٹ چڑھنا تھا اور میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرے سوچنے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ سب کچھ تو میری حقیقی بیوی کے فیصلے میں پنہاں تھا۔ میں نے منہ موڑ کر ساتھ والی چارپائی پر موجود بیوی کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اور دم سادھے خاموش لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بظاہر پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ کچھ نہ کچھ پریشان تو ضرور ہوگی۔ اگرچہ اس کی نگاہوں میں میری اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تب بھی نومولود لڑکی کی کچھ نہ کچھ اہمیت تو موجود ہونی ہی چاہیے تھی۔ اسے بہرحال لڑکی کو میرے پاس ہی چھوڑ کر جانا تھا۔ کچھ بھی کہو...... ایک ماں کا دل تھا اسے لگنا ہی تھا۔

میں نے منہ پھیر کر آنکھیں موند لیں۔ فیصلے کی وہ رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔

صبح منہ اندھیرے میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے مسجد کی جانب چل دیا۔ نماز پڑھنے کے بعد میں نے خشوع و خضوع سے اپنے رشتے کی مضبوطی کی دعا کی اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے بعد بے یقین قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ جب میں گھر کے قریب پہنچا تب میں نے چاندنی بی بی کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاسنی رنگ کی گٹھڑی موجود تھی اور اس کا چہرہ مخالف سمت بارڈر کی جانب تھا۔ وہ بغیر پیچھے دیکھے بغیر تیز قدموں کے ساتھ بارڈر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنی دنیا لٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر سنبھلنے کے بعد میں بھی چاندنی بی بی کے پیچھے بارڈر کی جانب چل دیا۔ چاندنی بی بی کے قدموں کی رفتار بہت تیز تھی۔ شاید وہ جلد از جلد اپنے سابقہ شوہر کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ بلاشبہ وہ اپنے ہم مذہب ساتھی سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ ایک غیر مذہب انسان کی اس رشتے کے ساتھ بھلا کیا حیثیت...... کچھ ہی دیر میں وہ بارڈر کے قریب موجود درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئی۔ رامو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ شاید اس نے رات درختوں کے جھنڈ میں ہی بسر کی تھی۔ چاندنی بی بی نے ہاتھوں میں موجود گٹھڑی اسے تھما دی۔ پھر سرگوشیانہ انداز میں بات چیت کرنے لگی۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا بے معنی تھا۔ میں تھکے قدموں کے ساتھ واپس گاؤں کی جانب چل دیا۔ میرے پاس اب بھی مہتاب کی صورت میں بہت کچھ موجود تھا۔ اب مجھے صرف اپنی اکلوتی لڑکی کے لیے جینا تھا۔ لیکن ڈیڑھ سال سے قائم رشتے کو یوں یکدم بھلا دینا بھی کچھ آسان نہیں تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر چاندنی بی بی اور رامو کی جانب آخری دفعہ دیکھا۔ وہ دونوں بارڈر کی جانب رواں دواں تھے۔ میں نے قدموں کو مزید تیز کر دیا۔ اب دوبارہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچنے تک میرا سانس پھولنے لگا اور میں نے رفتار آہستہ کر دی۔ گاؤں میں زندگی بیدار ہو چکی تھی اور چہل پہل کا عالم تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری نظر میں زندگی کی حقیقت بے معنی ہو چکی تھی۔ سب کچھ بے کار تھا۔ اگر مہتاب کا وجود نہ ہوتا۔ تب شاید میں خودکشی کے متعلق بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا۔ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں حیران تھا اور پریشان بھی ہو گیا۔ چاندنی بی بی سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ ہچکیوں کی مانند تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تب وہ بولی۔

"مجھے مسجد کی جانب لے چلیے..... میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔" مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ بولے چلے جا رہی تھی۔ "رامو وہاں درختوں کے پاس کھڑا ہے۔ وہ مجھے طلاق دینے کے لیے رضامند ہے۔" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"لیکن میں نے تمہیں رامو کے ہمراہ بارڈر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر یکدم یہ سب کچھ کیسے تبدیل ہو گیا۔" چاندنی بی بی بولی۔

"اپنی بچی کے بغیر رہنا میرے لیے ممکن نہیں..... اور وہ بچی کو اپنے ہمراہ رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس لیے میں سب کچھ تیاگ کر واپس چلی آئی۔ رامو مولوی صاحب اور گواہوں کے سامنے مجھے طلاق دینے کے لیے تیار ہے۔ دیر مت کیجیے۔ مہتاب گھر میں اکیلی ہے۔ وہ یقیناً بھوک سے بلک رہی ہوگی۔" میں نے خوشی سے اثبات میں سر ہلایا اور چاندنی بی بی کا ہاتھ تھامے فتح یابی سے بھرپور قدموں کے ساتھ مسجد کی جانب چل دیا۔ جو وہاں سے قریب ہی تھی۔

☆.....☆

تیرا شعلہ

تیرے انتظار میں



مجید احمد جائی

حسد میں جل کر برباد ہونے والے ایک خاندان کی داستان عجب

عیدالاضحیٰ کی آمد آمد تھی۔ بازاروں اور گلیوں میں خوب رونق تھی۔ ہر طرف کاغذی جھنڈیوں سے سجا دیا گیا تھا۔ گاہکوں کی آمد کا مرکز بنی ہوئی تھی بیوپاریوں نے بھی ہر طرف قبضہ جما لیا تھا۔ رنگ برنگی ٹوپیاں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ گاؤں سے دور دراز علاقوں کی شکل میں آ کر بازاروں میں رونق دوبالا کر رہے تھے۔ ایک احمد تھا جو اپنے گھر میں نیم کے درخت کے نیچے چارپائی پر پڑا دنیا کی رونقوں سے بے نیاز سانسیں گن رہا تھا۔ دائیں طرف دوائیوں کے ساتھ سیرپ کی شیشیاں موجود تھیں۔ بائیں طرف اس کی بیٹی کنزہ جو ابھی دس سال کی تھی۔ اپنے معصوم اور نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے پاپا کے سر کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ احمد کا مرجھایا ہوا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ الجھے بال اور ڈاکٹروں کا ناامیدی کے جوابوں میں گھرا چہرہ زندگی کے ختم ہونے کی نوید دے رہا تھا۔ احمد نے کمزور آواز میں اپنی بیٹی کو آواز دی۔ "کنزہ!"

"جی پاپا جانی...!"

"بیٹا! اپنے چچا علی کو بلاؤ۔"

"جی اچھا پاپا۔"

کنزہ جو احمد کا سر دبا رہی تھی۔ اٹھی اور کمرے کی طرف چل دی۔

احمد پھر سے ان سوچوں میں ڈوب گیا۔ احمد علی کے جانے کے بعد ان کو تکتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں کنزہ اپنے چچا علی کے ساتھ آ گئی۔

احمد کہنے لگا۔ "علی! میرا ایک کام تو کرو، صرف آخری کام۔ چچا کرو گے نا!" احمد نے علی کو امید بھری نظروں سے دیکھا۔

علی حیران و پریشان احمد کے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔ "جی بھیا کیا بات ہے؟"

"سب خیر تو ہے نا؟ میری جان صبح و شام آپ پر قربان، ایک کیا ہزاروں کام کروں گا۔ آپ حکم تو کریں۔" علی نے بہت پیار سے انداز میں احمد کو جواب دیا۔

"علی آخری بار تم اپنی بھابھی کے پاس جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ مجھے امید ہے ایمان اب سب ناراضگیاں ختم کر کے چلی آئے گی۔ مجھے قوی امید ہے تم جاؤ تو سہی۔ تمہیں دیکھتے ہی اس کی ممتا جاگ اٹھے گی۔ اس کی معصوم کنزہ، نور، صبا اور مہک کے لیے تڑپ رہی ہوگی۔ اس کا غصہ ختم ہو گیا ہوگا۔ تم جاؤ گے نا...؟"

احمد نے علی کو امید بھرے طلب لہجے میں کہا۔

ایمان احمد کی بیوی تھی۔ جو تین سال سے اپنے میکے

میں ناراض ہو گئی تھی۔ جسے اپنی معصوم بیٹیوں کی فکر تک نہ تھی
اور سب سے بڑھ کر جان نچھاور کرنے والے محبت کے
جذبوں سے سرشار شوہر کو بستر مرگ پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔
کتنی سنگدل تھی۔ احمد سے کیے سبھی وعدے، سبھی
قسمیں بھول گئی تھی۔ کبھی تو کہتی تھی احمد میری جان تم پہ
قربان، لیکن جب جان نچھاور کرنے کا وقت آیا تو نہ جانے
کن گلیوں میں گم ہو گئی تھی۔؟ احمد کی سبھی امیدوں، سبھی
خوابوں [illegible] گئی۔ احمد تنہا اس کا ساتھ دے رہا



تھی۔ اس کی ترستی آنکھیں آج بھی ایمان کا انتظار کر رہی
تھیں۔ اس کے لبوں پر اب بھی ایمان کا نام مچلتا
تھا۔ ستاروں سے باتیں کرتے ہوئے احمد یہی کہتا۔ "دیکھو
ایمان وہ دن یاد کرو! جب ہم اکٹھے تھے یہ ستارے، وہی
چاند آج بھی چمکتا دمکتا ہے لیکن تم نہیں کھو گئی ہو!! کہاں
ہو لوٹ آؤ۔ بے قراری یہ جدائی میری جان لے لے
گی۔ یہ ستارے، یہ چاند، میرے ساتھی روز اول کی
طرح رہے ہیں۔ وہ بیتے ہوئے دن کی طرح آج بھی چاند
روشن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے تم پاس نہیں ہو۔"
احمد رات کی تاریکی میں ستاروں کو تکتا ایمان سے
باتیں کرتا رہتا اور رات دھیرے دھیرے گزر جاتی۔
ملن کو تڑپتے ہوئے بھی پتہ تھی وہ لوٹ کے چلا گیا وہ رات
یقین تھا ایمان نہیں آئے گی لیکن بھولی کی بات نہ کی
نہیں سکتا تھا اس لیے ایک دفعہ پھر لوٹ چلا گیا۔ احمد
اپنی ننھی بچیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا
تو ان کی آنکھوں میں [illegible]
بچیوں کا کیا قصور تھا، جو ماں کی ممتا کو ترس رہی
تھیں۔ اپنے رب سے یہی دعا کرتا "اے رب کریم تو تو
رحیم ہے رحم فرما ان ننھی سی زندگیوں کو واسطہ میرا لمحہ
خوشیوں سے معمور کر دے۔ میری خوشیاں لوٹا دے انہیں
ان کی ماں سے ملا دے۔"
رب سے دعا کرتے احمد کی آنکھیں ساون بھادوں
کی طرح برس پڑتیں۔ کنزہ، نور، صبا اور مہک کو کیا خبر تھی
کہ پاپا انہیں ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔؟ ان کے ننھے

میں کیسی آگ لگی ہے جو ٹھنڈی ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ ان کے کیا خواب ہیں؟ آنکھیں کیوں بہتی رہتی ہیں۔؟

احمد ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ پکی اینٹوں سے بنے دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا جس میں احمد اپنے چھوٹے بھائی علی اور لاڈلی بہن نورین کے ساتھ احمد دین کے گھر کی خوشیاں بانٹ رہا تھا۔ احمد کے والد احمد دین اور ماں بختاں بڑے خوش مزاج اور رحم دل انسان تھے۔ اپنے بچوں کی پرورش بڑے عمدہ طریقے سے کر رہے تھے۔ صحن میں لگا نیم کا درخت پورے گھر کی رونق میں چار چاند لگا رہا تھا۔ دوپہر کو بھی اس کی چھاؤں میں آ کر آرام کرتے تھے۔ خوشحال گھرانہ تھا۔ جہاں محبتیں، چاہتیں تھیں۔ مسکراہٹوں کے پھول بکھرتے تھے۔ غریبی، مفلسی میں احمد دین نے پورے گھرانے کی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے سنبھالی ہوئی تھیں۔

احمد سب سے بڑا تھا۔ ماں باپ کا پیارا، گھر کی رونق تھا۔ احمد کو مقامی سکول میں داخل کیا گیا تاکہ کچھ پڑھ لکھ جائے۔ علی اور نورین چھوٹے تھے۔ احمد روز اسکول جایا کرتا۔ زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ ایمان احمد کی خالہ زاد تھی۔ احمد کے گھر سے تھوڑی دوری پر ان کا گھر تھا۔ تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ سب سے بڑا سلیمان، پھر نوید اور اختر تھے۔ سلیمان سے چھوٹی ایمان تھی۔ آخری نمبر سب سے لاڈلی زیب النساء کا تھا جو بہت شرارتی اور ہنسنے ہنسانے والی تھی۔ ایمان مغرور اور نخریلی تھی۔ اس کے من میں دولت کا مقام تھا۔ رشتے ناتوں کو اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اس کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی۔ ان کا گھرانہ احمد کے گھرانے سے زیادہ امیر تھا۔ گھر میں ہر چیز کی فراوانی تھی۔ عیش و عشرت نے انہیں پر لگا دیے تھے۔ ایمان بالکل ماں پر گئی تھی۔ جو ماں کہتی وہی ایمان کے الفاظ ہوتے۔ دونوں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں، البتہ ایمان کا والد حسن بخش خوش مزاج طبیعت کا مالک تھا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ یہی وجہ تھی محلے میں ان کو عزت و مقام حاصل تھا۔

احمد روز گھر سے DO سیدھا اپنی خالہ کے گھر جاتا۔ وہاں سے ایمان اس کے ساتھ جاتی تھی۔ دونوں کے اسکول ساتھ ساتھ تھے۔ احمد ایمان کو اس کے سکول چھوڑتا ہوا اپنے اسکول کی طرف چلا جاتا۔ دونوں ایک ساتھ جاتے اور اکٹھے گھروں کو لوٹتے تھے۔ ایمان اور احمد نے میٹرک پاس کر لیا۔

زندگی کے شب و روز گزرتے چلے گئے۔ دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ ایمان سنہری زلفوں، چاند کی طرح چمکتا دمکتا چہرہ، ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح، جھیل سی آنکھیں، سفید دودھ کی طرح نرم و ملائم ہاتھ، سادگی کے تو کیا کہنے۔ سفید لباس میں پرستان سے آئی ہوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ قدرت کا حسین شاہکار تھی۔ ایمان خوبصورتی کی حدیں پھلانگ رہی تھی تو احمد بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ گھنے سیاہ بال، ستواں ناک، جادو بھری آنکھیں، سرخ گلاب جیسے گال، لمبا قد اور شرابی ہونٹ، کتنا خوبصورت لگتا تھا۔ خوبصورتی میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔

وقت کا پنچھی محوِ سفر رہا اور نجانے کس گھڑی میں دونوں کے اندر محبت کے چشمے پھوٹ پڑے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے۔ روز حسین پل تقسیم ہوتے۔ ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان ہونے لگے۔ محبت کے لازوال جذبوں نے دونوں کو ایک دوسرے پر قربان ہونے کا حوصلہ دے دیا۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر گھر آنے کی بجائے راستے میں بنے پارک میں چلے گئے۔ ننھے ننھے گلابوں کے پھولوں کے جھرمٹ میں بیٹھے مستقبل کے پلان بنانے لگے۔ جب شام کے سائے ڈھلنے لگے تو دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف چل پڑے۔

ایمان نے بی۔ اے کر لیا اور گھر میں بیٹھ گئی۔ احمد بی۔ اے کرنے کے بعد جاب کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ دن بھر جاب کی تلاش ہوتی اور شام کو Study ہوتی۔ ماں کی دعاؤں کے سائے میں روز صبح سویرے نئی اُمید، نئی اُمنگ، نئے جذبے سے گھر سے DO اور مختلف محکموں میں اپلائی کرتا جاتا، لیکن ساری محنت، ساری جدوجہد رائیگاں جاتی۔ جہاں بھی جاتا رشوت کا زہریلا سانپ ڈسنے کو تیار ملتا۔ رشوت

نذرانے کی باتیں ہوتی۔ احمد مایوسی، ویرانی میں ڈوبا گھر کی طرف واپس لوٹ آتا۔ اگر اتنی رقم اس کے پاس ہوتی تو وہ اپنا کاروبار شروع کر لیتا۔

ایمان گھر میں سلائی کڑھائی کرنے لگی۔ کبھی کبھار احمد، ایمان کے ہاں جاتا تو خوشیوں کا میلہ سج جاتا۔ ایمان کے لیے جیسے عید آ گئی ہو۔ اسے ہر چیز مبارکیں دیتی محسوس ہوتی۔ دونوں پوری دنیا سے بے خبر، بے نیاز اپنی دنیا میں کھو جاتے۔ جہاں ان کی اپنی نگری ہوتی۔ ان کے خواب ہوتے اور یوں شام کے سائے ڈھلتے تو احمد آنکھوں میں سپنے سجائے اپنے گھر کی طرف لوٹ آتا۔ محبت انسان کو طاقتور بنا دیتی ہے۔

قدرت کی دیوی مہربان ہوئی۔ احمد کو دوست کے توسط سے پرائیویٹ فرم میں معمولی جاب مل گئی۔ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے کے مصداق احمد نے غنیمت جانا اور جاب پر جانے لگا۔ شروع میں تنخواہ کم تھی لیکن رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ احمد کو جاب مل جانے سے احمد دین کے کندھوں کا بوجھ کم ہونے لگا۔ گھر میں خوشیوں کا سماں تھا۔ چہرے پھولوں کی طرح مہک اٹھے تھے۔ نورین کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں احمد خوشی سے پوری کر دیتا۔

ایمان کے گھر رشتے آنے لگے تو ایمان ماں کے کان کھا گئی۔ "امی! پیاری امی جان۔"

ایمان کی ماں نے جیسے ایمان کے دل کی بات جان لی۔ پوچھنے لگی "خیر تو ہے بیٹی! آج بڑی محبت سے واری ہو رہی ہو۔"

"امی میرے رشتے آنے لگے ہیں۔ کہیں آپ مجھے کسی لنگڑے، اندھے کے حوالے نہ کر دینا۔"

ایمان اصل موضوع پر آ چکی تھی۔

"تم ہی بتا دو۔ جو تمہارے دل کا شہزادہ ہو۔" ایمان کی ماں نے تو ایمان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ایمان کی جیسے لاٹری نکل آئی ہو۔ "ماں وہ...... وہ...... وہ اپنا احمد...... احمد ہے نا...... میں اسے بہت چاہتی ہوں۔"

ایمان کے لبوں سے جیسے یہ الفاظ نکلے تو اس کی ماں کی رنگت اڑنے لگی۔ وہ تو اپنی بہن کو دشمن سمجھتی تھی اور ادھر اس کی بیٹی اس کے بیٹے کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ نہیں نہیں۔

"نہیں ایمان میں تمہاری شادی کسی امیر زادے سے کرواؤں گی۔ میری لاڈلی، نازوں والی بیٹی کسی محل کی شہزادی بنے گی۔ اس کنگلے احمد کے ماں باپ تمہیں کیا دیں گے۔ ان کے پاس ہے ہی کیا۔!"

ماں کی باتیں ایمان کو ناگوار گزر رہی تھیں۔

"نہیں ماں...... میں شادی کروں گی تو صرف احمد سے...... ورنہ کوئی بھی نہیں......" ایمان نے بھی اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

جب ایمان نے الٹی میٹم دیا تو ایمان کی ماں کی لالچی سوچوں نے کام دکھایا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھا دیا۔ ایمان ایک شرط پر تیری شادی احمد سے کرواؤں گی۔

"وہ کیسے امی جان؟" ایمان نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ...... وہ گھر داماد بنا کر اپنی بیٹی بیاہوں گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے امی۔ مجھے منظور ہے۔"

ایمان کو کیا خبر تھی کہ ماں کے من میں کیا ہے؟

"تو پھر ٹھیک ہے۔ احمد سے کہو اپنے گھر والوں کو بھیجے۔" ایمان خوشی سے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آنے لگے۔ ایمان نے احمد کو کال ملائی۔

"ہیلو احمد! کیسے ہو؟"

"آج صبح صبح چاند نے کیسے یاد کر لیا۔!"

"احمد میری بات غور سے سنو۔ میرے گھر والے میری شادی کرنے لگے ہیں۔ کئی لوگ آ چکے ہیں۔ تم ایسا کرو اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجو۔" دونوں نے آپس میں چند باتیں کیں، پلان تیار کیے، پھر کال منقطع ہو گئی۔

احمد دن بھر آفس میں سوچتا رہا۔ کس طرح امی سے بات کروں...؟ کس طرح دل کا حال زبان پر لاؤں...؟ سوچوں کی یلغار میں دن بھر الجھا رہا۔ شام ہوئی تو گھر آیا۔ چولہے کے ارد گرد محفل سجی تھی۔ سبھی خوش گوار موڈ میں تھے اور قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ احمد نے موقع غنیمت جانا اور بات شروع کی۔ نورین تو جیسے اچھل پڑی۔

"میرے بھیا کی دلہن آئے گی...... کون ہے...؟ کیسی ہے...؟" نورین نے بے صبری سے احمد سے پوچھا۔ احمد مسکرائے بنا رہ نہ سکا۔ احمد نے دھیرے دھیرے ایمان کی طرف اشارہ کیا۔

احمد دین اور اس کی بیوی جیسے سا کن سے ہو گئے ہوں..... احمد نے کس گھر میں خوشی تلاش کی تھی وہ جنہوں نے کبھی خبر تک نہ لی تھی۔ جار پیسے کیا آئے، اپنوں کو بھول بیٹھے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی بہن اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ احمد کی ماں کے دماغ میں سوچیں جنم لے رہی تھیں۔

"امی کن سوچوں میں کھوئی ہو۔" احمد نے ماں کو خلا میں گھورتے پایا تو بولے بنا رہ نہ سکا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔ بس کچھ پرانی باتیں دل پر حملہ کرنے چلی آئیں۔ تم فکر نہ کرو، لو کھانا کھاؤ۔" احمد کی ماں نے احمد کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہیں صبح کو بتائیں گے ابھی کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔"

"ٹھیک ہے امی جان۔" احمد کھانا کھانے کے بعد اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔

رات کو جب بچے سو گئے تو احمد دین اور اس کی بیوی کی محفل جمی۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ اوپر والے نے کس کے نصیب میں کیا لکھا ہے..؟ قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ احمد کی خوشی میں ان کی بھی خوشی تھی، سو انہوں نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ ایمان کا ہاتھ مانگنے کے لیے ان کے گھر جائیں گے اور پھر والدین تو ہمیشہ اولاد کے لیے سوچتے ہیں۔ اولاد کو خوش دیکھنا، خوش رکھنا ان کا مشن ہوتا ہے۔

صبح سویرے جب احمد کو اطلاع دی گئی تو احمد مارے خوشی سے دیوانہ ہوئے جا رہا تھا۔ ایمان کو خبر دی کہ میرے امی ابو آج ہی تمہارے گھر آ رہے ہیں۔ سارا دن چڑھے احمد دین بیوی کے ہمراہ ایمان کے گھر موجود تھے۔

احمد اپنی سالی کے گھر چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اصل موضوع کی طرف آیا۔ ایمان کی ماں موجود تھی۔

"ہم ایمان کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ احمد اور ایمان ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔" بالآخر احمد کے والد نے کہہ ہی دیا۔

ایمان کی ماں تو پہلے ہی منتظر تھی۔ اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "بہن! ایمان آپ کی ہی بیٹی ہے۔ بس شام کو ایمان کے ابو آ جاتے ہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔ آخر گھر کے بڑے جو ہیں، اتنے میں ایمان ٹرے میں چائے اور بسکٹ سجائے حاضر ہوئی۔ ایمان کو آتا دیکھ کر سبھی نے اپنی باتوں کا رُخ تبدیل کر لیا۔ چائے کا دور ختم ہوا تو احمد دین نے اجازت چاہی اور خوشی خوشی گھر کو آ گئے۔

کئی دن گزر گئے تو احمد دین، بیوی کو ساتھ لیے پھر ایمان کے گھر پہنچ گیا۔ اس دفعہ احمد کی خالہ اور خالو دونوں موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد اصل موضوع کی طرف آئے تو ایمان کی ماں کہنے لگی۔

"دیکھو بہن، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے البتہ ایمان کے ابو کہتے ہیں کہ سلیمان کے لیے ہم بھی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں تو کیوں نا رشتے داری کو مضبوط کیا جائے اور نورین کو اپنی بیٹی بنا کر گھر لے آئیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔"

احمد دین اور اس کی بیوی نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا لیکن احمد کی خوشیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور نورین کی قسمت کا فیصلہ بھی کر لیا۔ یوں وٹہ سٹہ کی بنیاد پر رشتے طے ہو گئے۔

نورین ابھی چھوٹی تھی مگر بھائی کی خوشیوں کی خاطر قربانی کیلئے تیار ہو گئی۔ دونوں گھروں میں خوشیاں چھا گئیں۔

ایمان کی ماں کی من مانی پوری ہوئی تو خوشی منانے لگی۔ خوشی کیوں نہ مناتی، اس کا پلان کامیاب جو ہو گیا تھا۔ احمد اور ایمان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں عروج پکڑ گئیں اور طے شدہ پروگرام کے ساتھ احمد دولہے کے روپ میں ساتھیوں کے ہمراہ، ڈھول کی تال پر رقص کرتے نوجوانوں کے ہمراہ تاروں کی چھاؤں تلے ایمان کو اپنا ہمسفر بنا کر اپنے آنگن میں لے آیا۔

دونوں پریمیوں نے جو چاہا تھا مل گیا تھا۔ کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی کوئی رقیب نہیں بنا تھا اور نہ کوئی کیدو پیدا ہوا۔ یوں لگے قدرت مہربان بہت تھی۔ نورین بھی سلیمان کی راج کماری بن کر پیا گھر سدھار گئی۔ یوں دونوں گھر مضبوط بندھن میں بندھ گئے۔ عرصے سے جو ناراضگیاں تھیں ختم ہو گئیں۔ مگر کس کو پتا تھا کہ وقت کھیل کھیل رہا ہے۔

تین سال کا عرصہ پر لگا کر گزر گیا۔ احمد کو اللہ تعالیٰ

نے چاندی جیسی بیٹی کنزہ کی صورت میں عطا کی تھی۔ احمد بہت خوش تھا۔ اس کے گھر میں رحمتوں کی برسات ہوئی تھی۔

ایمان پھر سے اُمید سے تھی۔ ایمان کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دفعہ بیٹا عطا کرے۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔ اس میں انسان کا بس کہاں چلتا ہے۔؟ اللہ تعالیٰ نے احمد کو دوسری بھی بیٹی عطا کر دی۔ نور صبا بہت خوبصورت چٹی گوری، گول مٹول تھی۔ پری جیسی بیٹی کی پیدائش ایمان کو ناگوار گزری۔

نجانے کیوں ایمان کو بیٹیاں پسند نہیں تھیں۔ حالانکہ دستورِ زمانہ ہے۔ بیٹیاں ماؤں کو عزیز ہوتی ہیں اور بیٹے باپ کی شان ہوتے ہیں۔ یہاں سے ایمان تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ نور صبا کو منحوس کا لقب دے دیا۔

اُدھر نورین کو اللہ تعالیٰ نے دوسری مرتبہ بھی بیٹے سے نوازا تھا۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ سلیمان کی ماں بھی کبھار تلخ کلامی کر بھی لیتی تو محسوس نہ کرتی۔ سلیمان اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

نورین کی خوشیاں ایمان کو زہر لگتی تھیں۔ ویسے بھی عورت ہی عورت کی دشمن رہی ہے۔ عورت ہی عورت کا گھر برباد کرتی ہے۔ نورین کے ہاں دوسرے بیٹے کی پیدائش حسد کی آگ کو بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔ ایمان جب بھی میکے جاتی ایک طوفان بپا ہو جاتا۔ ماں بیٹی مل کر نورین کا جینا حرام کر دیتیں۔ سلیمان گھر پر نہیں ہوتا تھا ان کی عید ہو جاتی۔ نورین بہت برداشت کرتی لیکن جب حد سے بڑھ جاتی تو وہ جواب دے دیتی۔ یوں جھگڑا طول پکڑ جاتا۔ گھر میدان جنگ بن جاتا۔

نورین جب بھی میکے جاتی، گھر میں بہاروں کا سا سماں چھا جاتا۔ ماں صدقے واری ہوتی۔ احمد تو جان قربان کرتا تھا۔ علی کے لیے روح تھی، یوں بھی مسکراتے، ہنستے ہنساتے تھے۔ نورین ایمان سے ملتی تو ایمان حسد کی آگ میں جل بھن جاتی۔ اس حسد کی آگ نے طول پکڑا اور یوں دونوں گھروں کا چین و سکون برباد ہو کر رہ گیا۔ ایمان کی طبیعت میں چڑچڑا پن اُمڈ آیا۔ بات بات پر لڑنا، جھگڑنا، بھی کنزہ اس کا نشانہ بن جاتی تو کبھی نور صبا۔ یہ بھی حقیقت ہے غصہ ہمیشہ بچوں پر ہی نکلتا ہے۔

ایمان اور اس کی ماں نے نورین کو حد سے بڑھ کر ذلیل کیا۔ ایمان کی ماں اپنی بہن سے بدلہ نورین کی صورت لے رہی تھی۔ ایمان کی ماں نے اپنے انتقام کی آگ کو مزید بھڑکایا۔ ایمان کی ماں کا اپنی بہن سے بدلہ لینے کا وقت آگیا تھا۔ صدیوں پرانی تپش میں کمی آگ ٹھنڈی ہونے کو تھی۔ بختاں احمد کی ماں کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے احمد دین سے شادی کر لی تھی۔ جب کہ احمد دین ایمان کی ماں کی پسند تھا۔ ایمان کی ماں احمد دین پر قربان ہوتی تھی، لیکن تقدیر کے فیصلے نرالے ہوتے ہیں۔ تقدیر ہمیشہ کھیل کھیلتی ہے۔

احمد دین کو کچھ علم نہیں تھا۔ بڑوں کے فیصلوں نے یہ بندھن قائم کیا تھا۔ جس کا ایمان کی ماں کو رنج تھا۔ اب موقع آگیا تھا کہ وہ اپنا بدلہ نورین کی صورت میں لے رہی تھی۔ ایمان کی ماں چاہتی بھی یہی تھی۔ اس کی سوچی سمجھی سازش تھی اس کا پلان تھا۔ جس میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔

احمد خوب محنت سے گھریلو ذمے داریاں نبھا رہا تھا، لیکن حسد کی آگ کب کسی کو چھوڑتی ہے۔ اچھے بھلے انسان کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ احمد کے گھر کی فضا بھی حسد کی آگ کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ خوشیوں کے پل مختصر تھے جو گزر گئے تھے۔ خوشیوں کے حسین سنگم غموں میں بدلنے لگے اور ایک قیامت احمد کی منتظر تھی۔

احمد دین، بختاں اپنی بیوی کے ہمراہ شہر سے واپس آ رہے تھے۔ مین سڑک کراس کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آگئے۔ تیز رفتار کار نے انہیں کچل ڈالا۔ دونوں موقع پر دم توڑ گئے۔ احمد کے گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ احمد کی جنت روٹھ گئی تھی۔ شفیق باپ بھی انہیں بے رحم دنیا کے حوالے کر کے خوابِ ابدی نیند سو گئے تھے۔ احمد کبھی علی کو گلے لگاتا تو کبھی بہن نورین کو تسلیاں دیتا اور پھر اپنے اندر آنسوؤں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو روک نہ پاتا۔ باپ کی لاش سے لپٹ کر روتا۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ رشتے دار آئے رسمِ دنیا نبھائی اور چلے گئے۔ احمد دین اور بختاں کو رشتے داروں کے ہجوم میں منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا۔ احمد کے گھر کی خوشیاں روٹھ گئیں

تھیں۔ رب تعالیٰ کی رضا کے آگے سب راضی ہیں۔ احمد بھی رب کی رضا مان کر زندگی کی طرف پلٹ آیا۔

گھر کی تمام تر ذمے داریاں احمد کے کمزور کندھوں پر آ گئیں تھیں۔ علی ابھی پڑھ رہا تھا۔ احمد کی معمولی جاب گھریلو اخراجات پورے نہیں کر سکتی تھی۔ احمد نے پارٹ ٹائم کام کرنے کا بندوبست کیا اور تھوڑی سی کوشش کے ساتھ ہی پارٹ ٹائم جاب حاصل کر لی۔

احمد کو کچھ حوصلہ ملا۔ لیکن ایمان نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس دفعہ ایمان پھر اُمید سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اسے بیٹی سے نواز دیا۔ ایمان بھو کی شیرنی کی طرح چلانے لگی۔

مہک کی پیدائش کے آٹھویں روز ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ مہک بھوک سے رو رو کر پورے گھر کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ ایمان سے برداشت نہ ہوا اور پھر ایک عورت، عورت نہ رہی۔ درندگی پر اتر آئی۔ ایمان نے دونوں ہاتھ معصوم مہک کے گلے پر رکھ دیے۔

کہتے ہیں نا مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے یا جسے رب رکھے اُسے کون چکھے کے مصداق۔ یہ قدرت کی مہربانی تھی کہ خلاف معمول احمد اسی لمحے گھر داخل ہوا۔ شاید کوئی ڈاکومنٹ لینے آیا تھا۔ احمد کا آنا قدرت کا کرشمہ تھا۔ مہک کی جان بچ گئی۔ ورنہ معصوم کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی۔

احمد سے برداشت نہ ہوا اور پہلی دفعہ اس کا ہاتھ ایمان پر اٹھ گیا۔ پھر کیا تھا، قیامت برپا ہو گئی۔ ایمان نے زمین و آسمان ایک کر دیا۔ الزامات کی بارش کر دی۔ گھر، گھر نہیں میدان جنگ بن گیا۔ ایمان، مہک کو روتا چھوڑ کر لڑتی، جھگڑتی میکے چلی گئی۔ اب احمد پچھتا رہا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پیار سے ایمان کو سمجھانا چاہیے تھا۔ مگر اس نے غلط بھی نہیں کیا تھا۔ پھر بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے ایمان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ دوسرے لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا، وہ ننھی جان کا خاتمہ کر چکی ہوتی۔ نجانے کیا قیامت ہوتی؟

اس بات کا اثر احمد کو ذہنی مریض بنا گیا۔ وہ وقت سے پہلے کمزور ہو گیا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ غموں کی دھول میں دھنستا چلا گیا۔ جاب جاتی رہی اور بیماری نے جنم لے لیا۔ بچیوں کی دیکھ بھال اور اندر کے احساس نے احمد کو بستر مرگ پر آ گرایا۔ ایمان کو بہانہ چاہیے تھا۔ ایمان کب کی جا چکی تھی۔ محبت کے بھی وعدے، بھی قسمیں، عہد و پیمان، ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ زندگی کا خوشیوں سے شروع ہونے والا سفر تلخیوں پر ختم ہو گیا۔ ایمان کا یہ جانا تھا کہ نورین کی زندگی برباد ہو گئی۔ روز نئے الزامات، روز نئے شکوے نے زندگی کو تباہ کر گئے۔ نورین زندگی کا ماتم کرتی، بھائیوں کے پاس آ گئی۔ سلیمان جو جان نچھاور کرتا تھا، بہن اور ماں کی باتوں میں آ گیا اور غلط فیصلہ کر کے اپنی زندگی برباد کر بیٹھا۔ اپنا اتنا اچھا ہم سفر گنوا بیٹھا۔ جان لینے والا جان کا دشمن بن بیٹھا۔

ماں باپ کی وفات کا غم بھولا نہیں تھا اور پھر طلاق ملنے کا غم نورین کو ادھ موا کرنے کے لیے کافی تھا۔ بے چاری بھائیوں کے سامنے خاموش رہتی۔ کبھی مسکرا بھی لیتی لیکن جب دونوں بھائی گھر سے باہر جاتے۔ نورین سے صبر کے بھی ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے اور منہ زور آنسوؤں کا سمندر آنکھوں کے راستے رخساروں سے ہوتا ہوا دامن بھگو تا زمین بوس ہو جاتا۔

قدرت کے عجیب کھیل تھے۔ ماں باپ نا گہانی موت سے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بھائی کا گھر اجڑ گیا۔ نورین کو اپنے گھر اجڑنے کی فکر کم تھی۔ جتنا وہ بھائی کے لیے تڑپتی تھی، ننھی اور وہ بچی مہک کا کیا قصور تھا؟ کیا بیٹیاں عذاب ہوتی ہیں۔

ہمارے حضور اکرم ﷺ نے بیٹیوں سے محبت کر کے ثابت کر دیا کہ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں نہ کہ زحمت۔ نجانے نا سمجھ لوگ اس حقیقت سے کیوں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ نورین سارا دن مہک کو سنبھالتی تھی۔ اس کے صدقے واری ہوتی۔ اسے اپنی بیٹی سمجھتی تھی۔ لیکن ایمان کو رحم نہ آیا۔ واپس پلٹ کر نہ آئی۔ مہک پر بھی رحم نہ آیا۔ آتا بھی تو کیسے وہ تو بیٹیوں کے خلاف تھی۔ کیسی ماں تھی، جسے اولاد پسند نہیں تھی۔ اولاد تو والدین کے لیے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ ایمان۔۔۔ کیا ماں کے لفظ سے نا آشنا تھی؟

احمد دن بھر چارپائی پر پڑا کھانستا رہتا۔ اپنی بیماری

اور اپنی بیٹیوں کو دیکھ کر آنسوؤں کی ندیاں بہانے کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو اس کے پاس نہیں تھا۔ احمد اپنی بیٹیوں کو سینے سے لگاتا۔ چومتا، بوسے دیتا اس سے سکون وقرار مل جاتا۔ کچھ لمحے اندر کی آگ سکون میں بدل جاتی۔ اب علی ہی واحد سہارا تھا جو بڑے بھائی کی میڈیسن اور گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

روبی، احمد کی بہن کا اداس چہرہ ہر وقت اس کی آنکھوں کا مرکز ہوتا۔ ننھی معصوم بھتیجیاں اسے بھی بہت پیاری تھیں۔ گھریلو حالات دیکھ کر علی نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور جاب کرنے لگا۔ شام کو گھر آتے ہوئے گڑیا اور حبیبہ کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا۔

وقت کا پنچھی پرواز کرتا رہا۔ علی نے گھریلو حالات کے پیش نظر اپنا آپ بھلا دیا اور اپنی زندگی، اپنا مستقبل قربان کر دیا۔ تین سال کا عرصہ عذاب، کرب اور رنج و غم میں گزر گیا۔ نورین نے صبر کو مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ ظالموں نے نورین سے اس کے بیٹے بھی چھین لیے تھے۔ نورین کی دنیا صرف اور صرف بھائی کی اولاد تھی۔ جب بھی اسے بچوں کی یاد حد سے زیادہ پریشان کرتی، ننگے پاؤں ان کی طرف دوڑتی۔ کبھی گھر سے باہر کھیلتے ان کو تکتی اور کبھی محلے کی مائی کو چند روپے تھما کر بچوں کو باہر بلواتی اور گلے لگا کر چومتی، ان پر صدقے قربان ہوتی تھی۔ عجیب سا مقدر تھا۔ ایک ماں اپنے بچوں کے لیے تڑپ رہی تھی۔ دوسری ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ نورین اتنا کچھ برداشت کر کے بھی علی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ احمد تو بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ نجانے کس جرم کی سزا مل رہی تھی۔؟

ایمان اتنی بے رحم نکلی کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ کوئی اتنا سنگدل بھی ہوتا ہے؟ عورت تو ہمیشہ رحم دل اور محبت کرنے والی ہوتی ہے۔ یہ کیسی عورت تھی۔۔۔؟ ایمان نے تو عورت کو بدنام کر دیا تھا۔ ایسے محبت کرنے والے شوہر کا خیال تک نہ کیا۔ کتنی سنگدل تھی۔ مریض کو اچھی دوا کے ساتھ ساتھ اچھے ماحول کی، خوشیوں، محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت کے دو میٹھے بول بیماری کو کم کر دیتے ہیں، لیکن احمد کیا کرتا؟

ایک طرف ڈاکٹروں کے نت نئے شگوفے اور دوسری طرف ایمان کا بدلا روپ احمد کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ کسی پروفیسر نے ٹی بی کہا تو کسی سرجن نے کینسر جیسی موذی مرض کا سندیسہ سنایا۔ جہاں جاتے ہزاروں خرچ ہو جاتے۔ مگر کوئی فرق نہ پڑتا۔

احمد کی انتظار میں ڈوبی آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اسے امید تھی کہ کہیں سے ایمان لوٹ آئے گی۔ احمد کے من میں آج بھی ایمان کے لیے محبت، چاہت تھی۔ اسی لیے تو کبھی باتوں باتوں میں علی کو ایمان کے پاس بھیج دیا تھا۔ علی بھابھی کو لینے چلا گیا۔ احمد اپنی بچیوں کے چہروں پر پھیلی اداسی تکتا رہتا۔ نورین چوکھٹ پہ بیٹھی بھائی کا انتظار کرتی رہی۔ رب سے دعائیں مانگتی رہی۔ یا اللہ! اس گھر کی خوشیاں واپس لوٹا دے۔ ایمان واپس آ جائے۔ میرے بھائی کو زندگی بخش دے۔ اسے صحت کاملہ عطا فرما دے۔ آمین ثم آمین!

احمد کی درد سے بھری آنکھیں باہر کے دروازے کی طرف منتظر تھیں۔ جیسے اسے کسی کا شدت سے انتظار تھا۔ ایمان کے آنے کی امید پر، جیسے سانسیں رواں تھیں۔ جب علی اندر داخل ہوا۔ علی کی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ ایمان اس کے ساتھ نہیں آئی۔ شرمائی آنکھیں کہاں راز چھپا سکتی ہیں۔

"ایمان نہیں آئی نا۔۔۔ علی!" احمد نے کمزور سی ڈوبی آواز میں مخاطب کیا۔

"بھائی آپ پریشان نہ ہوں۔ بس آنے ہی والی ہے۔"

لیکن احمد۔۔۔ علی کی چوری پکڑ چکا تھا۔ علی کی آنکھوں میں ناکامی کے آنسو پڑھ لیے تھے۔

"علی! بھائی سے جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

علی کہاں تک چھپاتا۔ آنکھوں نے بغاوت کر دی۔ بھائی کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ جب برداشت نہ کر سکا تو اٹھ کر نورین کے پاس جا بیٹھا۔ نورین سے بھی احوال کہنے لگا۔ جو ان کے ساتھ سلوک ہوا تھا۔

"نورین! جب میں وہاں گیا۔ خالہ اور ایمان گھر میں موجود تھیں۔ میں نے ایمان سے فریاد کی۔ خالہ کے پاؤں پڑا۔ لیکن ان بے رحموں کو رحم نہ آیا۔ اتنے میں سلیمان اور اظہر آ گئے۔ انہوں نے مجھے دھکے دے کر باہر

نکال دیا۔ ہزاروں رنجشیں ہوں، اپنا خون یوں سفید ہو جائے، کسی موت سے کم نہیں ہوتا۔ میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اس طرح مجھے ذلیل وخوار کر کے اپنے گھر سے نکال دیں گے۔ میں تماشا بن کر رہ جاؤں گا۔ ایمان نے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ تمہارے دامن کو داغدار کیا۔ آپ پر بدچلنی کا الزام لگایا۔ ایک بھائی سے کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ مجھے جو مرضی کہہ لیتے مگر تمہاری ذات پر الزام مجھے کہاں برداشت ہوتا۔ لیکن وہ چار اور میں تن تنہا۔ کب تک مقابلہ کرتا؟ سلیمان اور درندے کی طرح ٹوٹ پڑے اور میں زخم کھا کر ناکامی کے آنسو لیے واپس پلٹ آیا۔" ساتھ ہی علی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

علی نماز عصر کی تیاری کر رہا تھا۔ وضو کرتے ہی احمد کے پاس آیا۔ بڑی محبت سے، چاہت سے احمد کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ احمد نے علی کو قریب پایا تو خوشی سے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس مسکراہٹ میں بہت درد تھا۔ کتنی آہیں تھیں، کتنے آنسو تھے۔ محبت کا غم، لفظوں کے زہریلے تیروں نے اسے وقت سے پہلے موت کے حوالے کر دیا۔ احمد علی کی طرف تکلتی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ علی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھا اور اپنی بیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو علی میرے بعد تو ہی ان کا سب کچھ ہے۔ میری بیٹیوں کو بھی تم نہ دینا۔ انہیں خوش رکھنا۔ ان کی یاد نہ آنے پائے۔ میری طرح ان کو نہ ستانے۔

مؤذن اذان دے رہا تھا۔ احمد کے لب ہلنے لگے اور وہ کلمہ شریف کا ورد کرنے لگا۔ اذان ختم ہوئی۔ ساتھ ہی احمد اس دنیا سے کنارہ کر گیا۔ آج ہی تو پرسکون ہو کر سویا تھا۔ ایسی نیند جس میں کوئی درد، کوئی غم، کوئی دکھ نہ تھا۔

نورین احمد سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ننھی معصوم کنزہ، نور صبا، مہک پاپا... پاپا کہہ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ ہر کوئی ماتم کناں تھا۔ ساری برادری، رشتے دار، ہمسائے نم دیدہ تھے۔ دشمن بھی آخری دیدار کرنے آئے تھے۔ دشمن جاناں بھی لوٹ آئی تھی، لیکن اب لوٹ کر آنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جس کو انتظار تھا وہ تو چلا گیا تھا۔

ایمان نے بچیوں کو سینے سے لگانا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ تم کون ہو؟ تم ہماری کیا لگتی ہو؟ ہماری ماں تو تین سال پہلے مر گئی تھی۔ تم تو ہمارے پاپا کی قاتل ہو قاتل۔ نفرت بھری نگاہوں سے ایمان کو تکتی رہی تھیں۔ ایمان بت بنی بیٹھی تھی۔ علی نے بھی منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ ایمان گھر بیٹھے آنسو بہاتی اپنی دنیا میں لوٹ گئی۔

سورج غروب ہوتے ہی احمد کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا۔ اس کی یادیں، اس کی باتیں۔ اس کی محبت آج بھی علی اور نورین کے دلوں میں روز اول کی طرح قائم و دائم ہیں۔ علی نے بہن نورین اور بھتیجیوں کی خاطر شادی نہیں کی۔ اسے بس یہی خوف ہے کہ ایمان کی طرح کوئی اس کی بھی بیوی آ کر گھر نہ خراب کر دے اور میں اپنی بہن اور بھائی کی نشانیوں سے محروم ہو جاؤں اور یہ آنگن پھر سے ویران نہ ہو جائے۔

ایمان نے دوبارہ بعد کسی شہزادے سے شادی رچالی لیکن شادی کے چند روز بعد ہی اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایمان کو دورہ پڑا اور وہ اپنے گھر سے ننگے پاؤں نکل کر بھائی اور احمد کے گھر پہنچ گئی۔ بڑی بیٹی کنزہ اپنی پھوپھی نورین کے ساتھ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ایمان "بیٹی" کہہ کر ان کی طرف بڑھی لیکن کنزہ نے نفرت سے نگاہیں دوسری طرف کر لیں۔ باقی دونوں بیٹیوں نے بھی ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ دیوانوں کی طرح ان سے معافیاں مانگ رہی تھی لیکن بیٹیاں اس سے لاتعلق رہیں۔

شام کو "نیا شہزادہ" اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آن پہنچا اور گھسیٹتا ہوا ساتھ لے گیا۔ جس کے بعد سے ایمان مستقل ذہنی مریضہ بن گئی۔ وہ سوتے سوتے اچانک جاگتی اور بچیوں کو یاد کر کے رونے لگتی۔ نئے شہزادے کے لیے اب وہ اضافی بوجھ بن گئی تھی، جس سے بالآخر اس نے نجات حاصل کر لی۔ بچیوں نے پھوپھی اور چچا کی منت سماجت کے بعد ماں کو قبول تو کر لیا لیکن دل سے نہیں صرف اپنا مذہبی فریضہ جان کر اور یہی بات ایمان کی زندگی کا روگ بن گئی۔ آج کل وہ احمد والی بیماری کا شکار ہے اور بستر مرگ پر احمد کے پاس جانے کا انتظار اس آس میں کر رہی ہے کہ شاید احمد کی روح اسے معاف کر دے۔

☆......☆

دیارِ غیر سے زندگی کی تصویریں

پھولوں سے مہکتی کہانی

مکافاتِ عمل

تاشفین خان تاشی

بیٹوں کے گھر اجاڑنے والی محبت سے عاری ایک ماں کی داستانِ الم

"اماں میں تم سے کہتے کہتے تھک گیا تھا کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گا، نہیں کروں گا لیکن تمہیں تو بیٹے کا سہرا دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ تم کیا سمجھتی تھیں کہ میں مستقل سہرا باندھے بیٹھا رہوں گا۔ اب دیکھ لو جا کے سہرا دوسرے کمرے میں کیل پر ٹنگا ہوا ہے۔" کاشف غصے میں اپنی ماں اور بہن سے مخاطب ہوا۔

"جانے کیا ہے جادو ہے کمبخت، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اپنی سسرال کیوں نہیں گیا الٹا خود بن گیا اور غصہ ہمارے اوپر اتار رہا ہے۔"

"اماں! میں گھر داماد بنتا؟ اور کیا بنتا؟ خالدہ کو تم لوگوں نے جان سے مارنے میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ اگر میں آج اپنے وقت سے پہلے گھر نہ آ جاتا تو خالدہ تو جان سے گئی تھی اور تم لوگ جیل میں ہوتے۔ غضب خدا کا اس کے سر میں پیچھے سے آ کر ڈنڈا مار کر سر پھاڑ دیا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے خالدہ کو اس گھر میں آئے ہوئے اور تم دونوں نے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اماں اگر ہماری بہن کے ساتھ اس کے سسرال میں یہ سلوک ہو تو تمہارا دل کیا کہے گا؟ اور خالدہ کا تو باپ بھی نہیں ہے اس دنیا میں۔" کاشف ایک دم بولتا چلا گیا۔

"تو اپنی بیوی کے لیے ہمیں کوس رہا ہے بے شرم! شرم تم کو نہیں آ رہی ہے، بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ دیکھو کیسے چپ چاپ بیٹے کی بدتمیزی برداشت کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ اٹھ کر اس کا منہ بند کریں۔" اماں غصے سے سراج علی کی جانب مخاطب ہو گئیں۔

"ارے بھئی اس نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔" سراج علی بڑے اطمینان سے بولے۔

"تم نے ہمیشہ غلط بات کو ٹھیک ہی کہا ہے۔ تم نے دونوں بیٹوں کو بگاڑ کر رکھ دیا۔" اماں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اماں تم تو بولتی ایسا ہو کہ اچھا خاصا آدمی پاگل ہو جائے۔ ابا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔" کاشف ابا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"چپ بے......" سراج علی ایک دم بولے۔ "اپنے جھگڑے میں مجھے مت گھسیٹ۔"

"بھائی آپ بھابی کو گھر لے آئیں، گھر داماد بننا اچھی بات نہیں ہے۔" اس کی بہن زبیدہ سمجھانے والے انداز سے بولی۔

"تو چپ ہو جا زبیدہ، تیری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تجھے کیا پتا گھر داماد کیا ہوتا ہے؟ میں ماں باپ کا گھر

چھوڑ کر خالدہ کے گھر رہنے لگا تو گھر والا بن گیا اور اگر خالدہ اپنی اماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئی نا تو اماں اسے گھر بہو کہنے لگیں گی۔" کاشف یہ کہہ کر اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"تجھے اس دو ٹکے کی لڑکی نے کر دیا ہے پاگل۔" اماں بولیں۔

"اگر وہ دو ٹکے کی ہوتی تو وہ اتنا بڑا دل نہیں رکھتی۔ اس کی بڑائی دیکھو کہ اب بھی وہ یہ کہتی ہے کہ اگر اماں آ کر مجھے لے جائیں تو میں چلی جاؤں گی۔" کاشف نے انکشاف کیا۔

"میری جاتی ہے جوتی۔ اس کا نکاح ہوا ہے تیرے ساتھ، میرے ساتھ نہیں ہوا۔ اس سے کہنا میں مرتے مر جاؤں گی لیکن اسے کبھی نہ لاؤں گی۔ ہاں تو اگر اسے لانا چاہتا ہے تو بے شک لے آ لیکن میں نہیں جانے کی اس کے گھر۔" اماں بڑے یقین سے گرجیں۔

"اماں تمہارا نکاح جس سے ہوا ہے وہ کون سا سکھی ہے۔ میں اسے یہاں خود بھی لے کر نہیں آؤں گا۔ میں وہاں بہت خوش ہوں۔ تم سب کو کیا اعتراض ہے۔" کاشف نے حتمی فیصلے کے انداز میں کہا۔

"ہم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں، تیری جو مرضی میں آئے وہ کر۔" اماں غصے سے بولیں۔

"اماں میں خالدہ کے گھر رہنے کے باوجود بھی وقت نکال کر تم لوگوں سے ملنے روز آتا ہوں، کیا یہ میری محبت کا ثبوت نہیں ہے؟" کاشف نے کہا۔

"بس رہنے دے تو اپنی محبت۔ اگر تجھے محبت ہوتی تو یوں گھر چھوڑ کر کیوں چلا جاتا؟ رہ گئی بات خالدہ کی، تو زبیدہ تو تیج بنا، ہم نے خالدہ کو بے قصور تو نہیں مارا تھا۔ وہ بیٹھی آرام سے کپڑے دھو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ خالدہ ابا کا حقہ تازہ کر دے تو مجھے جواب دے گئی۔

"تم خود ابا کا حقہ تازہ کر دو اماں میں کپڑے دھو رہی ہوں۔" اماں خالدہ کی نقل اتارتے ہوئے بولیں۔

"بس اماں بس...... خدا کے واسطے بس کرو، اگر میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جاتا ہوں۔ تو سکون سے بیٹھ یا کرو تاکہ ابا سے بھی دو چار باتیں کر سکوں۔" کاشف نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"جا کر لے تو ابا سے باتیں، دونوں جیسے کے تیسے جو ہوئے۔" اور کاشف اماں کی شعلہ بیانی سنتے ہوئے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔



اوپر کھڑکی میں کھڑی شاہدہ جو ان کی کرایہ دار تھی، ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اس بحث کو ختم کرانے کے لیے وہیں سے بولی۔

"کاشف ٹھیک کہہ رہا ہے اماں، خالدہ کو جا کر لے آئیں، گھر میں رونق ہو جائے گی۔" اماں حیران ہو کر اوپر کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے غصے سے بولیں۔

"بڑی آئی خالدہ کی چہیتی۔ اسے میں کہتی ہوں تو اپنے گھر کا سارا کام کاج چھوڑ کے چھپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہی ہے؟ تیرے بھی لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔ میاں مل گیا ہے سیدھا سادا اور سادہ سے ہیں، ورنہ مزا چکھا دیتی کھڑکی میں کھڑے ہونے کا۔ چل جا یہاں سے اپنا کام کر۔" اماں کی بات ختم ہوتے ہی سراج علی بولے۔

"بیٹی شاہدہ تو اپنی ماں کو کوئی مفید مشورہ دے رہی ہے کیونکہ اچھا مشورہ اس کے لیے زہر قاتل ہے۔" اور پھر شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر لی۔

"تم سے جتنا ہو مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر لو۔" اماں نے تنک کر کہا اور سبزی کاٹنے میں مصروف ہو گئیں۔

جٹی آبادی کے گھروں میں ایک گھر سراج علی کا بھی تھا لیکن اب وہ جٹی آبادی نہ تھی بلکہ اچھی خاصی ترقی ہو گئی تھی۔ مکان زیادہ تر پکے اور اچھے بن چکے تھے۔ سراج علی کا مکان پکا بن چکا تھا اور ان کی ملازمت کے دوران ذاتی استعمال ہو چکا تھا۔ وہ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں ہیڈ کلرک کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اپنے دنوں میں اچھا خاصا کمایا تھا۔ انہوں نے اور اب ہر ماہ ملنے والی پنشن اور گھر کے اوپر والے حصے کا کرایہ ان کے لیے کافی تھا۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں بیٹے بھی ان کی تھوڑی بہت مالی امداد کرتے تھے۔

بڑا بیٹا دانش ایک مالی اسکول میں ٹیچر تھا اور چھوٹا بیٹا کاشف ایک پرائیویٹ بینک میں کلرک تھا۔ مالی طور پر تو وہ مطمئن تھے لیکن گھریلو پریشانیاں انہیں ہمیشہ سے لاحق رہتی تھیں۔ ان کی بیوی شمشاد بیگم زبان کی بہت تیز طرار تھی۔ بات بے بات اور ہر وقت اس کا کام بولتے رہنا تھا۔ وہ ہر وقت جلی کٹی باتیں کرنا یا کسی نہ کسی بات پر کسی سے لڑتے رہنا ہی اس کا مقصد حیات تھا۔ سراج علی کے بڑے بیٹے دانش کی جب شادی ہوئی تو تنہائی صرف ایک آدھ ہفتہ ٹھیک گئی۔ کئی بار مار کھلی اور روز گالیاں سن کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس لیے اس نے دانش سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کر دیا تھا دوسری صورت میں اپنے ماں باپ کے گھر چلے جانے کی دھمکی دے ڈالی تھی اور پھر سراج علی نے ایک دن دانش سے کہا "چونکہ تمہاری ماں کے ہاتھ اور زبان اس کے کنٹرول میں نہیں ہیں اور تمہاری بھی زبان سے کبھی کوئی ایسا جملہ ماں کی شان کے خلاف نکل گیا تو تمہاری آخرت خراب ہو جائے گی اور اس سلسلے میں میں بھی تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر تم سلمیٰ اور اپنے بچوں کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا مکان لے کر وہاں شفٹ ہو جاؤ۔ ہو سکتا ہے اللہ کوئی کرشمہ دکھا دے اور تمہاری ماں ٹھیک ہو جائے تو ہم پھر ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔" ابا کا مشورہ دانش کو اچھا لگا اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں گھر سے تھوڑے فاصلے پر کرائے کے ایک مکان میں شفٹ ہو گیا۔ گھر سے جاتے وقت سلمیٰ کو وہ کوسنے سننے کو ملے جو کبھی کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔ اماں کے نزدیک سارے فساد کی جڑ سلمیٰ تھی جس نے ماں کو بیٹے سے جدا کر دیا تھا۔

جب سے دانش گھر سے علیحدہ ہوا تھا اماں نے کاشف کو شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا لیکن چونکہ وہ بڑے بھائی دانش اور بھابی سلمیٰ کا انجام دیکھ چکا تھا اور وہ ماں کی فطرت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا اس لیے اپنی شادی سے پہلو تہی کیے جا رہا تھا۔

دفتر میں دوپہر کھانے کے وقفے کے دوران عمران جو کاشف کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتا تھا اور ان کی ایک ہی گلی میں رہائش تھی، کاشف سے کہنے لگا۔

"یار کاشف مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں تیرے پاس آ جاؤں یا تو میرے پاس آ جا۔"

کاشف نے عمران کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں لنچ کر چکا ہوں اور وہ باخالی پڑا ہے۔''

''ابے لنچ کی کون بات کر رہا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے عمران اپنی سیٹ سے اٹھ کر کاشف کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''عمران آج مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کس بات کی تجھے خوشی ہو رہی ہے۔ میں بھی تو سنوں۔'' عمران نے پوچھا۔

''بھائی مجھے خوشی اس بات کی ہو رہی ہے کہ تو بھی کوئی ضروری بات کر لیتا ہے۔'' کاشف نے کہا۔

''ابے بکواس مت کر۔ اس وقت میں بہت سنجیدہ بات کرنے لگا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''اچھا بتا کیا بات ہے؟'' کاشف نے پوچھا۔

''وہ اپنے محلے کے آخر میں خالہ صفراں رہتی ہیں نا، میری بیوی رضیہ ان سے ہی کپڑے سلواتی ہے۔ عمران کی بات ابھی جاری تھی کہ کاشف اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ابے یہ کون سی خاص بات ہے۔ بھابی رضیہ ہی کیا پورے محلے کی عورتیں ان سے کپڑے سلواتی ہیں، بلکہ شادی بیاہ کے کپڑے بھی خالہ صفراں ہی سیتی ہیں۔''

''ابے چپ تو کر، پہلے میری بات سن تو سہی۔ بات یہ ہے، رضیہ کہہ رہی تھی کہ خالہ صفراں کو اپنی بیٹی خالدہ کی شادی کی فکر ہے۔ محلے کی سب ہی عورتیں خالدہ کی تعریف کرتی ہیں۔ بہت خوبصورت اور سلجھی لڑکی ہے، سارا محلہ خالہ صفراں کی بہت عزت کرتا ہے۔ جب سے وہ بیوہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے بہت محنت مشقت اور ایمانداری سے سب کے دلوں میں اپنا گھر بنایا ہے۔ رضیہ بتا رہی تھی کہ خالہ صفراں نے خالدہ کو دینے کے لیے جہیز کا بھی بہت اچھا انتظام کیا ہے۔ اس کے علاوہ خالہ صفراں کا مکان بھی اپنا ہے، وہ بھی خالدہ کے نام ہے۔ رضیہ رات کہہ رہی تھی، اگر کاشف رضامند ہو تو اپنی امی کو خالہ صفراں کے گھر رشتے کے لیے بھیج دے۔''

کاشف بہت غور سے عمران کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تو اماں کو میری شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی، اب بھابی رضیہ بھی میرے لیے فکر مند ہو گئی ہیں۔'' عمران بولا۔

''یار بات یہ ہے کہ خالدہ بہت اچھی لڑکی ہے، میٹرک بھی اس نے پچھلے سال کلیئر کر لیا ہے۔''

''یار جس چیز کے بارے میں تجھے پتا نہ ہو اس بارے میں نہ بولا کر۔'' کاشف نے کہا۔

''جس بات کا مجھے پتا نہیں ہے، تو تو مجھے بتا دے۔'' عمران نے سوال کیا۔

''بات یہ ہے۔'' کاشف بولا۔ ''جب تک میری بہن اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی، میں شادی نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ تو دانش بھائی کی شادی کا حشر دیکھ چکا ہے، شادی کے بعد بھابی بہت مشکل سے ایک ماہ گزار پائی تھیں۔ سارا محلہ جانتا ہے کہ اماں ذرا تیز طبیعت کی مالک ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ گزارہ کرنا ہر کسی کا نہیں ہو سکتا۔

اتنے دکھ خالدہ نے پہلے ہی نہیں سہے ہوں گے جتنے دکھ اسے ہمارے گھر آ کر برداشت کرنا ہوں گے۔''

''تجھے کیا پتا۔'' نہ جانے کیا بکواس کیے جا رہا ہے، اچھا ایسا کر شام کو گھر آ جا تیری بھابی تجھ سے بات کرے گی اور اماں سے بھی بات کرے گی۔'' یہ کہہ کر عمران اپنی سیٹ پر واپس چلا گیا۔

کاشف دفتر سے اپنے بڑے بھائی دانش کے گھر چلا گیا، اس لیے ذرا دیر سے گھر پہنچا، بہن نے کھانے کا پوچھا تو کاشف نے بتایا کہ دانش بھائی کے گھر سے کھا کر آیا ہوں۔ ابھی زبیدہ سے بات کر ہی رہا تھا کہ کمرے سے اماں کی آواز سنائی دی، جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔

''کاشف میں نے تیرے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے، اگر تو ہاں کرے تو میں اس کی ماں سے بات کروں، یہ کہتے ہوئے اماں کاشف کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''میں نے کہا نا اماں کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔ ایسا کرو اماں پہلے زبیدہ کی شادی کر دو، پھر میں اپنے

بارے میں سوچوں گا۔" کاشف نے کہا۔

"میرے ساتھ شرطیں لگا رہا ہے؟ یہ تو تیری بہن زبیدہ ہے نا، تیرے ٹکڑوں پر نہیں پل رہی ہے، ابھی خیر سے اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ تو کون ہوتا ہے اس معاملے میں بولنے والا، ابھی تو یہ لڑکیوں سے کھیلتی ہے، ذرا عقل نہیں ہے اس میں، پھر میں اس کے لیے کوئی ایسا گھر دیکھوں گی جہاں یہ ٹھیک رواج کرے۔" اماں بولیں۔ "ٹھیک ہے لیکن میں نے ابھی شادی نہیں کرنی۔" کاشف حتمی فیصلے کے انداز میں بولا۔

"دیکھ بیٹا مجھے تیرا سہرا دیکھنے کی بڑی آرزو ہے، میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں ہی تیرا سہرا دیکھ لوں۔" اماں بڑے پیار سے بولیں۔

"کیا کہا سہرا دیکھنے کی آرزو ہے۔ میرا سہرا عجائبات عالم میں سے کوئی عجوبہ ہے، جسے دیکھنے کی تمہیں آرزو ہے۔ لوگوں کو حج کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ جوان بچی بیاہنے کی آرزو ہوتی ہے۔ پرسکون زندگی گزارنے کی آرزو ہوتی ہے اور تمہیں سہرا دیکھنے کی آرزو ہے۔ اماں میرے حال پر رحم کرو اور میری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔" یہ کہہ کر کاشف دروازے سے باہر نکل گیا اور اماں غصے سے سراج علی سے مخاطب ہو گئیں۔

"تم بھی کچھ بول لیا کرو، کبھی کبھی بولنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"ارے بھئی مجھے بولنے کا موقع دو گی تو ضرور بولوں گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ کاشف شادی سے انکاری نہیں ہے، بس کچھ تم لوگوں کی ماضی میں ہونے والی غلطیوں نے اسے شادی سے بیزار کر دیا ہے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ نہ ہماری عورتیں ماضی سے کچھ سبق حاصل کرتی ہیں اور نہ ہی تم۔ ایک بیٹا تم نے گھر سے الگ کر دیا ہے، اب دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھی ٹھیک کہتا ہے کہ پہلے زبیدہ فارغ ہو جائے خیر سے تیس سے اوپر کی ہو گئی ہے۔" ابھی سراج علی کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ شمشاد بیگم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بس بس ... مجھے معلوم تھا کہ تم باپ بیٹا میری معصوم بچی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ لو دیکھو تو تمہیں تیز بتا رہے ہیں۔ ہم ماں بیٹی تو کسی سے بولتے ہی نہیں۔ ہماری خاموشی پر یہ حال ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے، وہ نظر نہیں آتا۔ تم چپ ہی رہا کرو یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر شمشاد بیگم زبیدہ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ ایک دن سراج علی نے کاشف کو سمجھایا کہ اپنی ضد چھوڑ کر ماں کا کہنا مان لے۔ دانش کو گھر سے علیحدہ کرنے کے بعد وہ ضرور پچھتا رہی ہے، شاید اب وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گی۔ دیکھو نا اگر زبیدہ کی شادی تجھ سے پہلے کر دی گئی تو گھر میں کام کرنے والا کون ہوگا، تیری ماں کی عمر اب زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تیری شادی کے بعد زبیدہ کی شادی بھی جلدی کر دیں گے۔ جا اپنی ماں سے اپنی شادی کے لیے ہاں کہہ دے۔

اتفاق سے اماں نے اپنی خالہ زعفراں کی بیٹی خالدہ کو اپنی بہو بنانے کے لیے منتخب کیا ہوا تھا، شاید رضیہ نے اماں کو قائل کیا ہو۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خالہ زعفراں کی تیاری تو پہلے ہی مکمل تھی، لیکن پھر بھی کچھ تو وقت لگتا ہی ہے، تین ماہ کے اندر اندر خالدہ رخصت ہو کر کاشف کے گھر آ گئی۔

شادی کے تیسرے دن سے ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے تو اماں نے خالدہ سے اس کے مکان کے کاغذات طلب کیے، جس پر کاشف نے اماں کو سمجھایا کہ خالدہ کے مکان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ مکان خالدہ کا ہے اس لیے وہ جانے یا اس کی ماں خالہ زعفراں، تمہیں اس بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

"میری بات سن، مکان خالدہ کے نام ہے اور وہ تیری بیوی ہے، اس ناتے مکان کے کاغذات اور مالکانہ حقوق ہمارے پاس ہونا چاہیے۔ تجھے کسی بات کا پتا نہیں کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔ بس تو چپ رہا کر۔" اماں نے غصے سے کہا۔

"اماں خدا کو مانو، ہمارے پاس خدا کے فضل سے اپنا مکان موجود ہے۔ ہم کسی دوسرے کا حق کیوں لیں۔" کاشف نے کہا۔

"میں کب خالدہ کا مکان بیچ رہی ہوں۔ میں نے تو صرف مکان کے کاغذات لانے کو خالدہ سے کہا تھا۔"

اماں نے اس بات کو ایسے کہا جیسے انہوں نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ کاشف جب بھی دفتر سے گھر آتا اماں اور زبیدہ خالدہ کو گالیوں سے نواز رہی ہوتی تھیں یا اس کو چوٹی سے پکڑ کر مار رہی ہوتی تھیں۔ سراج علی نے بہت سمجھایا کہ دونوں ماں بیٹی اپنی ہٹ دھرمی سے باز آجائیں ورنہ اس کا انجام بہت برا ہوگا، لیکن کسی اچھی بات کو سمجھنا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ وہ دونوں اپنی ڈگر پر قائم رہیں اور ایک دن تو ایک چھوٹی سی بات پر ان لوگوں نے خالدہ کا سر پھاڑ دیا۔ سراج علی بھی گھر میں نہیں تھے، اچانک کاشف دفتر سے اس دن جلدی گھر آگیا اور یہ واقعہ اس کے گھر پہنچنے سے پانچ منٹ پہلے ہوا تھا۔ جب وہ خالدہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو واپس اس گھر میں نہیں لایا، بلکہ اپنا ضروری سامان بھی شام کو خالدہ کے گھر لے گیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے باوجود کاشف اپنی ماں اور باپ سے ملنے تقریباً روزانہ ہی اپنے گھر جاتا تھا، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی اماں اس کو جلی کٹی سنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔

کاشف کو سسرال میں رہتے ہوئے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ عید تہوار کے موقع پر دونوں بھائی اپنی بیویوں کو ماں سے ملوانے گھر لاتے تھے، لیکن اماں اپنی بہوؤں سے بات نہیں کرتی تھیں، ناچار وہ لوگ ملا جلے بنا کر واپس چلے جاتے تھے۔ اماں اپنے دونوں بیٹوں سے کہتی تھیں۔

"میں بہت خوددار قسم کی عورت ہوں۔ جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتی ہوں تو اس پر تمام عمر قائم رہتی ہوں۔ میں نے اپنی کسی بہو کو خود جا کر اس گھر میں نہیں لائی۔" اور کاشف ماں سے کہتا۔

"اماں ہماری مجبوری، ہمیں یہاں لے کر آتی ہے۔" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تیری یہاں سر کھپانے کی کیا مجبوری ہے؟"

"اماں تمہاری جنت ہمارے قدموں میں نہیں ہے، لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہماری جنت تمہارے قدموں میں ہے، اس لیے ہم یہاں حاضری دینے کے لیے مجبور ہیں۔ پتا نہیں اماں تم نے اپنی جنت کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو، کیونکہ ہماری نانی، ہماری پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئی تھیں۔" کاشف نے سنجیدگی سے کہا۔

سراج علی جو سامنے ہی برآمدے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کاشف کی بات سن کر اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولے۔

"جس والدین کی ایسی اولاد ہو وہ بھلا کب زیادہ عرصے زندہ رہ سکتے ہیں۔" ان کا اشارہ شمشاد بیگم کی جانب تھا۔

"میں کہتی ہوں میری زبان مت کھلواؤ۔ اگر میں بول پڑی تو گڑے مردے اکھاڑ کر رکھ دوں گی۔" اماں نے غصے میں کہا۔

کاشف باپ کی نوک جھونک پر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اماں تمہیں مردے اکھاڑنے کی ضرورت نہیں، ابا کو سکون سے اخبار تو پڑھنے دو۔" اماں ابھی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ زبیدہ نے انہیں کچن سے آواز دی اور اماں منہ بناتی ہوئی ادھر چل دیں۔

اماں نے آخر کار ایک جگہ سب کے مشورے سے زبیدہ کا رشتہ طے کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی حیثیت کے مطابق ایک سال کے اندر اس کو رخصت کر دیا۔ زبیدہ کی سسرال شہر میں ایک بڑی ہاتھ کے مارکیٹ تھی۔ اس کے سسرال والے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ زبیدہ کی شادی کے بعد اماں گھر میں تنہائی محسوس کرنے لگیں۔ سراج علی کے اصرار کے باوجود وہ کسی بہو کو بھی گھر لانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ نہ صرف اپنی ضد پر قائم تھیں، بلکہ کاشف کو انہوں نے ایک طلاق دینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "میں تیری شادی بہت دولت مند خاندان میں کروں گی، وہ لوگ راضی ہیں، لیکن وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔" کاشف اماں کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کہنے لگا۔

"اماں خالدہ میرے دو بچوں کی ماں ہے، میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا، آئندہ میں یہ بات نہ ہی سنوں تو بہتر ہے۔"

زبیدہ کی شادی کو بھی چھ ماہ ہو گئے تھے۔ شمشاد بیگم بھی گھر میں تنہائی کی عادی ہو گئی تھیں، لیکن ایک روز اچانک زبیدہ گھر آ گئی اس کے ساتھ اس کا شوہر نہیں تھا۔ اماں کے پوچھنے پر زبیدہ نے بتایا کہ شادی کے بعد

ان کی ساس اور نندیں روزانہ جھڑکتی تھیں اور اپنے بیٹے کی شہ پر اسے مارتی بھی تھیں لیکن آج تو انہوں نے ایک چھوٹی سی بات پر میری بہت پٹائی کی۔" یہ کہہ کر زبیدہ نے روتے ہوئے اپنے جسم پر پڑے نیل دکھائے جہاں خون جم گیا تھا۔ اماں نے زبیدہ کے جسم پر چوٹوں کے نشان دیکھے تو آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود زبان سے کچھ کام کا کوئی جملہ نہیں کہا۔ حیرت انگیز طور پر وہ خاموش تھیں۔ ایک صوفے پر چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہیں اور پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھیں برقع اوڑھا اور گھر سے باہر نکل گئیں اور کچھ دیر بعد وہ خالدہ کے گھر پہنچی خالدہ اور خالہ صغریٰ سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ رہی تھیں۔

خالہ صغریٰ نے شمشاد بیگم سے کہا۔

"ہم نے تو اپنی بیٹی سے رشتہ ختم کر کے تمہاری بیٹی بنا کے بھیجا تھا۔ یہ اب بھی تمہاری ہی بیٹی ہے۔ اگر تمہارے گھر سے خالدہ نکلی واپس آتی تو میں واپس تمہارے گھر بھیج دیتی لیکن یہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی اس لیے مجھے بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ شمشاد بیگم خوشی خوشی خالدہ کو لے کر گھر واپس آ گئیں تو زبیدہ اپنی بھابی کو اماں کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اس کی حیرانی اس وقت دوچند ہوئی جب اماں نے کہا۔

"زبیدہ اپنی بھابی سے میری زیادتیوں کی معافی مانگ۔" اور زبیدہ نے خالدہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔ خالدہ نے زبیدہ کو گلے سے لگا لیا۔

سراج علی یہ سب دیکھ کر شمشاد بیگم سے کہنے لگے۔ "اس گھر میں یہ الٹی گنگا کیسے بہہ گئی ہے؟" شمشاد بیگم نے کہا۔ "کاشف کے ابا یہ گنگا الٹی ہے یا سیدھی لیکن اب یہ اسی طرح بہے گی۔ انشاء اللہ اور شام کو میں دانش اور بڑی بہو کو بھی لے کر آؤں گی، مکان کے اوپر والا حصہ آج کل خالی ہے اب سے کبھی کرائے پر نہیں اٹھاؤں گی۔ وہیں بڑے بیٹے بہو رہیں گے اور اوپر صفائی کروا دوں گی۔"

"واہ بھئی واہ!" سراج علی خوش ہوتے ہوئے بولے۔ "صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" لیکن شمشاد بیگم ان کے جواب میں پہلی مرتبہ خاموش رہیں۔

شام کو کاشف دفتر سے جب گھر آ رہا تھا تو راستے میں اسے ساری صورت حال کی اسے خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے اب اپنے گھر جانے کی بجائے خالہ صغریٰ کے گھر کی جانب موٹر سائیکل کا رخ کر لیا۔ گھر پہنچنے پر خالہ صغریٰ نے اسے بتایا کہ خالدہ کو اماں اپنے گھر لے گئی ہیں۔ کاشف نے کہا۔

"خالہ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے لیکن میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ آج سے پہلے دفتر سے فارغ ہونے کے بعد پہلے میں اپنے گھر والدین سے ملنے جایا کرتا تھا وہاں سے پھر اکثر یہاں آتا تھا۔ آپ بھی مجھ سے میری ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور آج سے میں دفتر سے فارغ ہو کر پہلے یہاں آیا کروں گا پھر اپنے گھر جایا کروں گا۔" خالہ صغریٰ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے تھے۔ انہوں نے کاشف کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دیں۔

ابھی اماں کو دونوں بیٹوں، بہوؤں اور ان کے بچوں کو لائے ہوئے صرف ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اچانک ایک دن زبیدہ کے سسرال والے جن میں ساس، سسر اور زبیدہ کا شوہر بھی شامل تھا زبیدہ کو لینے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے زبیدہ کے والدین اور بھائیوں سے اپنی زیادتیوں کی معافی طلب کی اور زبیدہ اپنے ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں واپس اپنے گھر کی ہو لی۔

اسی شام کاشف اور دانش صحن میں بیٹھے تھے اور اماں نماز کے بعد دعا کے دوران اللہ سے درگزر طلب تھیں۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ محبت اتنی زود اثر ہوتی ہے تو میں اپنے دل کے کسی گوشے میں نفرت کو جگہ نہیں دیتی۔ یا اللہ مجھے معاف فرما دے۔ میں نے جو زیادتیاں بہوؤں سے کی ہیں، میں ان کی معافی تجھ سے طلب کرتی ہوں، بے شک تو معاف کرنے والا رحیم و کریم ہے۔"

☆☆ ☆☆

پردیس سے دوسری کہانی

مقدر کی آگ

عاصمہ الیاس

حاسد ماں کے ستم کی شکار ایک بچی کی عبرت انگیز کہانی

انیلہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس کی وارڈ روب میں کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے مگر ان میں سے کوئی بھی اس کے چہرے کے مطابق نہ تھا، کیوں کہ جلے ہوئے چہرے پر کوئی بھی رنگ مناسب نہیں لگتا، اس لیے وہ رو رہی تھی۔

فہمیدہ بیگم اسے خاموش بھی نہ کرا سکتی تھیں۔ انہیں تو آج کل قدم قدم پر یہ احساس ہوتا تھا کہ جو بویا تھا وہ اب کاٹ رہی ہیں۔ یہ وہی بویا تھا جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے خود اٹھایا تھا۔ اس میں ان کی اپنی بچی گر پڑی تھی۔

فہمیدہ کے سات بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا شاہ میر تھا جو انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر رہا تھا اور آخری سال میں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا بیاہ دھوم دھڑکے کے ساتھ اپنی بھانجی کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں، مگر مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ ذیشان احمد نے اٹھ کر فون اٹھایا تو دوسری طرف نہ جانے کون تھا، جس کو وہ دلاسہ دیتے ہوئے آنے کا کہہ رہے تھے۔ فہمیدہ کو انہوں نے تیار ہونے کا کہا اور اس کو بتایا کہ میرا ایک دوست شدید بیمار ہے، اس سے ملنے جانا ہے۔ فہمیدہ اور ذیشان صاحب اسپتال پہنچے۔ ذیشان احمد

کے اس دوست کا نام کمال تھا۔ اس نے ان کے استقبال کے لیے اٹھنا چاہا تو ذیشان نے اسے لیٹے رہنے کا کہا۔

”تم کیسے ہو، کیا حال ہے تمہارا۔“

”بس یار پہلے سے تھوڑا بہتر ہوں۔ تم سناؤ کیا حال ہے، کیسی بات ہے کہ ہم ایک ہی شہر میں مقیم ہیں مگر ایک دوسرے کے حال سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ تو ڈائری سے تمہارا فون نمبر ملا تو تمہیں بلا سکا ہوں۔“

ذیشان جواباً کچھ نہ بولے۔ اتنی دیر میں کمال نے سونیا کو چائے بنانے کا کہا۔ سونیا نے ذیشان صاحب کو چائے دی تو وہ مسکرا کر بولے۔

”جیتی رہو بیٹا۔ تمہارے والد کی عادت ہے پریشان ہونے کی، اب میں آ گیا ہوں تو پوچھتا ہوں ان سے کہ کیا تکلیف ستا رہی ہے۔“ ذیشان صاحب نے ماحول میں چھائی سنجیدگی کم کی۔ فہمیدہ نے اسے گلے لگا کر تسلی دی۔ ذیشان بولے۔

”میں ادھر کمال کے پاس رہتا ہوں اور تم سونیا کو لے کر گھر جاؤ تاکہ یہ بھی تھوڑا آرام کر لے۔“ فہمیدہ بیگم سونیا کو لے کر چلی گئیں۔

فہمیدہ نے سونیا کو انیلہ سے ملوایا۔ انیلہ مل کر بے حد خوش ہوئی۔ وہ شروع ہی سے بھائیوں کے درمیان پلی



تھی۔ اس کی بیوی نے روز اول ہی کہا تھا کہ ایک بیٹی ہی ہو۔ خوش نما تو سونیا تھی، بہت ذہین، کمال کی وہ تو اکلوتی تھی اور اس کا کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ بس ایک بابا تھے۔ بابا نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ ان کی طبیعت دن بدن گرتی گئی۔ انہیں ایک دن ہلکی سی تکلیف ہوئی جو بڑھتی گئی اور اسی وجہ سے انہیں اسپتال داخل ہونا پڑا تھا۔

☆...☆

ذیشان احمد اکمل کے پاس ہی رک گئے تھے۔ اکمل نے اس خاموشی کو توڑا۔

"ذیشان میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تم میرے اچھے دوست ہو جلد از جلد اس کے لیے کچھ کرو۔ مگر تو میں اسی دن ہی گیا تھا جس دن سونیا کی ماں مجھے چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔ اب تو میں صرف سونیا کے لیے زندہ ہوں، میں ایسا اتنی جلدی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تم فکر نہ کرو اکمل، خدا بہتر کرے گا۔ میں کچھ کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ سونیا وغیرہ آتی ہیں کہ نہیں۔"

دوسرے دن صبح کے وقت ڈاکٹر راؤنڈ پر آئے تو ان کے چہرے پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ سونیا نے ڈاکٹر سے رپورٹس کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر سنجیدگی سے بولے کہ ہم آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ آپ کو کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہیے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

☆...☆

ذیشان کو جلد از جلد کوئی تدبیر نہ سوجھی تو انہوں نے اپنے بیٹے شاہ میر کو بلوا لیا، جبکہ فہمیدہ بیگم راضی نہ تھیں۔

انہیں تین کپڑوں والی بہو نہ چاہیے تھی، بلکہ انہیں تو بہو کے ساتھ آنے والے جہیز کی بھی فکر تھی۔ اس لیے انہوں نے جی بھر کر اس شادی کی مخالفت کی تھی۔ تھوڑی دیر میں شاہ میر بھی آ گیا۔ فہمیدہ بیگم اُسے بیٹھنے کی مہلت دیے بغیر بولیں۔

"بیٹا میں اس لڑکی کو اپنے گھر میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں تانیہ کے ساتھ بیاہنا چاہتی ہوں۔"

"امی پتا تو چلے کہ بات کیا ہے۔"

بیٹا بیٹھو پانی پیو، پھر بات بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے انیلہ کو آواز دی۔

"انیلہ بیٹے پانی پلاؤ بھائی کو۔" انیلہ نے پانی پلایا تو ذیشان بولے کہ بیٹا میں نے بھی مخالفت کی کہ تمہاری شادی تانیہ سے نہ ہو گی اور حقیقتاً تانیہ میں کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ مگر بیٹا! بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست شدید بیمار ہے۔ ڈاکٹرز اتنے پر امید بھی نہیں ہیں اور میں نے اُس سے وعدہ بھی کر لیا ہے۔"

"میری بات مان جاؤ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" شاہ میر نے بابا کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"بابا جان آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"شاہ میر بیٹا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس شہر میں کنواروں کی کمی نہیں ہے، انہیں صرف میرا بیٹا ہی ملا ہے۔"

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہیں سات بیٹے دیے ہیں، باقی چھ پر تم اپنی مرضی چلا لینا۔"

"جب بڑے ہی نہیں مانیں گے تو چھوٹوں کے کیا کہنے۔ خیر میں اور شاہ میر اسپتال جا رہے ہیں اگر تم چلنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" فہمیدہ نہ گئیں۔ اسپتال میں ہی خاموشی سے شاہ میر اور سونیا کا نکاح ہو گیا اور اکمل نے آنکھیں موند لیں۔ سونیا کا حوصلہ جواب دے گیا مگر ذیشان اور شاہ میر اُسے سنبھالے ہوئے تھے۔ دسویں کے بعد جب وہ گھر آئی تو فہمیدہ نے فوراً ٹوکا۔ ضرورت کیا تھی اس گھر میں آنے کی، اچھا ہوتا جو باپ کے ساتھ ہی مر جاتی، مگر ان لوگوں کو تمہیں اپنی بہو نہیں مانتی۔"

"اماں بس کریں۔" شاہ میر بولا۔

"ہاں بیٹے کر لو اب تم بھی میری مخالفت یہ وقت بھی آنا تھا مجھ پر۔" فہمیدہ بولیں۔

☆......☆

"شاہ میر بیٹا تم اپنی ماں کا رویہ اس کے ساتھ دیکھ چکے ہو، اگر ہو سکے تو اُسے ساتھ لے جاؤ۔"

"بابا جان یہ میرا آخری سال ہے، آپ ہی اُس کا خیال رکھیے گا، میں جیسے ہی جاب پر لگ گیا اُسے ساتھ لے جاؤں گا۔ اچھا فی الحال اُس سے مل تو آؤں۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر شاہ میر اندر چلا آیا۔

"سونیا!" شاہ میر نے پکارا۔

"جی۔"

"سر اوپر اٹھاؤ......" سونیا نے سر اوپر اٹھایا۔

"سونیا میں امی کی طرف سے بھی تم سے معافی مانگتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تم اپنے اچھے اخلاق سے اُن کا دل جیت لو گی۔" سونیا بولو گی۔"

"ہاں میں کوشش کروں گی، بشرطیکہ وہ مجھے میرے ظرف سے زیادہ مت آزمائیں۔" اور یوں شاہ میر چلا گیا، اور فہمیدہ کے مظالم میں شدت آ گئی۔

اُس دن وہ برتن دھو رہی تھی کہ انہوں نے اتنی زور سے اُس کا نام پکارا کہ گلاس اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔

"اندھی ہو گیا، نظر نہیں آتا کس قدر قیمتی برتن ہیں خود تو تین کپڑوں میں آ گئی ہو۔ ذرا جو اپنے لائے ہوتے تو احساس ہوتا۔" سونیا کچھ نہ بولی۔

"اُس دن چھٹی تھی۔" وہ فہمیدہ اور ذیشان احمد کو چائے دے کر پلٹنے لگی کہ ذیشان صاحب نے آواز دی۔

"بیٹا کیا مجھ سے ناراض ہو جو مجھ سے دور بھاگتی ہو۔"

"نہیں انکل۔"

"ارے جانے دیں اسے اور بھی بہت سے کام ہیں۔" ذیشان کی بجائے فہمیدہ بولیں اور وہ خاموشی سے چلی آئی۔ شاہ میر بھی اب مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگا لیتا تھا۔

سونیا نے لاکھ رنجش کے باوجود ڈرتے ڈرتے ساس کو یہ خبر سنائی تو وہ بولیں۔ "بیٹا پیدا ہو تو ٹھیک، ورنہ جہاں دل چاہے چلی جانا۔"

مگر قدرت کو سونیا کا مزید امتحان مطلوب تھا کہ حوریہ اس دنیا میں چلی آئی، مگر حوریہ ماں کی نسبت باقی سب کو قبول تھی، کیوں کہ جس دن حوریہ دنیا میں آئی شاہ

پھر کو جاب مل گئی اور انیلہ کی منگنی ہو گئی، مگر حوریہ بھی عجیب تھی۔ اُسے جس کام سے منع کرتے وہ ضد میں آ کر اتنا ہی اُس کام کو زیادہ کرتی۔ کبھی فہمیدہ کے اوپر چڑھ جاتی، کبھی بچوں کی کاپیاں پھاڑ ڈالتی۔ ایک دن فہمیدہ نے پھٹی ہوئی کاپیاں دیکھیں تو حوریہ کو گھسیٹ کر سونیا کے پاس لے گئیں اور بولیں۔

"سنبھالو اِسے۔ بچوں کی کاپیاں پھاڑ ڈالی ہیں، پیسے درختوں پر نہیں لگتے خود تو آ گئی ہو تین کپڑوں میں۔"

کہتے ہیں کہ بے زبان جانور پر بھی ظلم ہوتا ہے تو وہ بھی کاٹ کھاتا ہے اور آج سونیا بول ہی پڑی۔

"اگر میرے باپ نے مجھے کچھ نہیں دیا تو کیا ہوا میں جو سارا دن کاموں میں سر کھپاتی ہوں، شام کو سب بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں تو حساب برابر کر دیتی ہوں۔ نوکرانیاں تو ہزاروں روپے لیتی ہیں اور عزت علیحدہ، مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ سونیا نے کمرے میں داخل ہو کر کنڈی لگا لی۔ فہمیدہ باہر سے بڑبڑا کر چلی گئیں۔ اُس سے اگلے دن سونیا کو بخار ہو گیا اور وہ اُٹھ کر کوئی کام نہ کر سکی۔ انیلہ کے پرچے ہو رہے تھے اس لیے فہمیدہ بیگم خود ہی میدان میں اُتریں۔ سارا دن کام کر کے تھک گئیں۔ جب سونیا کا بخار دوسرے دن بھی نہ اُترا تو فہمیدہ کا بخار بھی دوسرے دن نہ اُترا۔ فہمیدہ اُس کے بخار کی پروا کیے بغیر بولیں۔

"اے بی سن لو، میں شاہ میر کی شادی کر رہی ہوں اپنی بھانجی ثانیہ کے ساتھ اور تم ڈھکوسلے چھوڑو اور کام کرو۔"

سونیا کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی۔ بخار ہوں چال کے کام کرنا شروع ہو گئی۔ دن کا ایک بجا تھا دروازے پر دستک ہوئی۔ انیلہ دروازے پر گئی تو شاہ میر تھا۔ انیلہ نے سلام دعا کی اور بھائی کو اندر لے گئی۔ بھائی کے اچانک آنے پر سب ہی خوش تھے۔ سونیا نے شاہ میر کا پسندیدہ رنگ کا سوٹ پہنا، لپ اسٹک لگائی اور جوس دینے چلی گئی۔ شاہ میر دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ جوس کے بہانے ہاتھ بھی ساتھ ہی پکڑ لیے، مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔

"ارے، تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔"

"ارے رہنے دو میں نے صبح گولیاں دی تھیں، تیز بخار ہے آہستہ آہستہ ہی اُترے گا۔" فہمیدہ بیگم بولیں۔

"سونیا کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔"

"نہیں۔" سونیا نے جواب دیا۔

شاہ میر ماں پر غصیلی نظر ڈال کر سونیا کو گھسیٹتے ہوئے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے سونیا کو دوا دی اور مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا۔ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے تو امی کی کسی بات کے جواب میں شاہ میر بولا کہ اگلی مرتبہ یہ تمہارے ساتھ نہ جائے گی، بلکہ میں تمہارا بیاہ ثانیہ کے ساتھ کراؤں گی۔ یہ اس گھر کی نوکرانی ہے اور نوکرانی ہی رہے گی۔ فہمیدہ بیگم کہہ کر چلی گئیں۔ سونیا نے حوریہ کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ شاہ میر سونیا کو کمرے میں لے آیا اور حوریہ کو اس سے لیتے ہوئے بولا۔

"سونیا تم نے میرے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کا بُرا نہ منایا کرو، چلو اب آنسو پونچھو یا میں خود ہی صاف کرتا ہوں۔" شاہ میر حوریہ سامنے ہے۔ سونیا بولی، ہائے بچوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے شاہ میر حوریہ کو گدگداتے ہوئے بولا، یوں ہی ہنستے بولتے تین دن گزر گئے اور شاہ میر کے جانے کا وقت آ گیا۔ تیار ہو کر وہ جانے لگا تو سونیا کے چہرے پر نظریں ٹکا کر بولا۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں پاس بٹھا کر دیکھتا رہوں۔"

"اگلی مرتبہ آئیں گے تو پھر زیادہ دنوں کے لیے آئے گا۔" سونیا بولی۔

"انسان کے تو لمحے کو پتا نہیں ہوتا، پھر کیا پتا کہ میں دوبارہ آؤں یا نہیں۔"

"اللہ نہ کرے سونیا ڈر کر بولی۔"

شاہ میر نے حوریہ کو پیار کیا سونیا کو خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

فہمیدہ نے شاہ میر کے جاتے ہی ایک ہفتے بعد اپنے شیطانی پروگرام پر عمل کر ڈالا۔ اُس دن سب سو رہے تھے۔ سونیا نے حوریہ کے لیے دودھ گرم کرنا چاہا کہ چولہے میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی، مگر وہ چولہے کو آگ دکھا چکی تھی۔ آگ ہی آگ ہر سو پھیل گئی۔ سونیا نے باہر کی طرف بھاگنا چاہا تو باہر سے کنڈی بند تھی۔ جب فہمیدہ کو یقین ہو گیا تو انہوں نے آہستگی سے کنڈی کھولتے ہوئے شور مچا دیا۔

"سونیا جل گئی، سونیا کو بچاؤ۔ سونیا نے جان دے دی، سونیا مر گئی۔"

فہمیدہ دھاڑیں مار مار کر روئے جا رہی تھی۔

"ہائے میں کیوں مارکیٹ گئی تھی۔ ہائے کاش مجھے پتا ہوتا کہ میرے آنے تک یہ سب کچھ ہو جائے گا تو میں کبھی نہ جاتی۔" شاہ میر بھی آ چکا تھا وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ ایک لفظ نہ بولتا یا پھر حوریہ کو سینے سے لگا کر روتا رہتا۔ کچھ دن کے بعد شاہ میر دوبارہ چلا گیا۔ چھ ماہ بعد فہمیدہ نے اسے دوبارہ بلوایا اور بڑی لگاوٹ سے بولیں۔

"بیٹا، سونیا کے مرنے کا مجھے بھی بہت افسوس ہے، مگر بیٹا مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا نا، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اپنا گھر بساؤ۔ میں نے بات کی ہے ثانیہ کی ماں سے وہ راضی ہے اور۔"

"بس کریں امی بس کریں۔ لوگ بھول سکتے ہیں اسے مگر میں نہیں۔ سونیا کو آپ نے مار ڈالا ہے۔ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ میں ماں کا نافرمان ہوں اس لیے خاموش ہوں اور لے آئیے آپ ثانیہ کو۔"

فہمیدہ نے شاہ میر کی شادی ثانیہ سے کر دی۔ شاہ میر نے ثانیہ سے کہا۔

"تم میری بیوی تب تک ہو، جب تک حوریہ سے اچھا سلوک کرو گی، ورنہ آگے تمہاری مرضی ہے۔"

حوریہ کو شاہ میر نے ہاسٹل میں داخل کروا دیا تھا اور وہ صرف چھٹیوں میں گھر آتی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے شاہ میر کے باقی بھائیوں کی بھی شادیاں ہو گئیں اور ثانیہ تین بیٹیوں کی ماں بن گئی۔

ثانیہ گھر میں تنگ کرنے لگی تھی۔ آج بھی جب وہ گھر پر نہ تھی تو فہمیدہ نے شاہ میر سے شکایت لگا دی۔ شاہ میر بولا۔ "آپ کو تو سونیا بھی ناپسند تھی، اب ثانیہ پسند نہیں تو کوئی بات نہیں کوئی اور کوئی بتا دیں، میں اُس سے شادی کر لیتا ہوں۔ آپ کو تو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ حوریہ صرف چھٹیوں میں یہاں آتی تھی۔ اب تو وہ بڑی ہو گئی ہے اور چھٹیوں میں بھی نہیں آتی ہے۔ مجھے تو بیٹیاں پسند ہیں، باپ کی بات بغیر کہے سمجھ لینے والی۔ ہمارے خاندان میں تو بیٹیاں پہلے ہی خال خال ہیں، اب تو بالکل بھی نہیں ہیں۔"

فہمیدہ بیگم پشیمان تو پہلے ہی تھیں، مگر آج بیٹے نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

اُس دن انیلہ دو بچوں کے ساتھ گھر آ گئی۔ فہمیدہ کے پوچھنے پر انیلہ نے بتایا کہ آج حماد نے گھر آئے مہمانوں کے سامنے میری بے عزتی کر ڈالی۔ اب میں اُس گھر میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ رات کو حماد اُسے لینے بھی آیا مگر وہ ضد میں آئی بیٹھی تھی، اڑ گئی۔ دوسرے دن دروازے پر دستک ہوئی۔ انیلہ دروازہ کھولنے گئی اور ذرا سی دیر میں انیلہ کی چیخوں سے در و دیوار لرزنے لگے۔ فہمیدہ بھی باہر آ گئیں، دو لڑکے جن میں ایک حماد تھا، بھاگ گئے۔ انیلہ کو اسپتال لے جایا گیا، مگر تیزاب اپنا کام دکھا چکا تھا۔ انیلہ آئینہ دیکھ کر چیخنے لگتی۔ ایک دن فہمیدہ اکیلی بیٹھی تھی کہ انیلہ آ گئی اور وہ بیٹھتے ہی بولی۔

"امی والدین کے کیے کی سزا بچوں کو کیوں ملتی ہے۔ آپ نے سونیا کو ایک مرتبہ میں مار ڈالا مگر میں تو پل پل جیتی مرتی ہوں۔ میں بال بنا کر آئینہ نہیں دیکھ سکتی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا تمام سامان ہے، مگر ادھورے چہرے کے لیے نکمی۔"

جمیل بولا۔ "ماں کتنا اچھا ہوتا اگر حوریہ ہاسٹل کی بجائے گھر میں ہوتی۔ ہر بات میں مجھ سے لڑتی، مجھ سے پوچھتی، ذرا دیر ہو جانے پر کہتی۔ میں بابا کو بتاؤں گی۔ تو آپ اُسے یہیں لے آئیے نا۔"

شاہ میر نہ جانے کب کے آئے تھے، بولے۔

"امی جی میں حوریہ کی شادی طے کر چکا ہوں، فی الحال میں اسے گھر بلا رہا ہوں۔ اُسے کچھ ماہ بعد یہیں سے رخصت کروں گا۔"

حوریہ کے آنے پر فہمیدہ نے آتے ہی اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر رونا شروع کر دیا اور ساری کہانی سنا کر معافی مانگی اور حوریہ نے معاف بھی کر دیا، مگر انیلہ جب بھی حوریہ کے چہرے پر نظر ڈالتی تو اُداس ہو جاتی پھر فہمیدہ بیگم سوچتیں کہ میں نے سونیا کو آگ لگائی، جس نے سونیا کو جلا ڈالا، مگر کہتے ہیں کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ سونیا کو لگائی جانے والی آگ نے ردعمل کے طور پر انیلہ کے مقدر جلا ڈالے اور فہمیدہ انیلہ کے مقدر کی آگ دیکھ کر اپنے ضمیر کی عدالت میں پل پل کا حساب دے رہی ہے۔

ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے انسان
کچھ لوگوں کو مقدر بھی جلا ڈالتے ہیں

☆.....☆

پردیس سے تیسری کہانی

ایک حقیقت ایک کہانی

عائشہ صدیقہ ضمیر

محبت کی پیاس میں بھٹکتی ایک روح کی کہانی جو اپنی ہی آگ میں جل اٹھی

بوڑھے چوکیدار نے جھرجھری لے کر جواب دیا۔ بابا کس کی ہمت ہے جو اس کوارٹر میں رہے۔ اب تو ارشد میاں کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ بابا کچھ بتاؤ گے یا یونہی پہیلیاں بجھاتے رہو گے۔

بوڑھے نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں پہ پتلیاں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ کیا کرو گے میاں اس واقعے کو سن کر۔ رات کی نیند بھی حرام ہو جائے گی۔ پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اللہ رحم کرے۔ بڑی اچھی تھی مگر انجام برا ہوا۔ سچ ہے کہ ہر وقت ضد سے تو یہ زندگی جل جاتی ہے۔ یہ کہہ کر بابا کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ہاں بابا کچھ تو بتاؤ۔" ارشد نے کہا۔

"اچھا بتاتا ہوں۔ اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنو۔"

اس کوارٹر میں کوئی کیوں نہیں رہتا۔ میں جو کہہ رہا ہوں بالکل سچ ہے اور مجھے جھوٹ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ارشد نے اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پایا۔ اتنا تو اسے بہر حال اندازہ ہو گیا تھا کہ بڈھا سنکی آدمی ہے اور کیا تجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت۔ ہاں تو بابا کیا ہوا؟

بوڑھا چوکیدار کہنے سے پہلے کھانسا، پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور حقے کا ایک لمبا کش لگایا اور یوں گویا ہوا۔

ہاں تو صاحب آج سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے کہ اس کوارٹر میں ایک رجپوت نیتش پال جی آ کر رہا۔ اس کی بیوی بہت خوب صورت تھی۔ دونوں میاں بیوی کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ تھوڑے دنوں میں ہی محلے والے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ دائیں طرف والے کوارٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔ اس میں ظہیر صاحب رہتے تھے۔ وہ بڑے اچھے اور کھرے آدمی تھے، پھر نہ جانے کس بات پر نیتش اور بابو ظہیر حسین میں نااتفاقی ہو گئی۔ انہی دنوں میں بابو ظہیر کے گھر کوئی تقریب ہوئی، بابو ظہیر نے نیتش پال کو بھی دعوت دی اور کہا ہم ایک جگہ رہتے ہیں اور تم میرے ہمسائے ہو لہٰذا میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔ تم اس تقریب میں ضرور آنا اور بھابی کو بھی بھیجنا۔ سب محلے کی عورتیں بھی شریک ہوئیں، لیکن نیتش پال کی بیوی نہ آئی۔ ظہیر اور اس کی بیوی نے بہت کہا مگر وہ نہ مانا۔ لیکن نیتش کی بیوی کا دل چاہ رہا تھا اس تقریب میں آنے کا لیکن وہ نیتش کی ضد کے آگے مجبور تھی۔

اس نے سوچا کہ جب نیتش چلا جائے گا۔ تب ہی جانا ممکن ہو گا مگر پال اس کے ارادے کو بھانپ گیا۔

وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ ظہیر بابو کے گھر نہ جانا، میری اس سے لڑائی ہے۔ اگر وہاں تم گئیں تو مجھ سے برا

کوئی نہ ہوگا۔ اس نے کہا۔

"نہیں جاؤں گی۔" نتیش پال مطمئن ہو کر دفتر چلا گیا۔ ادھر اس کی بیوی جھٹ پٹ تیار ہو کر ظہیر بابو کے گھر چلی گئی۔ سب عورتیں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، ظہیر کی بیوی بولی۔

"تمہارے بغیر محفل میں رونق کہاں۔"

"اگر ایسی بات تھی تو اپنے پتی دیو سے کہتی وہ ہاں کر دیتا۔" اس نے کہا۔

"وہ تو منع کر گئے تھے پر میرا دل نہیں مانا اس لیے چلی آئی۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "ظہیر نے تو نتیش بھیا کو بہت کہا پر وہ مانے ہی نہیں۔ خیر اب آ گئی ہو تو دل خوش ہو گیا۔"

"اور کیا جانکی بھی آئے گی محبت کی ماری۔ ارے تم کیوں فکر کرتی ہو جب تمہارے یہاں کوئی خوشی ہوگی تو ہم بن بلائے ہی آ جائیں گے اور نتیش بھیا کو منا لیں گے۔" سلمیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نتیش کے گھر آنے سے پہلے ہی چلی جاؤں گی۔" اس نے کہا۔



کافی دیر تک عورتوں میں ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ بعض بے تکلف عورتیں چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ یہ کہہ کر بوڑھے نے حقے کا ایک کش لگایا اور چلم کو درست کر کے پھونک ماری، پھر بولا۔

جب عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو جائز ناجائز کا فرق مٹ جاتا ہے۔ بس یہی کچھ وہاں ہوا۔ محلے والے گانے ناچنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پر اس وقت بہت سی عورتیں ناچنے گانے لگیں۔ نتیش کی بیوی بھی ناچنا جانتی تھی۔ جب سب نے اس سے کہا تو وہ جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی، بس۔۔۔ پھر کیا۔۔۔ شروع ہو گئی۔ اس نے ناچ بھی ڈانس سیکھا تھا، پھر ہندوؤں میں ویسے بھی اس کا رواج ہے۔ ہولی، دیوالی، شادی بیاہ میں یہ سب ناچ رنگ میں حصہ لیتی ہیں۔

نتیش پال مطمئن نہیں تھا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کو تقریبات میں جانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ظہیر بابو کی بیوی اس کی سہیلی بھی تھی، اس لیے وہ درمیان میں ہی گھر لوٹ آیا تو دیکھا گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ اسے تو غصہ ہی چڑھ گیا۔ وہ فوراً ادھر آیا اور بچوں

سے پوچھا کہ تمہاری چاچی ادھر آئی ہے۔ تبھی وہ سب بھاگے بھاگے آئے۔

"چاچی چاچا بازار گئے ہیں۔" اس کا تو چہرے کی رنگت سفید پڑ گیا مگر پھر بھی وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

"لو بھئی ہم تو چلے" اور پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈرامائی انداز میں سب کو الوداع کہا۔

"اگر پال جلدی چلا گیا تو ہم پھر آ کر شامل ہو جائیں گے۔"

عورتوں نے اسے دروازے تک پہنچایا۔ سلمیٰ نے اس سے احتیاطاً کہا۔

"ارے تو کہے تو میں چلوں تیرے ساتھ، میں پال سے کہہ دوں گی کہ میں اسے زبردستی لے گئی تھی۔"

"نا ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کچھ بھول گئے ہوں گے ورنہ اتنی جلدی نہ آتے۔" اس کا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش تھی اور ساری عورتیں بھی اپنے دلوں میں ڈر رہی تھیں۔

ادھر اس کے جانے سے پوری محفل اداس ہو گئی۔

آخر کیا ہونے والا ہے؟ سب کے منہ سے ایک دم نکلا۔

بہت دیر تک عورتیں بے حس و حرکت کھڑی رہیں، پھر رفتہ رفتہ معمول پر آ گئیں۔

ادھر جب وہ گھر پہنچی تو وہ غصے میں بھرا ٹہل رہا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی گرج کر بولا۔

"کیوں سوزی بیگم، میں نے تجھے منع کیا تھا نا پھر بھی تو چلی گئی۔ تو وہاں کس کی اجازت سے گئی؟"

وہ خاموش رہی۔ اسے پال کا انداز تخاطب بہت برا لگا تھا۔ اتنے میں جیمس پال نے اس کے پھول سے رخسار پر ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔

"جائے گی اب؟" بس پھر کیا تھا، راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔ وہ کہاں تو چپ تھی۔ کہاں ایک دم پوری قوت سے چیخی.....

"جاؤں گی۔ ہزار بار جاؤں گی، میں کسی کی غلام نہیں ہوں۔"

"اچھا دیکھوں گا!"

پال نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ پال اسے سخت برا بھلا کہہ کر واپس دفتر چلا گیا۔ وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اس کا غصہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا تھا۔ وہ پورے گھر میں چکر لگاتی رہی، پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

"ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ بجا کہا، آؤ عورت غصے میں عقل کھو بیٹھتی ہے۔ صاحب عورت کا انتقام بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کم سے کم میں تو اس حقیقت کو مان گیا ہوں، بلکہ اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔" بوڑھے چوکیدار نے کہا۔

پھر کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد لوگ جیمس پال کے گھر کی طرف دوڑ پڑے، کیونکہ اس کے گھر سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ دروازہ توڑا گیا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ آخر لوگ بڑی مشکل سے اندر پہنچے۔ ان میں سے میں بھی ایک تھا۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ آگ اندر کمرے میں لگی ہے۔ اس کو آواز دی گئی، دروازہ توڑا گیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آگ برابر بڑھ رہی تھی۔ دھواں ساری بستی پر محیط ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خونی اژدہا بل کھا رہا ہو۔ بستی اس سے ڈھکی ہوئی۔ پھر آگ بجھانے کی [illegible] آخر بڑی جدوجہد کے بعد وہ آگ پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکے۔

تب لوگوں نے گھر کا سارا سامان اٹھا کر کے اس پال کی بیوی بے ہوش پڑی جل رہی تھی۔ آگ کے مہیب و خوفناک شعلے لپک لپک کر بالآخر اس کے مرمریں جسم کو اپنی آغوش میں یوں لے رہے تھے جیسے [illegible]۔ اتنے میں لوگوں نے پال کو خبر کر دی، وہ بھاگم بھاگ چلا آیا۔

"آہ..... یہ کیا ہو گیا دوستو!" سب نے پال کی تباہی دیکھ کر انجام پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

جلتے ہوئے جسم کو ریت میں ڈال کر کمبل لپیٹ دیا گیا۔ ہر شخص امید و بیم کی حالت میں تھا کہ شاید بچ جائے اور یہ بھی کوئی نیکی کام آ جائے یا شاید ہم کو [illegible] قبول ہو جائے لیکن؟

[illegible] کی عجب حالت تھی۔ [illegible] یہ کیا ہو گیا۔ [illegible] جیمس پال [illegible] معلوم تھا [illegible] کیوں اس نے اپنے آپ کو جلایا [illegible] تھا کہ اس نے [illegible] کی [illegible] بھی معلوم تھی۔

[illegible] پال ایک ایک سے [illegible] پوچھ رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہو گیا؟ [illegible]

ہے۔ میری بینا بھی نہیں جل سکتی۔"

لوگ اسے قریبی اسپتال لے گئے، بڑی کوشش کے بعد اسے ہوش آیا مگر کیسے!؟ وہ ایک طرف سے دوسری طرف سر مارتی اور پکارتی۔

"ہائے رام پانی .... ہائے پانی۔" تنیش اس کی آواز سن کر اس کی طرف دوڑا۔ "بینا میری بینا تو نے یہ کیا کیا۔ میری اتنی سی خطا کی اتنی بڑی سزا دی تو نے، یہ تو سوچتیں۔ تم مجھ سے انتقام لے لیتیں۔ تم نے خود اپنے آپ کو کیوں جلا ڈالا؟ خدا کی قسم قتل تو نہ کرتیں۔ ارے لوگو! میری بینا سے کہو مجھے معاف کر دے۔ ہائے بھگوان مجھے خبر ہوتی تو اسے اکیلا چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔"

تنیش کے کہے ہوئے ایک ایک حرف لوگوں کے دلوں کو چیرے ڈال رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر بینا سوائے ہائے رام پانی کے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اس کی سماعت، بصارت دونوں ختم ہو گئی تھیں۔

بڑے ڈاکٹر آئے ہر ایک نے اپنے علم و تجربے کو آزمایا مگر جب وہاں کی آن لگے تو کس کی ہمت جو روک سکے۔ وہ اس اذیت میں تین گھنٹے رہ کر ختم ہوئی۔ اب اس گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ اگر کوئی آتا ہے تو بھی کر بنے اور کسی روتے

کی آواز آتی ہے اور وہ دو چار دن میں ہی گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہاں میں وہ پیاری سی بینا بھٹکتی رہتی ہے۔

بوڑھے نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "اندر تو یہ تنیش پال اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور سڑکوں بازاروں میں بینا میری بینا کی صدا لگاتا پھرتا تھا۔ آخر کار اس کے رشتے دار اسے لے گئے۔ سنتے ہیں اب کسی حد تک اچھا ضرور ہو گیا ہے مگر اس شہر میں وہ دوبارہ کبھی نہ آیا۔ ظہیر بابو بھی اپنی تبدیلی کرا کر چلے گئے ہیں مگر بینا نہیں گئی، وہ اسی گھر میں ہے جانے کب اسے شانتی ملے گی۔ رات کو اکثر اس کمرے میں سے روتے رہنے اور ہائے رام پانی کی آواز آتی ہے۔

"آہ اس کی پیاس کب بجھے گی۔ کب تک وہ پیاسی رہے گی۔"

یہ کہہ کر بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میرا دل بھی رو دیا اور ہم بہت دیر تک خیالوں میں کھوئے رہے تھے اور سوچ رہے تھے کیا یہ سب واقعی میں سچ ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

کیا کوئی روح اس طرح پیاسی بھٹک سکتی ہے؟ اب اس کی پیاس کیسے بجھے گی، یہ کون بتائے گا؟

☆ ☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے تجربے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہوئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط سنبھالنا، ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں پھر ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو تنہا ایک آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے اعزازیہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مرحوم) کے لیے دعا سے وابستہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زمانے بھر سے بڑا معاوضہ اور تحفہ بھی کم ہے۔ ایسے حالات میں قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں پوسٹ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم ان افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی اعانت ہوگی جو اس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور چیک/ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات کو کسی قسم کی =/300 روپے کی آخری حد نہیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)... منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ "سچی کہانیاں" 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ شاہین اختر۔ کراچی

○ السلام علیکم بابا جی امید ہے آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے بابا جی میں نے ہر بار آپ سے رہنمائی لی ہے، آج پھر میرے ساتھ چند مسائل ہیں، امید ہے کہ آپ جلد جواب دیں گے بابا جی میری عمر 40 کے قریب ہے، میرے سر کے بال اس قدر تیزی سے سفید ہو رہے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی آپ مہربانی کر کے میرے بال دوبارہ کالے ہو جائیں کوئی ترکیب یا دوا بتا دیں۔ میں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھوں گی، نیز دوسرا مسئلہ یہ ہے آج چار پانچ ماہ ہو گئے ہیں میری سیدھی آنکھ مسلسل پھڑکتی رہتی ہے بس کبھی کبھار رک جاتی ہے۔ میں بے حد عاجز آ گئی ہوں آپ مجھے کوئی ایسی دعا بتا دیں کہ یہ آنکھ پھڑکنا رک جائے، میں بے حد پریشان ہوں آپ کی یہ بیٹی آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھے گی۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بالوں کے سفید ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جس میں سب سے اہم وجہ موروثی ہے۔ دوسری اہم وجہ خوراک کا متوازن نہ ہونا ہے۔ تم اپنی غذا میں پھل کا استعمال بڑھا دو یہ بالوں اور آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔ ہفتہ میں ایک بار سرسوں کا تیل بالوں کی جڑوں میں ضرور لگاؤ۔ بکثرت یا اللہ کا ورد کیا کرو۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔

□ یسریٰ فاطمہ۔ کراچی

☆ بیٹی یسریٰ! تمہاری خواہش کے مطابق خط شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات انسان کو محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں جانب گہرا اندھیرا ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہوتا ہے کوئی نہ کوئی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے سب ہمیں نظر نہیں آتا۔ بیٹی تم بھی بالکل مایوس مت ہو۔ اللہ سب خیر کرے گا اس سے مکمل اعتماد کے ساتھ مانگو نہایت بابرکت ماہ شروع ہو چکے ہیں، ان کی جانے والی تمام جائز دعائیں قبول ہوتی ہیں تم بھی اللہ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے جب انسان دن میں پانچ بار وضو کر کے نماز پڑھتا ہے تب مایوسی ویسے ہی دور ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ صدقہ خیرات ضرور کیا کرو اس عمل سے روزی میں برکت عطا ہوتی ہے۔ بیٹی روزانہ بعد نماز فجر ایک بار سورۂ رحمٰن ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ بکثرت یا مالک الملک کا ورد کرو۔ انشاء اللہ سارے مسائل رفتہ رفتہ حل ہوں گے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ن۔ ش۔ ٹیکسلا

○ محترم بابا جی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! اللہ تعالیٰ آپ کو عزت دے۔ آپ نے مجھے وظیفہ بتا کر میرے اوپر احسان کیا ہے۔ بابا جی ایک بات کہنی ہے کہ میں 5 وقت کی نمازی اور تہجد گزار تھی لیکن جب سے سود لیا ہے میرا دل نہیں کرتا نماز پڑھنے کو اور تین سال ہو گئے ہیں میں نے ٹھیک طرح سے نماز نہیں پڑھی حالاں کہ میں چاشت اور اشراق کے نفل بھی باقاعدگی سے پڑھتی تھی اب فرض بھی چھوٹ گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز مجھے روک رہی ہے۔ پلیز کوئی وظیفہ دیں کہ میری نماز میں باقاعدگی آ جائے اور میں آپ سے اس ماہنامے کی وساطت سے مخیر لوگوں سے گزارش کروں گی کہ یہ قرض اتارنے میں میری مدد کریں اور مزید گمراہ ہونے سے بچائیں۔ اللہ پاک آپ کو اجر دے گا۔

☆ بیٹی! تمہیں تو خود ہی اندازہ ہے کہ تمہاری اس کیفیت کی کیا وجہ ہے۔ بہت ضروری ہے کہ تمہارا قرض اتر جائے۔ بیٹی سود لینے والے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے جنگ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تمہیں جس دن یہ احساس ہوگا کہ تم نے بہت غلط حرکت کی ہے اس دن سے تمہارے معاملات میں سدھار شروع ہو جائے گا۔ ہر نماز کے بعد ایک بار سورۂ توبہ پڑھو اور بہت گڑگڑا کر معافی مانگو مدت 21 روز ہے۔

□ رابعہ بصری۔ چیچہ وطنی

○ پیارے بابا جی! چند ماہ سے میرے احساسات میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک لمبا شخص جس نے سفید لباس پہنا ہوا ہے میرے پاس موجود ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ ادراک و خیال میں یہ تصویر مجھے اس قدر گہری دکھائی دیتی ہے کہ میں اسے واہمہ سمجھ کر رد نہیں کر سکتی۔ اچانک جب نگاہ تصور اسے دیکھتی ہے تو میں ڈر کر بھاگنے پر مجبور

ہو جاتی ہوں۔ خاوند کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ عالم خیال میں مجھے وہ شخص چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے اور میرا خوف کے مارے برا حال ہو جاتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کئی راتوں سے سوئی نہیں، احساس سے نجات دلانے کے لیے کچھ کریں آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆ بی بی رابعہ! ذہن انسانی میں ہزار اختلافات وارد ہوتی ہیں اگر کسی جسمانی میں گہرائی واقع ہو جائے تو آدمی انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کی وجوہ اور تفصیلات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن پنج گانہ نماز کی ادائیگی کے ساتھ مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ اس کیفیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

غذا کنٹرول کرو، بادی اور ثقیل اشیاء سے پرہیز کرو، گوشت کم کھاؤ۔

اگر کوئی ورد یا وظیفہ کرتی ہو تو اسے ترک کر دو۔

سورۃ الفلق ایک مرتبہ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھ سر سے پیر تک پھیر کر ہاتھ زمین سے مس کر دو۔ اسی طرح پانچ مرتبہ کیا جائے۔ ان اعمال پر کم از کم چالیس دن عمل کرو خدا بہتری کرے گا تعویذ تیار کر دیا گیا ہے آفس سے منگوا لو۔ خدا بہتری کرے گا۔

□ ربیعہ حسین۔ اسلام آباد

☆ بی بی ربیعہ! اللہ تعالیٰ سے ہر وقت یہ دعا کرو، تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے (آمین) بعض اوقات جو لوگ یا رشتے یا فیصلے ہمیں برے لگتے ہیں، وہ ہمارے لیے بہترین ہوتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور یا رحیم کا بہت ورد کرو۔ بہن کا مسئلہ میں کچھ نہیں سمجھا ہوں۔ وضاحت سے لکھو، اندازوں سے میں ویسے بھی علاج نہیں بتاتا ہوں۔

□ راشد خان۔ کینیڈا

○ بابا جی! میرا تعلق سرگودھا سے ہے۔ 35 سال ہو گئے ہیں دیار غیر میں محنت کرتے۔ اللہ نے توفیق دی ہے لہٰذا حسب استطاعت لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہوں۔ آپ کا پچھلا شمارہ نظر سے گزرا تو کچھ ایسے لوگوں کا پتا چلا جو بہت ضرورت مند ہیں۔ بابا جی! میں چاہتا ہوں کہ ان کی مدد آپ کے ذریعے ہی کروں تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ یہاں تو لوگ ضرورت مند کی مدد بھیک دینے کے انداز میں کرتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کار خیر میں حصہ لوں؟

☆ بیٹے راشد! تمہارے خط نے مجھے اپنی بیٹی UK کی یاد دلا دی۔ اللہ اس کو اچھا رکھے۔ وہ اسی طرح لوگوں کی مدد کیا کرتی تھی۔ اس کا شوہر بیمار تھا۔ بہت عرصہ ہوا کوئی رابطہ نہیں۔ میری دعا ہے وہ جہاں ہو، سکھی ہو، اچھی ہو۔ بیٹے! نیک کام میں شامل ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ تو نصیب کی بات ہے۔ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے دفتر فون کر کے جو معلومات چاہو لے لینا۔

□ نعیم [illegible]

○ بابا جی! السلام علیکم! میرے اندر عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو خود کو انتہائی کمتر محسوس کرتا ہوں۔ کسی سے بات چیت نہیں کر سکتا۔ دماغ ہر وقت مختلف الانوع خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ کوئی کام شروع کرتا ہوں تو کچھ ہی عرصہ بعد چھوڑ دیتا ہوں۔ شاید اسی لیے تعلیم کے معاملے میں بھی پیچھے ہوں۔ گھر کے سارے کام کرتا ہوں لیکن گھر میں وہ عزت نہیں جو ہونی چاہیے بلکہ میری کہیں بھی عزت نہیں۔ آج کے دور میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ضروری ہونی چاہیے لیکن میں اپنی بات کسی کو سمجھا نہیں سکتا۔ میرے اندر کسی کو متاثر کرنے کی قوت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیا کروں؟

☆ بیٹے نعیم! قدرت کی طرف سے ہر شخص کو مختلف اوصاف اور صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ دوسروں سے موازنہ کر کے خود کو بہتر بنانا یا اپنی اصلاح کرنا ایک اچھی بات ہے تم اپنے خیالات کا محاسبہ کرو اور اپنے اندر سے احساس کمتری اور دوسروں سے بے جا موازنہ کرنے کا رجحان بالکل ختم کر دو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سو مرتبہ یا واسع کا ورد کرنے سے انشاء اللہ تم کو فائدہ حاصل

ہوگا۔ اس وظیفے کو کم از کم چالیس روز ضرور پڑھو۔

□ نسرین محسن۔ رحیم یار خان

○ محترم بابا صاحب! السلام علیکم! یہ مسئلہ میری بڑی بھابی کا ہے جن کی عمر 35 سال ہے۔ اُن کی شادی کو 14 سال ہوگئے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے تب سے اکثر بیمار رہتی ہیں۔ ہر دوسرے مہینے میں ان کا گلا خراب ہو جاتا ہے۔ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہیں۔ بات کرتے اس طرح نظر آتی ہیں جیسے اُن کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے واسطے اُن کو کوئی ایسی دوا یا وظیفہ بتا دیں جس سے اُن کی بیماری دور ہو جائے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ گلوں کی تکلیف کے لیے جو دوائی آپ دیتے ہیں' اسے منگوانے کا طریقہ کار بتا دیں۔

☆ بیٹی نسرین! اللہ تعالیٰ تمہاری بھاوج کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ (آمین!) مریضہ خود نماز عصر کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھ کر پانی کی ایک پیالی پر دم کرے اور درود شریف کا ورد کرتے ہوئے تین سانسوں میں یہ پانی پی لے۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ مدت 90 دن ہے۔ ٹانسلز کی دوا منگوانے کے لیے تمہیں براہ راست خط لکھنا ہوگا ہمراہ جوابی لفافہ۔ دوا کا طریقہ استعمال دوا کے ساتھ تحریر کر دیا جائے گا۔

□ نصرت حامد۔ کوٹ ادو

○ بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں بہت پریشان ہوں' میرا مسئلہ ہے ہی بہت تکلیف دہ۔ میری شادی کو 7 سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میں نے ایک دن بھی سکون کا نہیں دیکھا۔ شوہر بہت پیسے والے ہیں مگر بے انتہا شکی اور ہاتھ چھوڑ ہیں' مجھے بے تحاشا مارتے ہیں۔ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو 5 سال کی ہے اور بیٹا ڈھائی سال کا ہے۔ دونوں باپ کے قدموں کی آواز سن کر سہم جاتے ہیں۔ ان 7 سالوں میں میں جتنا اپنے آپ کو بدل سکتی تھی بدل لیا مگر اب مار نہیں سہی جاتی۔ جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ منہ پر تھپڑ مارنا تو کوئی بات ہی نہیں ایسے کوئی جانوروں کو بھی نہیں رکھتا جیسے میں دن گزار رہی ہوں۔ خدا کے لیے' بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میری اس شخص سے جان چھوٹ جائے۔

☆ بیٹی نصرت! تمہارا تفصیلی خط پڑھا' بہت دکھ ہوا مگر بیٹی! ایک بات جو ناقابل برداشت ہے کہ وہ شخص تمہیں مارتا ہے اور تم برداشت کرتی ہو۔ مرد کا اگر ایک دفعہ ہاتھ اٹھ گیا تو پھر وہ نہیں رکتا۔ تم 7 سالوں سے یہ سب برداشت کر رہی ہو غلط ہے۔ میں کسی بچی کو ایسے شخص کے ساتھ رہنے کا مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ جتنی مار کے ساتھ رہنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ تمہیں ہمت کرنی ہوگی اپنے بڑوں کو درمیان میں ڈالو۔ بچوں کی فکر مت کرو وہ تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد یاسلامُ رحیمُ کا بہت ورد کرو۔ اللہ تعالیٰ ونا صر ہو۔

□ فلک ہاشم۔ باغ' آزاد کشمیر

○ بابا جی! میں بہت پریشان رہتا ہوں' نوکری کے سلسلے میں عرصہ 10 سال سے دبئی میں مقیم ہوں۔ بیوی بچے گاؤں میں ہیں' سال میں ایک بار 20 دن کے لیے گھر جاتا ہوں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کے معاملات ماں کے بس سے باہر ہیں۔ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے میرا روزگار اپنے وطن ہی میں ہو جائے تاکہ میں گھر کی ذمے داری اچھی طرح اٹھا سکوں۔

☆ بیٹے فلک! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ جب جب یاد آئے' بکثرت آیت کریمہ پڑھو۔ اس ورد کو اپنی عادت میں شامل کر لو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی بھی مشکل میں گرفتار ہوں وہ بھی یہ ورد کریں۔ ضرور کرم ہوگا۔

□ عروہ بیگ۔ ٹی جنگ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! "سچی کہانیاں" میں لوگوں کے مسائل اور آپ کے بتائے ہوئے حل پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں بھی اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میری شادی کو پندرہ ماہ ہونے والے ہیں۔ میرے شوہر کا روزگار نہیں ہے جس کی وجہ سے میں سخت پریشان ہوں اور دوسرا یہ کہ انہیں اپنی ذمے داریوں کا بھی احساس نہیں ہے۔ میرے سسر ہی میرا

گھر چلا رہے ہیں۔ ان میں ضد بھی بہت ہے۔ مجھ سے تو خاص طور پر ہر بات میں ضد کرتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے ان کو روزگار بھی مل جائے اور ان کی ضد بھی ختم ہو جائے۔ میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔

☆ بچی عروہ! رزق کا وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اس کا مزاج خراب ہو جاتا ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز عصر کے بعد سورۃ قمر آیات 1 تا 13 پڑھو اور دعا کرو، کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

□ انیلا۔ شورکوٹ

☆ بچی انیلا! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ (آمین!) نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر کے بعد سات تسبیح یـــا رقیب کی پڑھو اور دعا کرو۔ صدقہ خیرات ضرور کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ثوما۔ جام پور

☆ بچی ثوما! والدہ سے کہو کہ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ کہف پڑھیں اور ایک پیالی پانی پر دم کریں اور پانی بیٹے کو پلائیں۔ جب جب یاد آئے الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دم کر دیا کریں۔ ضرور افاقہ ہوگا۔ مدت 31 دن ہے۔

□ زینت ابوشاد۔ راولپنڈی

○ بابا جان! السلام علیکم! بہت ہمت کر کے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ہمارا تعلق سفید پوش گھرانے سے ہے۔ واحد کمانے والے میرے شوہر ہیں اور کھانے والے 8 افراد ہیں۔ میری ساس، بیوہ نند اس کے 3 بچے اور میرے 2 بچے۔ میرے شوہر ڈبل ڈبل نوکریاں کرتے ہیں پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ بہت پریشانی رہتی ہے۔ بابا جان! ہم لوگ تو کسی سے مانگ بھی نہیں سکتے۔ بچے معمولی چیزوں کے لیے بھی ترستے ہیں۔ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے روزی میں اضافہ ہو۔

☆ بچی زینت! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ بچی! تم بہت خوش نصیب ہو کہ بیوہ اور یتیموں کی کفالت تمہارے شوہر کے ذمے ہے۔ بہت محبت اور سلوک سے سب کا خیال رکھو۔ اس کا صلہ بہت بڑا ہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 1100-1100 بار پڑھو سُبحان اللّٰہ وبحمدہ سُبحان اللّٰہ العظیم۔ اللہ سے دعا کرو۔ وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ اللہ بندی۔ چپڑی

○ بابا جی! خوش رہیں۔ بابا جی! میں ایک بیوہ عورت ہوں 3 بچے ہیں جو ابھی پڑھ رہے ہیں۔ میرے شوہر نے اپنے انتقال سے پہلے بہت لوگوں کو پیسا ادھار دیا تھا جو اب میں واپس لینا چاہتی ہوں مگر ہر دفعہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ لینے والے یہ تو مانتے ہیں کہ انہیں رقم ادا کرنی ہے مگر کب کرنی ہے اس کا کچھ نہیں بتاتے۔ بابا جی! میرا ذریعہ آمدنی کچھ نہیں۔ کوئی نوکری بھی نہیں کر سکتی کہ بچوں کا ساتھ ہے۔ اپنے گھر والوں کی مدد لینا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے مجھے میرا پیسا واپس مل جائے۔ بچوں کو ترستے ہوئے دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔

☆ بچی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ یقیناً یہ وقت تمہارے لیے بہت مشکل اور کٹھن ہے مگر یقین رکھو بیوہ اور یتیم کا مال کھانے والے اس دنیا میں بھی رسوا ہوتے ہیں اور وہاں تو حساب کتاب ہی بہت سخت ہوگا۔ بہر حال تم نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد یا غنی کی 7-7 تسبیح پڑھو۔

□ فرحین گل۔ کوٹلی

☆ بچی فرحین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ الواقعہ ضرور پڑھو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ تعویذ منگوانے کے لیے مجھے براہ راست خط لکھو مع جوابی لفافہ۔ سورۃ الواقعہ 21 روز پڑھ کر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ کلثوم علی۔ تونسہ شریف

○ بابا جی! السلام علیکم! جب میں نے آپ کا ارسال کردہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا تو ایسے لگا جیسے کسی نے میرے گرد حصار باندھ رکھا ہو لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی شروع ہو گئی۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ

میں دو دن اس سے بات نہیں کرتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں لیکن آپ کے وظیفے سے صبر آتا گیا۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ پڑھ رہی ہوں پورے چالیس دن میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی مگر ایک رات پتا نہیں کیسے بہک گئی اور اسے فون کر دیا۔ اب اس نے خود بتایا ہے کہ اس کے پاس میری وہ ساری باتیں جو رات میں نے کی تھیں سب ریکارڈ ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہارے منگیتر کو یہ سب بتا دوں گا۔ بابا جی! مجھے پتا ہے کہ یہ کام جو میں کر رہی ہوں گناہ ہے! مجھے احساس ہے کہ میں اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہوں مگر میں اب یہ داغ مٹانا چاہتی ہوں۔ میں ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے امی ابو بہت اچھے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگر ان کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھ پہ بے حد اعتماد کرتے ہیں۔ میں ان کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ بابا جی! پلیز میرے لیے کچھ کیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔ بابا جی! میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ آپ کو خط لکھتی ہوں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بابا جی! میری ساری باتیں پڑھ کر آپ کو بھی دکھ ہوگا۔ پلیز مجھے ڈانٹیے گا میرے لیے کچھ کیجیے۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کیسے چھٹکارہ پاؤں اس لڑکے سے؟ یہ وظیفہ کب تک پڑھوں؟ ساری باتیں لکھ دی ہیں۔ آپ میرے لیے خاص دعا کریں کہ مجھے اس لڑکے سے نجات ملے۔

☆ بیٹی کلثوم! تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تم کیا غلطی کر بیٹھی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں محفوظ رکھے۔ (آمین!) فوراً قطع تعلق کر لو۔ تمہارا خط صرف اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو احساس ہو کہ یہ وقتی کھیل تماشے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ نماز فجر اور ظہر کے بعد سورۃ فتح آیت 29، 100-100 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رشیدہ بانو۔ خان پور

○ بھائی جہاں نوکری کے لیے جاتا ہے وہاں سے جواب نفی میں ملتا ہے اگر کسی کو کہتے ہیں تو وہ بھی دلچسپی نہیں لیتا۔ نہ صرف بھائی کے ساتھ ایسا ہے بلکہ ہمارے گھرانے کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ دیگر معاملات میں بھی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا ہے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی الجھنوں اور پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ ایسا کوئی عمل وظیفہ بتا دیں کہ ہم اس مشکل سے نکل آئیں۔

☆ بیٹی رشیدہ۔ بھائی سے کہو کہ وہ نماز فجر کے بعد سو مرتبہ یا رحیم پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرے اور ہاتھ چہرے پر پھیر لیا کرے۔ کم از کم نوے دن اس عمل کو جاری رکھے۔ انشاء اللہ خدا کرم کرے گا۔ اس کے علاوہ آفس سے تعویذ منگوا لو اور گھر کے صدر دروازے پر اس طرح لگاؤ کہ نظر نہ آئے۔

□ حسنہ یوسف۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! میری نو سالہ بیٹی بہت کمزور ہے اس کو بھوک بھی بہت کم لگتی ہے۔ کبھی اس کا رنگ زرد سا ہو جاتا ہے ابھی بھی تکلیف لگتی ہے اکثر صبح اٹھ کر پیٹ میں درد کی شکایت کرتی ہے صبح کو سست رہتی ہے اور رات کو دیر سے سوتی ہے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ میں کیا کروں بابا جی! پلیز جواب دیں۔

☆ بیٹی حسنہ! کسی اچھے طبیب کو دکھاؤ کیوں کہ علامات کسی طبی خرابی و بیماری کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ لوبح قرآنی علی الصباح اکتالیس مرتبہ پانی پر دم کر کے پلاؤ انشاء اللہ جسمانی طاقت کی بحالی میں بہت معاون ثابت ہوگا ساتھ ساتھ طبیب کی ہدایت کے مطابق غذا میں پرہیز و احتیاط کرنا لازمی ہے۔ خدا شفا دے گا۔

□ اریبہ۔ شجاع آباد

☆ بیٹی! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھا کرو۔ جس قدر ممکن ہو عبادت کرو۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد اس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ورد کرو کہ تعداد بارہ ہزار مکمل ہو جائے پھر دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

□ فیاض احمد۔ سرائے عالمگیر

○ بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کو بڑی امید وں سے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرور کوئی بہتر حل بتائیں

گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے والدین عرصہ دراز سے فوت ہو چکے ہیں اور اس کے دو بھائی ہیں جو ہمیشہ اس کے متعلق غلط سوچتے ہیں۔ میں نے اسی سال گریجویشن کیا ہے اور میرا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے جبکہ اس کے بڑے بھائی نے ایک بار تو اپنی دوسری شادی کرنے کے لیے اس کا رشتہ کسی غیر مناسب جگہ پر کر دینے کی کوشش کی جو نہ ہو سکا۔ بابا جی! دراصل حقیقت یہ ہے کہ تقریباً دو سال پہلے میری اسی کزن سے میرا نکاح تھا جو خاندانی چپقلش کی وجہ سے نہ ہو سکا اور انہوں نے نکاح سے ایک دن قبل فون پر منع کر دیا تھا جس کے باعث ان لوگوں سے ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے گھر والوں نے انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔ ابھی تک بات اٹکی ہوئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کا غیروں میں رشتہ نہ ہو جائے۔ بابا جی! آپ جلد مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

ج: بیٹے نیاز! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمہاری دعا قبول فرمائے۔ نماز میں لازماً دعا کیا کرو۔ نماز عشاء کے بعد سورۃ الاعراف آیت 26' 99 بار پڑھ کر دعا کرو۔ وظیفہ نہایت دل سے پڑھا کرو۔ نماز پابندی کے ساتھ بھی وظیفہ جاری رکھو۔ حاجت پوری ہونے تک وظیفہ جاری رکھو۔

عبدالغفار۔ ڈنمارک

O بابا جی! میں بہت دور سے آپ سے مخاطب ہوں۔ میری اردو بہت کمزور ہے اس لیے اگر غلطی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ بابا جی! میں 3 سال سے یہاں ڈنمارک میں ہوں۔ پہلے پڑھائی کے ساتھ جاب بھی کر رہا تھا مگر اب پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری دوستی ایک ڈنش لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھی ہے اور اچھی فیملی سے ہے۔ بابا جی! میں اور وہ شادی کرنا چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے تیار نہیں حالانکہ وہ اسلام بھی قبول کرنے کو تیار ہے۔ والدہ اور بھائی تو شاید مان بھی جائیں مگر امی بہت سخت ہیں۔ میں چاہتا ہوں بڑوں کی مرضی سے یہ شادی ہو۔ مجھے تعویذ بتا دیں تاکہ میری امی کا دل نرم ہو جائے اور وہ مجھے خوشی خوشی اجازت دے دیں۔

ج: بیٹے غفار! یقیناً مذہب تمہیں اپنی پسند کی جائز زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے مگر بیٹے! یہ بھی یاد رکھو کہ والدین کا اولاد پر بہت حق ہے۔ ماں باپ کا تجربہ اولاد کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے اگر اولاد فرمانبردار ہو تو۔ تم اپنی والدہ سے خود بات کرو اور پوچھو کہ وہ کیوں اس رشتے پر تیار نہیں؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ لڑکی اسلام قبول کرنے کو تیار ہے تو یہ بات درست نہیں۔ تمہاری وجہ سے وہ مذہب بدل سکتی ہے تو کل کسی اور وجہ سے اسلام کے دائرے سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ ہاں اگر وہ دین اسلام کو سمجھے اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچے کہ یہی سچا اور اللہ کے آخری نبی اور محبوب کا پھیلایا ہوا دین ہے تو درست ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھے اور سمجھے اور پھر اپنا رہن سہن اور چال ڈھال سب اسلامی شریعت کے مطابق کرے پھر یقیناً تمہاری والدہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میری نصیحت ہے کہ اگر دنیا میں عزت چاہتے ہو تو ماں باپ کے فرمانبردار رہنا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور کثرت سے یاقدوس کا ورد کرو۔

اعجاز ایوب۔ تلہ گنگ

O محترم بابا جی! السلام علیکم! میرے بھائی پر فالج کا اٹیک ہوا ہے اور زیادہ حملہ دماغ پر ہوا۔ اب چھ ماہ سے ان کا علاج ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ اٹیک ان پر دائیں سائیڈ پر ہوا تھا۔ سہارے کے بغیر چل تو لیتے ہیں لیکن ابھی صحیح طور پر چل نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ بازو بھی ابھی صحیح طور پر حرکت نہیں کر سکتا۔ باتیں کرتے ہیں تو کبھی کبھی سمجھ میں آ جاتی ہیں لیکن بعض اوقات باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں جس کی وجہ سے میری بہن کافی پریشان ہیں۔ محترم بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ

میرے بہنوئی بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ وظیفے کی اجازت ان کی والدہ کو دی جائے۔ بابا جی! اس مسئلے کا حل فوری طور پر دے دیا جائے تاکہ میرے بہنوئی جلد از جلد صحت یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام نیکیوں کا اجر عطا فرمائے۔ (آمین! ثم آمین!)

☆ بیٹے اعجاز! اللہ تعالیٰ تمہارے بہنوئی کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ ان کی والدہ سے کہو کہ نماز کی پابندی کی کوشش کریں۔ نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد 7-7 بار سورۃ النصر اور سورۃ فلق پڑھیں اور دعا کریں۔ یا مجیب کا کثرت سے ورد کریں۔ انشاء اللہ مکمل شفا ملے گی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ وقار عظیم۔ اوکاڑہ

○ بابا جی! کئی سال پہلے میری والدہ نے آپ کے بارے میں بتایا تھا اب تو ان کے انتقال کو بھی عرصہ گزر گیا۔ وہ آپ کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ بیٹا! جب بھی کوئی مسئلہ ہو لوگوں سے کہنے کی بجائے بابا جی کو خط لکھ دیا کرو۔ وہ اللہ کی کتاب سے حل دیتے ہیں۔ بابا جی! آج کل کچھ پریشانیوں سے دوچار ہوں مالی مسائل بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ کاروبار میں نقصان سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ بیوی روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ برائے مہربانی میرے مسائل حل فرما دیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

☆ بیٹے وقار! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز عشاء کے بعد 21 بار سورۂ مریم کی ابتدائی 3 آیات پڑھو اور دعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ بیوی کو کچھ عرصہ اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہی بہتر ہے۔ رفتہ رفتہ سب درست ہو جائے گا۔

□ فائزہ کوثر۔ کہروڑ پکا

○ بابا صاحب! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ ہمیشہ ایسے ہی ہماری راہنمائی کرتے رہیں۔ (آمین!) میں آپ کا کالم بڑے ہی شوق سے پڑھتی ہوں اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو لکھ کر راہنمائی حاصل کرتی ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ آج کل کے زمانے میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں جو بغیر مطلب کے دوسروں کے کام آتے ہیں۔ بابا صاحب! میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور غلطی سے چند بار ان سے باہر بھی مل چکی ہوں۔ وہ بہت شریف انسان ہیں مگر بابا صاحب! میں اکثر ان سے باہر نہیں مل سکتی کیونکہ یہ غلط بات ہے مگر مجھے پہلے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں غلط کر رہی ہوں۔ اب بابا صاحب! میں اگر ان سے باہر نہ ملوں تو وہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ اگر باہر ملوں تو پریشانی ہوتی ہے کہ یہ غلط بھی ہے اور اگر گھر والوں کو پتا چلتا ہے تو میری بڑی عزت رہ جاتی ہے۔ بابا صاحب! اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عزت کی زندگی عطا فرمائے اور مجھے رسوائی سے بچائے۔ (آمین!) بابا صاحب! میرے خط کا جواب ضرور دیں تاکہ میں عزت کی زندگی کی سکون اور تنگی کے راستے پر چلوں۔ بابا صاحب! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ یا تو مجھے وہ چھوڑ دیں یا عزت کے ساتھ لے کر جائیں اور ہمارے لیے جو بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ ویسا ہی فیصلہ فرمائے۔ (آمین!) اور میں جلد ہی اس پریشانی سے باہر نکلوں۔ (آمین!)

☆ بیٹی فائزہ! تمہارے فرضی نام کے ساتھ مسئلہ اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو پڑھ کر اندازہ ہو کہ ایسے تمام لوگ ایک ہی طریقۂ واردات رکھتے ہیں۔ مخلص شخص اپنی عزت سے زیادہ دوسرے کی عزت کا خیال رکھتا ہے۔ فوراً قطع تعلق کرو کیونکہ تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یا قیوم کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ یسریٰ اسلم۔ سعودی عرب

○ بابا جان! میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب آ گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اندازہ ہی نہیں ہوا مگر آہستہ آہستہ مجھے پتا چلا کہ میرے شوہر بہت شکی ہیں وہ کام پر جاتے ہوئے مجھے گھر میں لاک کر کے چلے جاتے ہیں، ہر وقت پوچھتا چھ سے میں بہت پریشان ہو گئی ہوں مجھے لگتا ہے کہ میری سانس بند ہو جائے گی۔ گھر والوں کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ اللہ کے

واسطے میری مدد کریں۔ حالات ایسے ہی رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔

☆ بیٹی یسریٰ! ہمت رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ اس مسئلے پر شوہر سے بات کرو۔ دیکھو بیٹی! شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ شروع شروع میں دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے اس لیے کچھ مسئلے مسائل ضرور پیدا ہوتے ہیں مگر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص شکی طبیعت رکھتا ہو تو وہ خود بھی اذیت میں رہتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان رکھتا ہے۔ زندگی پریشان رہ کر نہیں گزاری جا سکتی۔ شوہر کو واضح الفاظ میں بتا دو کہ اس طریقہ کار کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں۔ مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ کبریٰ شان۔ کھڈیاں خاص

○ محترمی و مکرمی بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کے بارے میں رسالہ "سچی کہانیاں" میں پڑھا اور مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ اس زمانے میں آپ جیسے نیک بزرگ موجود ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرے یہ دو مسئلے ضرور حل کریں گے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے اپنا کافی علاج کروایا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں آپ ٹھیک ہیں۔ خاوند نے ایک مرتبہ اپنا ٹیسٹ کروایا ہے لیکن بابا جی! 15 دن کی دوائی کھانے کے بعد سب دوائی چھوڑ دی ہے۔ لیکن وہ میری اب کوئی بات نہیں مانتا اس لیے بابا جی! آپ مہربانی کر کے مجھے اولاد کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں اور دوسرا مسئلہ کہ خاوند میری طرف توجہ دے اور میری بات مانے' اس کے لیے بھی کوئی عمل بتائیں۔ میں تاحیات آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی کبریٰ! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد نرینہ عطا فرمائے۔ 7 دن تک نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ نوح آیات 10 تا 12 ایک ایک تسبیح پڑھو اول و آخر 71-71 بار سبحان اللہ اور 71-71 بار استغفراللہ۔ 7 دن مکمل ہونے پر کچھ رقم خیرات کر دو۔

انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے اس کے لیے یا صمد کا کثرت سے ورد کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

□ قرۃ العین۔ سادھوکی

○ بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ ضرور جواب سے نوازیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھتی ہوں مگر بے حد محنت کے باوجود ہر دفعہ کم نمبر آتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں اس دفعہ کے امتحان میں اچھے نمبر لے سکوں اور میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے والدین میری کوئی بات نہیں مانتے اور والد تو وہم کے مریض ہیں۔ ہر بات پر صاف انکار کر دیتے ہیں۔ میں ان کے لحاظ میں کوئی بات نہیں کرتی۔ میں ہی نہیں میرے بھائی بھی اس بات سے کافی پریشان ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والد ہر بات سمجھ اور مان جائیں' ان کا وہم ختم ہو جائے۔ آپ کا بہت احسان ہوگا۔

☆ بیٹی قرۃ العین! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!) روزانہ رات کو 8-7 بادام پانی میں بھگو دو اور نہار منہ اچھی طرح چبا کر کھا لو اور ایک گلاس گرم دودھ بھی ضرور پیو۔ نماز فجر کے بعد 11 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ اپنے والد کی صحت یابی کے لیے دعا کرو اور کسی بھی بات پر بحث مت کرو۔ یہی مناسب ہے۔ وظیفہ تم امتحان کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔

□ منیر احمد۔ چانی

☆ بیٹے منیر! نماز فجر اور نماز عصر کے بعد 7-7 تسبیح سورۃ آل عمران آیت 154 کی پڑھو اور تمام حاجات بیان کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ سائرہ کنول۔ حیدر آباد

☆ بیٹی سائرہ! اپنی توجہ صرف تعلیم پر رکھو۔ جن باتوں کو تم بہت اہم سمجھ رہی ہو وہ صرف وقت کا زیاں ہے۔ والدین کی خدمت کرو۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد سورۃ بقرۃ آیت 138' 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو

کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عقل عطا فرمائے۔ (آمین!)

☐ حامد علی۔ شہدادکوٹ

☆ بیٹے حامد! تم اگر اپنے جذبوں میں سچے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مشکلات حل فرمائے گا۔ اس معاملے میں جو طریقہ ہے اسی کو اپناؤ اور اپنے بڑوں کو لڑکی کے گھر بھیجو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز فجر کے بعد 12 تسبیح یاسمیع کی پڑھو۔ غیبت اور وعدہ خلافی سے مکمل پرہیز کرو اور صدقہ خیرات ضرور دیا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔ 21 دن بعد لڑکی کے گھر رشتہ بھیجو۔

☐ بشریٰ اشرف۔ گجرات

☆ بیٹی بشریٰ! سورۃ مائدہ آیات 18 تا 21، 44-44 بار نماز عصر اور نماز عشاء کے بعد پڑھ کر ایک چٹکی نمک پر دم کرو اور یہ نمک بھائی کے کھانے میں تھوڑا سا ملا دو۔ نہایت پابندی کے ساتھ یہ عمل 21 روز کرو کرم ہوگا۔

☐ نازلی۔ کھوکھراپار، کراچی

☆ بیٹی نازلی! خوش رہو۔ تمہارا مسئلہ صرف یہ ہے کہ تم بہت حساس ہو۔ بعض اوقات لوگوں کے رویے بھی بہت دکھ دیتے ہیں مگر اپنے آپ کو دکھ دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ گھر کے تمام افراد کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالو۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد 9-9 تسبیح یا واحد کی پڑھو اور دعا کرو۔ مجھے 21 دن بعد خیریت سے مطلع کرو۔

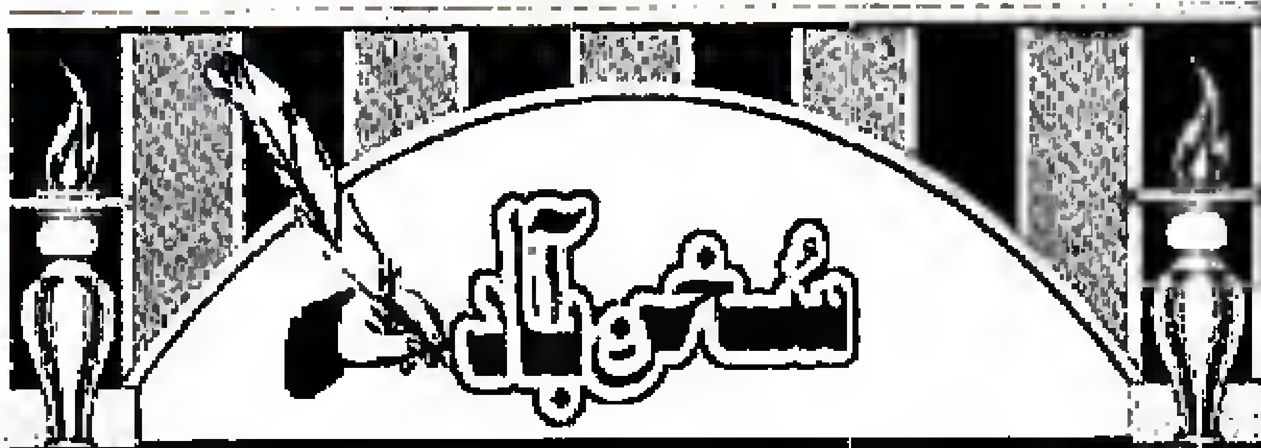
☐ زرینہ۔ کراچی

☆ بیٹی زرینہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ وظیفے کی اجازت ہے اور جیسے تم نے لکھا ہے بالکل ایسا ہی کرو۔ تعویذ میں تیار کردوں گا مگر اس کے لیے تم مجھے براہ راست خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

☐ مریم شاہد۔ بنگلہ صاحب

☆ بیٹی مریم! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور یا لطیف بہت پڑھا کرو۔ بیٹی! مجھے تمہارا مسئلہ حل ہوتا محسوس نہیں ہوتا۔ مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ ہدیہ جوابی لفافہ میں تحریر کیا جائے گا۔

☆.....☆



کوئی تو ہو!

بہار تازہ کا ہاتھ تھامے
برستے بادل کی بارشوں میں
بھیگتے آنچل کو سر پہ اوڑھے
اپنے ہونٹوں سے پھول ٹانکے
پیام صبح نوید پڑھ کے
کوئی تو آنکھوں کی سرزمیں پہ
سسکتی کلیوں کے موتی چن کے
بیاض ہونٹوں کے مقبروں پہ
گلاب رنگوں کے ہار ڈالے
کوئی شفق کے اداس دل سے
میری محبت کا نوحہ سن کے
کوئی تو اتنا لپٹ کے رو دے
کہ اب کہ ہم کو ہی مار ڈالے

شاعر: ثنا احمد حسرت نور جمالی ٹانک

کیوں وفا کروں میں!

اسے نفرت ہے مجھ سے تو کیا کروں میں
آخر کب تک عشق اس سے بے پناہ کروں میں
وہ محبت کے لائق نہ تھا اور نہ ہے
پھر کس لیے اس سے ملن کی دعا کروں میں
محبت میری اس کے کسی امتحان سے نہ گزری
اب میرا حق ہے نفرت اس سے بے انتہا کروں میں
اپنے روٹھے، خوشیاں چھوٹیں
بہتر ہے اب اس کو بھول جانا ارم
جب وہ بے وفا ہے پھر کیوں وفا کروں میں

شاعرہ: ارم خان۔ ڈیرہ غازی خان

غزل

اسے میری وہ بچپنا کی شرارت یاد آجائے
کبھی کچھ بھول بھی جائے محبت یاد آجائے
اسے پوجا اسے چاہا اسے مانگا بھی ہے ہم نے
میری بھی محبت کی عبادت یاد آجائے
کسی کے پیار کی خاطر یہ ہم نے دشمنی کی تھی
اسے میری زمانے کی بغاوت یاد آجائے
بھیگی وہ جان سے پیارا اسے معلوم ہی کب ہے
میری پہلی محبت کی عنایت یاد آجائے
اسے میں پیار کرتی ہوں اسی پہ جان دیتی ہوں
فوزیہ اب تو اسے میری سخاوت یاد آجائے

شاعرہ: فریدہ فوزی یوسف زئی۔ لاہور

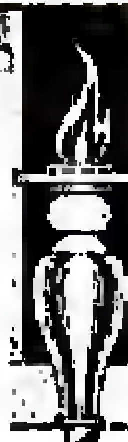
آخر کیوں

آخر کیوں تم نے ہمیں اپنا بنایا تھا
آخر کیوں تم نے سپنے دکھائے تھے
قسمیں کھائی تھیں
وہ عہد تو نبھاتے جانا
تیرا یوں اچانک بدل جانا
آخر کیوں اچانک ہمیں چھوڑ دیا
ہمارے دل کو توڑ دیا
آخر کیوں!!

شاعر: ظفر محمد مد۔ ڈیرہ مراد جمالی

مان لو!

مانا کہ تم بہت مجبور ہو!
مجھ سے بہت دور ہو!
کہ اب ساتھ تم میرا دے نہیں سکتے



اب پاس میرے تم رہ نہیں سکتے
کہ اب تم زمانے کے رسم ورواج سے لڑ نہیں سکتے
مان لیا کہ بہت سی مجبوریاں
تمہارے قدموں کی زنجیر بن گئی ہیں
سنو جاناں.....
جب دل بدل جائیں تب ہی یہ فرسودہ
مجبوریاں پیدا ہوتی ہیں
ساتھ چلنے والے کبھی بیچ راہ میں چھوڑا نہیں کرتے
حالات جیسے بھی ہوں منہ موڑا نہیں کرتے
سنو یہ سب بہانے اپنے پاس رکھو اور.....
مان لو!
کہ تم بدل گئے ہو!

شاعرہ: ثانیہ ثانی۔ سیالکوٹ

اظہارِ دوستاں

مجھ سے احباب جب پرانے ملے
سیکڑوں غم کے تازیانے ملے
سچ بتا اے امیر شہر مجھے
کیا مرے قتل کے بہانے ملے
دوستوں میں چھپے ہیں دشمن بھی
نصیحت کے تازیانے ملے
رنگ بدلتا ہے آج کا انساں
ہر قدم پہ ہی لٹانے ملے
لوگ چھپ چھپ کے وار کرتے ہیں
بے خطا جب نہیں نشانے ملے
میرے شعروں میں خود فریبی نہیں
یہ سخن تم کو شاخسانے ملے

شاعر: ادیب گنج حسن۔ حیدرآباد

اسے میں نے ہی لکھا تھا

اسے میں ہی لکھا کرتی تھی کہ میری جاں
میری چاہ تم ہو، میری زندگی کی سب
دعاؤں کا حاصل تم ہو
میرا ارمان تم ہو



وہ جب بھی مجھ سے پوچھتا تھا
کہ مجھ سے محبت کتنی ہے تمہیں
اسے میں ہی لکھا کرتی تھی کہ
تمہارے سنگ کتنی خوش ہوں میں
میری زندگی کے سبھی رنگ تمہارے نام سے ہیں
ہاں مجھے تم سے محبت بے حد و بے شمار ہے
ابھی کچھ دن ہی تو گزرے تھے
اسے میں نے ہی لکھا تھا
مجھے تم سے محبت اب نہیں ہے

شاعرہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

کیا کچھ سیکھا تھا

زندگی میں میں نے جب ہار جانا سیکھا تھا
ہار جانے کو اپنا جیت جانا سیکھا تھا
ناکامیوں کو بھی دور ہی سے دیکھا تھا
گر کے سنبھل جانا زندگی سے سیکھا تھا
درد و نارسائی میں قہقہے بکھیرے ہیں
نم آنکھوں سے مسکرانا سیکھا تھا
لوگ کیا کچھ پاتے زیست کی حقیقت کو
خالی ہاتھ ہو کر میں بادشاہی سیکھا تھا
ہار سے شروع دنیا، جیت پہ ختم دنیا
دنیا درمیاں کی ہے مشکلوں سے سیکھا تھا

شاعرہ: خولہ عرفان۔ مقام نامعلوم

غزل

سوچتا ہوں کہ اسے نیند بھی آتی ہوگی
یا فقط میری طرح آنسو بہاتی ہوگی
وہ میری شکل میرا نام بھلانے والی
اپنی تصویر سے کیا آنکھ ملاتی ہوگی
اس زمیں پہ ہے سیلاب میرے اشکوں سے
میرے ماتم کی صدا عرش ہلاتی ہوگی
شام ہوتے ہی وہ چوکھٹ پہ جلا کے شمعیں
اپنی پلکوں پہ کئی خواب سجاتی ہوگی

میرے تاریک ذہنوں سے نکلنے والی
روشنی تجھ کو میری یاد دلاتی ہوگی
شاعر: نذیر خان۔ کراچی

غزل

تیری چاہت میں بے وفائی ہے
تُو نے کبھی وفا نبھائی ہے
تجھ کو سوچا تھا میں بھلادوں گا
پھر مگر یاد تیری آئی ہے
تُو ہی تو کل مرا اثاثہ ہے
عمر بھر کی مری کمائی ہے
تجھ سے سیکھا ہے شاعری کا ہنر
تُو غزل ہے، مری رباعی ہے
اپنے آنسو چھپا کے رکھے ہیں
کیوں کہ تُو آج مسکرائی ہے
شاعر: ریحان آفاق۔ حیدرآباد

کاری

اپنے سپنوں کی اک رانی تھی وہ
خیالوں میں رہ جکڑی تھی وہ
آسماں پہ اڑان بھرتی تھی وہ
کلیوں پھولوں کی سہیلی تھی وہ
اک دن خوابوں سے اس کو جگایا گیا
زنجیروں کا زیور پہنایا گیا!
خوابوں کے شہر سے اُسے نکالا گیا
وہ حیران کی [illegible] ہوگیا
اُسے پہنا گیا نئی شکل میں
ریت رواج کی چھری تھی آتش کے ہاتھ میں
اُسے جینا تھا مر کے پل پل میں
ساری خوشیاں مرگئیں اس کے دل میں
آگے کہانی کی پیچھے آگ جلائی گئی
محبت سے چپ کی زنجیر پہنائی گئی
بے بسی سے اپنے پیاروں کو وہ دیکھتی روتی
اس طرح اک لڑکی کاری رسم کی بھینٹ چڑھ گئی
شاعر: شکیل مسعود۔ کراچی

غزل

فراتِ عشق میں اترے، قبا اپنی اتاری ہے
فصیلِ غم ترے کی جب، سحر تازہ اتاری ہے
تمہارے رخ سے پاتا ہے صبح دم روشنی سورج
تمہارے رخ کے جلوؤں سے مری ہستی سنواری ہے
فقط اک زندگانی تھی، سو کی قرباں تری خاطر
مری آنکھوں سے پوچھو تم، بڑی قیمت تمہاری ہے
بڑی دلکش بہار آئی، مگر بے سود آئی ہے
گلستاں شب غم میں ہر اک ساعت گزاری ہے
قدم راہِ محبت میں ذرا تم سوچ کر رکھنا
اگر یہ زندگی تجھ کو، اپنے سر سے ذرا پیاری ہے
دکھا خورشید کو ناکی رخ محبوب کا جلوہ
کہ جس کے حسن نے صورت ہر اک گل کی سنواری ہے
شاعر: عمران کاشی۔ کالس پور موہی اٹک

غزل

دیکھتے ہیں بکھر جاتے ہیں آنسو
کس حد تک گزر جاتے ہیں آنسو
بہت رنگ اچھلتی موجوں کو
کنارے پہ مرجاتے ہیں آنسو
بہت دکھاتی ہے آنکھیں آئینہ
رنگوں سے پھر سنور جاتے ہیں آنسو
اٹھتی ہے اک لہر آنکھوں میں
چپ چاپ سے اتر جاتے ہیں آنسو
ہر شام ملتا ہے اداسی کا رشتہ فرہاد
تنہائی میں بکھر جاتے ہیں آنسو
شاعر: محمد راشد فرہاد۔ حیدرآباد

غزل

میری کلائیوں کو ستاتی ہیں چوڑیاں
ساجن کو صبح و شام بلاتی ہیں چوڑیاں
لگتی ہیں زہر جب بھی چلا جائے اٹھ کے وہ
ہو سامنے تو پھر مجھے بھاتی ہیں چوڑیاں
ٹوٹی ہوئی جو ملتی ہیں کمرے میں ہر جگہ

اُس کی بہت ہی یاد دلاتی ہیں چوڑیاں
جب گنگناؤں اُس کی محبت میں، میں بھی
سکھیوں کی طرح ساتھ یہ گاتی ہیں چوڑیاں
لگتی ہیں ہتھکڑی کی طرح اپنے ہاتھ میں
مجھ کو کبھی کبھی تو ڈراتی ہیں چوڑیاں
تمثیلہ جب وہ مجھ سے خفا ہو بھی تو پھر
اُس کو بہت ادا سے مناتی ہیں چوڑیاں
شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ، سیالکوٹ

غزل

عمر بھر خود کو جدا رکھوں گی
دل کا دروازہ کھلا رکھوں گی
تُو بھی سینے سے لگانا مجھ کو
میں بھی سینے سے لگا رکھوں گی
میں نے سوچا ہے کہ دل سے اپنے
کب تک اس کو جدا رکھوں گی
جب وہ آئے گا میری گلیوں میں
سب در و بام سجا رکھوں گی
میں ہر شام غزل ایک دیا
شب کی آغوش میں جلا رکھوں گی
شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ۔ اوکاڑہ

محبت راس نہ آئی

گھر گھر کی خاک اُڑائی ہمیں محبت راس نہ آئی
قدم قدم پہ ٹھوکر کھائی ہمیں محبت راس نہ آئی
سارا زمانہ جب سوتا ہے چپکے چپکے دل روتا ہے
چین گنوایا نیند گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
دل دیتا ہے صدائیں تجھ کو ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں تجھ کو
اپنا مقدر تیری جدائی ہمیں محبت راس نہ آئی
چندا کو شب تک راہیں رات کے ہمراہ جاگ رہا ہوں
یاد ہے تیری اور تنہائی ہمیں محبت راس نہ آئی
خونِ جگر سے دیا جلا کے چلنا پڑا مجھے ساتھ ہوا کے
عشق میں تیرے عمر گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
شاعر: حکیم خان حکیم۔ کامل پور موسیٰ، حضرو، اٹک

دل، درد کا مارا

دل اس طرح نہ درد کا مارا ہوتا
رنجِ الفت میں اگر وہ ہمارا ہوتا
ہم پلٹ آتے زندگی کی طرف
تُو نے گر پیار سے ہم کو پکارا ہوتا
وہ دے دیتا ہاتھوں میں ہاتھ اگر
ہم نے اسے پھر روح میں اُتارا ہوتا
تھی یہی خواہش ہم بھی محبت کرتے
اور محبوب ہمیں جان سے پیارا ہوتا
جو ہو حکم محبت سے نبھاتا ہو
وہ کیا بچہ ماں کو بھی ہے پیارا ہوتا
راہِ الفت میں جان بھی دے دیتی صبا
تجھ سے ابرو کا اگر ایک اشارہ ہوتا
شاعرہ: صبا جلال۔ منامہ، بحرین

انا

وفا کہیں ٹوٹ نہ جائے
میں نے بچھڑتے وقت
اس خیال سے
صدا دی تھی
یقین بھی تھا
کہ!
میری پکار پہ تم
لوٹ آؤ گے
لیکن!
کرچی کرچی ہو جاتی تھی
تمہاری انا
اور تم انا پسند لوگوں میں
پھر کیا باقی رہ جانا تھا
کچھ بھی نہیں
کچھ بھی تو نہیں!
شاعرہ: عنبرین نعیم۔ کراچی

اس ماہ کی خاص کہانی

فیضِ عشق

امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی

قسط نمبر 1

حویلی میں سناٹا معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ فضا میں وہی خوف سے بھری ہوئی فرماں برداری کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ حویلی کی روایت میں جکڑی ہوئی زندگی ہے کہ اگر یہ خاموشی ٹوٹ گئی تو جانے کون سا طوفان آ جائے گا۔ خاموشی ہم سائے ہوتے تھی۔ حویلی کے صاف ستھرے در و دیوار پر خاموش خوف سے یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے سانس بھی لیے بنا تو ٹوٹ جائے گی۔ ایسی حبس زدہ کیفیت میں [illegible] محسوس کر رہی تھی۔ ہر آتی جاتی سانس میں [illegible] اور [illegible] کی تڑپ اسے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ یہ ایسے ہی کھردرے لمحات ہوا کرتے تھے کہ جب زندگی بارے نہ چاہتے ہوئے بھی جمع تفریق کرنے لگتی۔ کیا کھویا کیا پایا کا حساب تو چلتا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لاشعوری طور پر حویلی کے اندر موجود دنیا اور حویلی سے باہر کی دنیا کے بارے میں تجزیہ کرنے لگتی۔ جو ان سے بھی ہوئی نہیں کا تھا۔ تجزیہ یا موازنہ تو اسی وقت ہو پاتا ہے نا جب ان ساری چیزوں کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو جن کا تجزیہ یا موازنہ کیا جانا ہو۔ اسے تو باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ [illegible] پوری زندگی میں حویلی کی ان اونچی اونچی دیواروں سے باہر شاید چند بار ہی جا سکی تھی۔ یہ آزادی اسے بچپن اور لڑکپن کے درمیانی دورانیے میں بھی ملی تھی۔ جس کی یادیں بہت دھندلی سی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا، روایت کی ان دیکھی زنجیروں نے اسے یوں باندھ دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر پائی تھی۔ اس کے اردگرد حصار یوں تن گیا کہ باہر کی خوشگوار فضا بھی اس کے کمرے میں آنے سے شرماتی تھی۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی حویلی کی دیواروں کے درمیان چند مخصوص جگہیں تھیں، جہاں وہ آ جا سکتی تھی۔ مردان خانے کی طرف تو وہ رخ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ زنان خانہ، جو نچلی منزل کے کمروں، دالانوں اور پائیں باغ پر مشتمل تھا۔ یا پھر اوپری منزل پر موجود چند کمرے۔ جن کی چھت پر جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی کہ جہاں تک جا کر وہ کھلے آسمان کو محسوس کر سکتی۔ ان سارے جگہوں پر حویلی کی دوسری خواتین بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی جائے پناہ تو فقط ایک کمرہ تھا، اوپری منزل پر جو کبھی اس کے والد زین کا ہوا کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنے ہی کمرے میں گزرتا یا پھر کمرے کی وہ واحد کھڑکی جہاں سے کچھ منظر اتے



دکھائی دیتا تھا۔

اس دن بھی اس کے اندر حبس بہت بڑھ گیا تھا۔شاید اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں اتر آیا، مگر ایسے موسم کو خود اس نے آپ روکا ہوا تھا۔وہ نادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ہر برس وہ خود اپنی سالگرہ کا اہتمام خود ہی بڑے چاؤ سے کیا کرتی تھی، لیکن اس بار تو نادی نے خود ہی دلچسپی نہیں لی تھی، کیونکہ اس بار اس کے اندر ان باغیانہ خیالات نے سر اٹھالیا تھا، جس سے وہ کبھی بھی خود ڈر جایا کرتی تھی۔اس دن سے ہی نہیں پچھلے کئی دنوں سے وہ انہی باغیانہ خیالات سے لڑتی چلی آ رہی تھی۔اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا تو وہ ہار جائے گی۔یہ اس کا اپنا آپ بھی ہو سکتا ہے یا زندگی کی بازی ہو سکتی ہے۔روایت کی ان دیکھی زنجیروں میں مزید اضافہ بھی ممکن تھا۔سو وہ اپنے آپ کو یہی دلیلیں دے کر مطمئن کرتی رہی کہ دیکھوں تو سہی کہ حویلی کے دوسرے مکین اس کی سالگرہ کا دن یاد بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس حویلی میں اس کی اہمیت کس قدر ہے؟ یہ تقریب بھی کیا ہوا کرتی تھی، محض گنتی کے چند لوگ، کیونکہ حویلی کی روایات میں سالگرہ جیسی تقریب منانا بھی شامل ہی نہیں تھا۔یہ تو اس کے مرحوم والدین نے ایک بار اس کی سالگرہ منائی تھی۔ممکن ہے اپنی خوشی کی خاطر یا پھر خدا جانے کیوں؟ وہ بھی حویلی کے محدود افراد کے ساتھ۔ پھر وہ تو نہ رہے، اس کی دادی ہر برس اس کی سالگرہ مناتی رہی۔ لیکن اس وقت جب اسے شعور نہیں تھا اور شعوری طور پر وہ اپنی دادی اماں کے باعث ہی سالگرہ مناتی آئی تھی۔اتنی سی اجازت بھی اسے کیوں کر مل گئی؟ اس کی سمجھ میں تو یہی وجہ آئی تھی کہ وہ بن ماں باپ کے ان کے ساتھ پرورش پا رہی تھی۔اس کی دادی ہی اس کا سب کچھ تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے سامنے اپنی دادی کا معتبر چہرہ تھا۔اس سے تو کسی نے نہیں پوچھنا تھا مگر جواب تو اس کی دادی اماں تھی۔اس کے ذہن میں بے شمار سوال تھے۔جو اس کی باغی سوچوں کی بنیاد بن گئے ہوئے تھے۔دھیرے دھیرے ان پر شکوک شبہات سے مزین الجھنوں کا محل تعمیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔شاید یہ تعمیر رک جاتی اگر اسے ان سوالوں کا جواب کہیں سے مل جاتا۔ان الجھے ہوئے دنوں میں وہ خود پر قابو پائے ہوئے اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی اور مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ یہ دن کیسے گزرے گا۔یہ اتنا طویل کیوں ہو گیا ہے؟

نادی کے کمرے سے باہر کے سارے منظر سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔حویلی سے پار اونچی دیوار سے کافی حد تک ہٹ کر کھیت تھے۔ان سے کچھ آگے کافی فاصلے پر بستی تھی جس کے کچے پکے گھروں کی چھتیں ہی وہ دیکھ سکتی تھی۔نیلا آسمان، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے اور درخت ہی اسے دکھائی دیتے۔بعض درخت تو اس کے ساتھ ساتھ بڑھ کر تناور ہو گئے تھے اور کئی سوکھ کر ختم ہو گئے تھے۔وہ ان مناظر کو اس قدر دیکھ چکی تھی کہ ان میں کوئی نیا پن محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ہاں اگر کوئی تبدیلی ہوا کرتی تھی تو یہ کہ کھیتوں میں فصلیں بدل جایا کرتی تھیں۔اگتی، کٹتی فصلوں کو دیکھتی رہ جاتی یا پھر طلوع آفتاب کا منظر، جو کبھی ایک جیسا نہیں ہوتا تھا۔ہر روز سورج ایک نئے منظر کے ساتھ آتا تھا۔یہ اس نے تجربہ کر لیا تھا مگر یہ تجسس ضرور تھی کہ کیا سورج غروب بھی ایک نئے منظر کے ساتھ ہوتا ہے؟ کیونکہ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو اپنی کھڑکی سے دیکھ نہیں سکتی تھی۔وہ باہر کی دنیا اس کھڑکی سے دیکھ سکتی تھی یا پھر دادی اماں سے ہونے والی گفتگو میں، جس میں ہمیشہ خوف ہی ہوتا۔ڈرا دینے والی نصیحتیں ہوتی تھیں۔اسے تو لفظوں سے دیکھے جانے والی دنیا ہی پیاری لگتی تھی۔لفظ اسے خود میں جذب کر لیتے۔ایک ہی منظر کو وہ خود ہی کئی بار دیکھ سکتی جو لفظوں سے بنائے گئے ہوتے تھے۔کتابوں اور رسالوں کے جھروکوں سے وہ ایک نیا جہاں دریافت کر چکی تھی۔جو کچھ ان کتابوں اور رسالوں میں سے دنیا اسے سمجھ میں آئی وہ اس کے لیے کسی بھی ونڈر لینڈ یا گم گشتہ جنت سے کم نہیں ہوتی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا ذہن حویلی کی روایت بھری زندگی کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجبور محض ہے۔ابھی وقت اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔

"اے نادی!"

فرح کی آواز پر وہ بے ساختہ چونک گئی، پھر اس کے چہرے پر حیرت دیکھتے ہوئے بولی
"ہاں، کیا بات ہے؟"
وہ اس قدر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ فرح کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔
"لو! مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ جیسے خود نواب زادی کو پتا ہی نہ ہو۔" فرح نے حیرت سے پوچھا، پھر اس کی طرف دیکھ کر حیرت ناک انداز میں بولی۔
"ہائے! تم ابھی تیار بھی نہیں ہو؟" تب وہ اس کے سوال پر خیالوں سے نکلتے ہوئے چونک گئی، پھر جیسے ہی فرح کے پوچھے گئے سوال پر غور کیا تو وہ خوشگوار حیرت میں ڈوب گئی۔ اس لیے نہ سمجھ آنے والے انداز میں پوچھا۔
"کیوں، میں نے کیوں تیار ہونا تھا؟"
"ارے واہ! کیا شانِ بے نیازی ہے، حور شمائل کو، جیسے معلوم ہی نہیں کہ آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے۔ تم چاہے بھول جاؤ مگر میں نے سارا اہتمام کرلیا ہے۔"
وہ یوں چہکتے ہوئے بولی جیسے یہ اہتمام اس نے اپنے لیے کیا ہو۔ تب اس نے حیرانگی سے پوچھا
"تم، فرح تمہیں میری سالگرہ کا دن یاد تھا؟"
"اچھی طرح یاد تھا، بلکہ میں تو دعا میں! مانگ رہی تھی کہ تمہیں اپنی سالگرہ کا دن یاد نہ آجائے، اسی لیے میں نے چپکے چپکے یہ سارا اہتمام کرلیا؟"
وہ خوشی سے تھکتے ہوئے بولی تو نادی نے اس کا مان رکھتے ہوئے جھوٹ بول دیا
"ہاں! مجھے یاد نہیں تھا۔"
"ہاں نادی! یہی تو ایک دن ہوتا ہے جس میں ہماری اپنی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے تو خیر اجازت نہیں تمہاری وجہ ہی سے میں خوش ہو لیتی ہوں۔"
فرح کہتے کہتے ایک دم سے اداس ہوگئی پھر تیزی سے اپنا سر جھٹک کر بولی۔ "بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، امی اور دادی اماں دونوں ہی تمہارا نیچے انتظار کر رہی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جا۔"
یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ فرح کی دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت دیکھ کر اس کے من میں خوشی در آئی۔
"تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔"

نادی نے ایک جذب سے کہا تو فرح پلٹ گئی، پھر رک کر جاتے جاتے وہ کہتی چلی گئی۔
"میں نے بابا سائیں سے بھی عرض کر دیا تھا۔ وہ بھی آنے والے ہوں گے۔ جلدی سے آجا۔"
"آجاتی ہوں۔"
نادی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی، پھر اچانک ہی اس نے فیصلہ کرلیا۔ وہ تو نہیں چاہتی تھی کہ اس بار اپنے خیالات اور سوچوں کا اظہار کرے مگر قدرت شاید ایسا چاہتی ہے، ورنہ اگر اس نے اہتمام نہیں کیا تھا تو فرح یوں نہ کرتی۔ اب تو چاہے بھونچال آجائے یا طوفان، وہ اپنا مطالبہ ضرور رکھے گی۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اہتمام ہوگیا ہے تو یہ اشارہ ہے، تاکہ وہ اپنے دل کی بات کہہ دے۔ فیصلہ کرتے ہی وہ کھڑکی سے پلٹ گئی، کیونکہ اسے تیار ہو کر پیر سائیں کے آنے سے پہلے پہنچنا تھا۔
پورے برس کے دورانیے میں نادی کے لیے محض یہی ایک چھوٹی سے تقریب ہوا کرتی تھی، جس میں اس کے بابا جان قلاوہ شاہ المعروف پیر سائیں خصوصی طور پر شرکت کیا کرتے تھے، ورنہ تو کئی مہینے گزر جاتے اور وہ ان کی صورت نہیں دیکھ پاتی تھی۔ نادی کا تعلق ایک ایسے پیر گھرانے سے تھا جو اپنی ان روایات پر سختی سے پابند تھا جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھیں۔ یہ روایات کچھ ایسی تھیں کہ جن کے باعث حویلی کی خواتین نہ تو اپنی کوئی حیثیت رکھتی تھیں اور نہ انہیں کسی قسم کا کوئی اختیار تھا۔ حویلی کی چاردیواری کے حصار میں ہی وہ پابند رہتی تھیں۔ پردہ داری کی اس قدر پابندی تھی کہ سورج کی کرنیں بھی انہیں نہ دیکھ سکیں۔ وہ اگر سانس بھی لیتی تھیں تو گھرانے کے اس سربراہ کی اجازت سے جو ایک روحانی پیشوا ہوتا تھا۔ وہ دربار شریف کا گدی نشین ہونے کے باعث تمام تر فیصلوں کا مجاز تھا۔ وہ فیصلے حویلی کے ہوں، دربار شریف کے ہوں یا کسی کی زندگی موت کے سارے معاملات کا محور بھی پیر سائیں ہی ہوتے تھے۔ مریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جن سے وہ ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔ کون ان کے پاس آرہا ہے تو کسی کے ہاں یہ جا رہے ہیں۔ ایک نیٹ ورک تھا جیسے وہ بخوبی چلا رہے

تھے۔ نادی کے دادا کے بعد اس کے باپ نے گدی نشین ہونا تھا۔ مگر ایک دن قریبی شہر سے واپس آتے ہوئے وہ اپنی بیوی سمیت کار حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ نادی کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا تھا کہ اس کی والدہ کس کی اجازت سے اور کیوں ان کے باپ کے ساتھ حویلی سے باہر گئی کہ حادثے کا شکار ہوئی۔ آج تک وہ یہ معما حل نہیں کر پائی تھی۔ سوال تو ڈھیروں تھے، جیسے ایک یہ سوال کہ حویلی کی خواتین کبھی جب چاہے دربار شریف پر حاضری کے لیے چلی جایا کرتی تھیں، پھر انہیں روک کیوں دیا گیا؟ یہ واحد آزادی بھی ان سے کیوں چھین لی گئی تھی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ اسے آج تک کچھ نہیں آیا تھا اور نہ ہی معلوم ہو سکا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ نہ رہتی اگر وہ کار حادثے والے دن اپنی دادی اماں کے پاس نہ ہوتی، ورنہ وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ زندگی ہار جاتی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ بھی انہی کے ساتھ اس دنیا سے چلی جاتی۔ ایسے وقت میں کہ جب اسے کسی شے کا بھی شعور نہیں تھا۔ قدرت کو اس کی زندگی منظور تھی۔ دادی اماں نے اسے سنبھالا اور جہاں تک ہو سکا اسے لاڈ پیار سے پالا۔ دادا کے بعد جب اس کے چاچا ولاور شاہ گدی نشین ہوئے تو ان کی بیوی زہرہ بیگم پر پابندیاں کچھ زیادہ ہی ہو گئیں۔ حالانکہ اس وقت وہ ایک بیٹے ظہیر شاہ اور بیٹی فرح کی ماں تھی۔ یوں وہ چاروں خواتین حویلی کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ وہ ایک دوسری کے بارے میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموش تھیں، کیونکہ اسی میں ان کی بقا اور اسی میں ہی ان کی پناہ تھی۔

ظہیر شاہ کی تربیت پیر سائیں اپنی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اسے خوب تعلیم دلوائی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا گیا تھا، مگر نادی اور فرح کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ تو نادی جب ذرا باشعور ہوئی تو اس نے اپنی دادی سے مطالبہ کر دیا کہ اسے بھی ظہیر شاہ کی مانند تعلیم دلوائی جائے۔ دادی اماں کے لیے یہ مطالبہ کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے باقاعدہ کسی ادارے میں پڑھنے کے لیے تو نہ بھجوا سکیں لیکن بہت ساری بحث و تمحیص کے بعد حویلی ہی میں ایک خاتون ٹیچر کا انتظام کر دیا گیا، جو انہی کے مریدین میں سے ایک تھی۔ اس نے نہایت سعادت مندی سے اور ثواب سمجھتے ہوئے ان دونوں کو پڑھایا۔ یوں فرح اور نادی نے حویلی کی ہی چار دیواری میں میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی۔ پیر سائیں اتنی طاقت اور تعلقات رکھتا تھا کہ بورڈ کے پرچے حویلی ہی میں حل کر لیے گئے تھے۔ ایک پورا گاؤں پیر سائیں کی جاگیر تھا۔ نادی نے جتنی دلچسپی سے اپنی کورس کی کتابیں پڑھی تھیں، اتنی ہی پسندیدگی سے دیگر کتابیں اور رسالے بھی پڑھے تھے۔ جن کے پڑھتے رہنے سے اب اسے "ہوکا" لگ چکا تھا۔ اس نے حویلی ہی میں موجود ایک خاتون ملازمہ تاجاں، ان کے ذریعے ایسا راستہ پیدا کر لیا تھا کہ جہاں سے وہ باہر کی دنیا سے جو چاہتی منگوا لیا کرتی تھی۔ اس کی اس جرأت کا علم اس کی دادی کو تھا جسے وہ نظر انداز کرتی چلی آ رہی تھی۔ حویلی کی ان چاروں خواتین کی اپنی اپنی دنیا تھی۔ جس میں وہ کچھ سکھ کے ساتھ زندگی گزارتی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

☆......☆

مردان خانے کے صحن میں چند مرد اور خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر عقیدت کے چراغ روشن تھے۔ وہ سب پیر سائیں سے دعا کروانے آئے ہوئے تھے۔ کسی کی کچھ حاجت تھی، کسی کی کوئی خواہش۔ کسی کی کوئی مجبوری اس در تک کھینچ لائی تھی اور کوئی اپنے حالات پھر جانے کی تمنا لے کر وہاں آیا ہوا تھا۔ صحن کے آگے بڑا سا دالان تھا۔ جہاں وہ مریدین خاص موجود تھے جو آئے ہوئے عقیدت مندوں کو ایک ایک کر کے اس کمرے میں بھیج رہے تھے، جس میں پیر سائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ مردان خانے میں اگرچہ بہت سارے کمرے تھے۔ جہاں دور سے آئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ باقاعدہ ایک طعام خانہ بھی تھا، جہاں ہر وقت لنگر چلتا رہتا تھا۔ لیکن پیر سائیں کا کمرہ ان سب میں خاص کمرہ تھا۔ اس میں کسی کو اجازت کے بغیر داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پیر سائیں جب بھی باہر سے مردان خانے میں آتے تو وہیں ٹھہرتے اور پھر وہیں سے چلے جاتے تھے۔ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ وہاں کتنی

دیر تک قیام کرتے ہیں، ہاں مگر ظہر سے عصر تک کے درمیانی وقت میں وہ وہاں پر ضرور ہوتے تھے۔ جب وہ شہر میں نہ ہوں تب مجبوری ہوا کرتی تھی۔ اس کمرۂ خاص میں پیر سائیں موجود تھے۔ دھیمی روشنی میں بیٹھا وہ اور شاہ کوئی ماورائی مخلوق لگ رہا تھا۔ اس کا دراز قد، بھاری جثہ سفید رنگ کا مخصوص کرتا اور چادر، سر پر تیلیاری رنگ کی بڑی سی پگڑی، گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا، گھنی داڑھی، بھاری مونچھیں، لمبی زلفیں اور دائیں کلائی میں سونے کا کڑا تھا۔ گورے رنگ پر نقوش کافی حد تک تیکھے تھے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں شربتی سرخی خمار آلود دکھائی دیتی تھی۔ چند لمحے پہلے ایک خاتون اپنے دکھڑے رو کر اور دعا کی درخواست کر کے گئی تھی۔ پیر سائیں نے نہ صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے، بلکہ تعویذ بھی دیے تھے۔ دفعتاً اس کی نگاہ سامنے لگے وال کلاک پر پڑی، تبھی اس نے پاس پڑی ہوئی گھنٹی بجائی۔ ایک مرید خاص، پیراں دتہ فوراً ہی کسی چھلاوے کی طرح حاضر ہو گیا۔ وہ تقریباً جھکتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔

"جی حکم پیر سائیں۔"

"باہر کتنے لوگ ہیں؟" پیر سائیں نے دھیمے بارعب لہجے میں پوچھا۔

"تھوڑے سے ہیں سرکار۔" پیراں دتہ نے عاجزی ہی سے بتایا۔

"انھیں جلدی جلدی سے بھیج دو، آج مجھے زنان خانے جانا ہے۔" اس نے کہا اور آنکھیں موند لیں۔

"سرکار، وہ دیوان جی بھی آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ کہہ گئے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو وہ آ جائیں۔" وہ اسی عاجزی سے بولا تو پیر سائیں نے تیزی سے کہا۔

"نہیں، انھیں کہنا کہ مغرب کے بعد آ جائیں۔ اب جاؤ، جلدی جلدی لوگوں کو بھیجو۔"

پیراں دتہ یہ سنتے ہی الٹے پیروں پر واپس مڑ گیا۔ اس نے باہر آ کر لوگوں کو سمجھایا کہ وہ بہت کم وقت لیں۔ پیر سائیں نے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرا، ایک کے بعد ایک کر کے لوگ اندر جاتے اور پھر فوراً ہی واپس پلٹ آتے۔ یہاں تک کہ مردان خانے کے صحن میں کوئی عقیدت مند نہیں رہا۔ تب پیر سائیں اپنے خاص کمرے سے نکلے اور مردان خانے کے صحن میں آ گئے۔ تازہ ہوا میں تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد وہ زنان خانے کی طرف چل دیے۔

☆......☆

نادیہ تیار ہو کر نیچے آئی تو دادی اماں، زہرہ بی بی اور فرح کو اپنا منتظر پایا۔ وہی اس تقریب کے منتظم تھے اور وہی مہمان تھے اور کسی نے وہاں نہیں آنا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک جانب بڑا ڈائننگ ٹیبل انواع و اقسام کے کھانوں سے سجا دیا گیا ہوا تھا۔ کمرے کے درمیان میں پڑے صوفوں بیچ قیمتی فانوس کے نیچے میز پر بڑا سا کیک دھرا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اپنی دادی اماں کے پاس آ بیٹھی۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور بڑی ساری سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ بھی خاموش تھیں۔ اب فقط پیر سائیں کا انتظار تھا جو مردان خانے سے آنے والے ہی تھے۔ اس دوران نادی اپنے مطالبے کا اظہار کرنے کے لیے ہمتیں جمع کرتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح کیک کاٹنے سے پہلے پیر سائیں اس سے اسی کی پسند کے کسی تحفے کے بارے میں پوچھیں گے اور وہ ان سے ہمیشہ دعاؤں کی ہی طلب گار رہی تھی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی چاہ رہی تھی۔ پہلے تو اسے دعاؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ مل جایا کرتا تھا لیکن اس بار اسے کسی بھی قسم کے تحفے کی امید نہیں تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا۔ اس کا مطالبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ جسے کہنے کے بعد ممکن ہے آئندہ کبھی اسے سالگرہ منانے کی اجازت ہی نہ ملے۔

مغرب سے ذرا پہلے پیر سائیں حویلی میں آ گئے۔ سلام دعا کے بعد وہ آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ چاروں ارد گرد بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک حال احوال پوچھتے رہے، یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں، تب انہوں نے کیک کی طرف دیکھا اور نادی سے پوچھا۔

"نادیہ بیٹی! بتاؤ کیسا تحفہ پسند کرو گی۔" یہ سنتے ہی نادی چند لمحوں کے لیے تو پوری جان سے لرز گئی۔ وہ لمحہ آ گیا تھا جس کے لیے وہ اپنے اندر کی ساری ہمتیں جمع کرتی رہی تھی۔ اس کا دوران خون ایک دم سے تیز ہو گیا۔

"بتاؤ بیٹی! بولو کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی۔" زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو نادی چند لمحوں تک خاموش رہی، پھر پوری جان سے حوصلہ کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"پیر سائیں! مجھے کالج میں پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ آپ کا یہ تحفہ میرے لیے اب تک کے تمام تحفوں سے بھاری اور قیمتی ہوگا۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ اچانک گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہاں تک کہ سانسیں بھی کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ دادی اماں سمیت سبھی نے اس کی جانب یوں حیرت سے دیکھا جیسے سب کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو گیا ہو۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا مطالبہ کر دے گی۔ پیر سائیں نے چونک کر حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے دیکھنے میں انتہائی درجے کی بے یقینی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ایسے یوں تکتے رہے جیسے انہونی ہونے جا رہی ہو۔ خلا کے جیسے کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ جیسے وقت کو کوئی ہالا ہو اور اس کے درمیان سے سوئی غائب ہو گئے ہوں۔ تبھی پیر سائیں نے خود پر قابو پایا اور خلاف توقع انتہائی نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"تم جانتی ہو نادیہ بیٹی! تم نے کیا کہا ہے؟ حویلی کی روایات میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہاں کی خواتین باہر قدم نکال کر اسکول، کالج یا کسی ادارے میں جا کر پڑھتی پھریں۔"

"پیر سائیں! میری یہ خواہش ایسی نہیں ہے کہ جس سے حویلی کی شان میں خدانخواستہ کمی ہو جائے گی۔" نادی نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ یہاں کمزور پڑ گئی تو پھر ساری زندگی وہ اپنی کوئی بات نہیں منوا پائے گی۔ پیر سائیں خاموش تھے۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور تجربے کار شخص تھے۔ اس نے نادی کے مطالبے میں موجود بغاوت کی ہلکی سی رمق محسوس کر لی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت ہی نہیں تھا بلکہ دربار شریف سے ملحقہ زمینوں اور جاگیر کے باعث زمینداروں میں بھی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے زمینداروں کی مانند سیاست میں دلچسپی لینا ان کی مجبوری تھا۔ مریدین اور زائرین کی نفسیات سے واقف پیر سائیں نے وقت اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا، اس لیے بڑے اطمینان سے بولا۔

"ابھی تم یہ اپنی سالگرہ کا کیک کاٹو، چند دن بعد سوچ کر تمہیں بتاتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"

"میں انتظار کروں گی پیر سائیں۔" اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا، پھر کیک کاٹنے کے بعد انہوں نے کیک چکھا، اسے دعائیں دیں اور کھانا کھائے بغیر اٹھتے ہوئے بولے۔

"اس بار میں دس تولے سونے کا زیور تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔ زہرہ بی! تمہیں وہ زیور دے دے گی۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر جانے لگے تو نادی نے جلدی سے کہا۔

"آپ مجھے پڑھنے کی اجازت دے دیں، آپ کا یہی تحفہ میرے لیے بہت ہی قیمتی ہوگا۔"

پیر سائیں نے اس کی بات تحمل اور خاموشی سے سنی اور کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ تب دادی اماں نے اس کی جانب دیکھ کر انتہائی حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تم نے کس امتحان میں ڈال دیا ہے نادی۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ تجھے کبھی کسی کالج میں جانے کی اجازت نہیں دے گا، مگر تمہاری اس خواہش کے ردعمل میں ہوگا کیا، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھ سے تو بس یہی سوال ہوگا کہ تمہارے اندر ایسی خواہش پیدا کیسے ہوئی۔"

"انہوں نے اگر انکار کرنا ہوتا نا تو ابھی کر دیتے، انہوں نے کچھ سوچ کر ہی....." نادی نے کہنا چاہا مگر دادی اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اسی خاموشی ہی سے تو مجھے خوف آ رہا ہے۔ وہ کہیں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر دے، جس سے تم ساری عمر پچھتاتی رہو۔" اس کا لہجہ بھیگ چکا تھا، جیسے وہ ابھی رو دیں گی۔

"ایسا کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا

"یہ تو میں نہیں جانتی، لیکن یہ ممکن ہے کہ اب تمہاری شادی بہت جلد کر دی جائے۔" انہوں نے کہا۔

"میری شادی! اتنی جلدی" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"وہ ظہیر شاہ سے تمہاری شادی بھی کر سکتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ وہ لندن سے چند دنوں کے لیے یہاں آ بھی سکتا ہے۔" دادی نے یوں کہا جیسے اسے دکھ محسوس ہو رہا ہو۔

"کیا، وہ میری شادی ظہیر سے کردیں گے۔؟" نادی کے لیے یہ انکشاف حیرت زدہ کردینے والا تھا۔

"ہاں۔! اس کا بھی خیال ہے، بلکہ وہ اس معاملے پر مجھ سے بات بھی کرچکا ہے۔ پہلے تو یہی طے تھا کہ جیسے ہی ظہیر شاہ اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس آئے گا۔ تمہاری شادی اس سے کردی جائے گی۔ لیکن اب....." نادی نے جس انداز میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہوگئی۔

ظہیر شاہ سے شادی کا مطلب تھا کہ باقی زندگی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں میں دفن ہوجائے گی۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی کسی تعلق کے باعث اس کی رہائی ممکن ہوجائے گی، لیکن نہیں یہ اس کا وہم تھا۔ بڑے سائیں تو اس کے بارے میں کوئی اور ہی فیصلہ کرچکے تھے۔ زہرہ بی اور فرح تو پہلے ہی مہر بلب تھیں۔ ان کی تو یہ بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی کسی بات پر کوئی تبصرہ ہی کردیتیں۔ تبھی نادی نے عجیب سے لہجے میں ایک دم سے کہا۔

"او کے۔ امی ان کے فیصلے کا انتظار کروں گی، فی الحال تو اس وقت کو انجوائے کریں۔ کیں یہ کیک کھائیں۔" اس نے یوں پوز کیا جیسے کچھ کہی نہ ہوا ہو۔ لیکن وہ جتنی دیر بھی ان کے درمیان رہی، بہت ہی بددل اور بے چین رہی۔ پھر کسی نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ جلد ہی اپنے کمرے میں آگئی۔

شادی کے لفظ کے ساتھ جو رنگین تاثرات بندھے ہوتے ہیں۔ اس سے ہر لڑکی کے من میں ہلچل ضرور ہوتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ پڑ گئی مسلسل یہی سوچے چلے جارہی تھی۔ کالج جانے کا مطالبہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ اپنی شادی ہی کے بارے سوچتی چلی جارہی تھی، جو اس کے لیے ذرا بھی خوشگوار نہیں تھا۔ اسے سب سے بڑا فکر یہی تھا کہ بڑے سائیں کے بعد ظہیر شاہ نے گدی نشین ہوجانا تھا اور اس کی زندگی زہرہ بی کی مانند ہوجانے والی تھی۔ ایک بے جان وجود کی مانند جس کا مقصد فقط حکم کی بجا آوری تھا۔ ان کا خاندان کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ رشتے داروں میں فقط زہرہ بی کا ایک بھائی تھا، جس کی اولاد ان سے چھوٹی تھی۔ ظاہر ہے اگر اس کی شادی ظہیر شاہ سے نہ ہوتی تو پھر ساری زندگی یونہی گزارنا تھی۔ یہی ہیاں

تھی، جیسے فرح تھی۔ اس کے بارے میں بھی یہی گمان تھا کہ اس کی شادی نہیں ہونے والی تھی۔ وہ کسی دوسرے خاندان کی لڑکی بیاہ کر لاسکتے تھے مگر اپنی لڑکی کسی کو نہیں دیتے تھے۔ یہ بھی حویلی کی روایت میں سے ایک روایت تھی۔ وہ گھبرا کر بیڈ سے اٹھ گئی، کیونکہ نادی ایسی زندگی جینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے آپ کو یوں دیکھا، جیسے کوئی اجنبی کسی کو دیکھ رہا ہو۔ وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ جس میں بھرے بھرے بدن والی بوٹے سے قد کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ گداز بدن، سفید شہد ملا رنگ، سیاہ گھنگھریالے گھنے گیسو، جو اس کی کمر تک جھول رہے تھے۔ مناسب سی گردن پر گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، ہلکی نم لیے ہوئے سرخ لب، مناسب ناک اور بھاری بھاری گداز گال، جس کے دائیں جانب گہرا ڈمپل پڑتا تھا۔ اس نے اپنے دونوں گداز ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں سے اپنے گھنے گیسوؤں کو باندھا تو عکس نے اس کا پورا سراپا نمایاں کردیا۔ اس نے اپنا آنچل درست کیا اور خود کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کالج یونیفارم میں وہ کیسی لگے گی یا پھر دلہن کا لباس اس پر کیسا سجے گا۔ وہ سوچوں ہی سوچوں میں ان ہیولوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بیڈ پر آکر سوچنے لگی کہ پتا نہیں آئندہ دنوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ کالج جا بھی پائے گی یا نہیں یا پھر اسی چاردیواری میں وہ نئے رشتوں کی زنجیریں پہن کر سسکتے رہنے پر مجبور ہوجائے گی۔ اس رات نادی نے بڑی شدت سے اپنے والدین کو یاد کیا تھا۔ جن کا چہرہ بھی اسے یاد نہیں تھا۔ چند تصویریں تھیں، جن سے وہ اپنے والدین کے خال وخد یاد رکھے ہوئے تھی۔ اگر وہ ہوتے تو شاید اسے یوں مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ زندگی نجانے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں کھوگئی۔

☆.....☆

شعیب تیار ہوکر ناشتے کے لیے میز پر آن بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کی والدہ زبیدہ خاتون کچن میں مصروف تھیں۔ برسوں سے یہی معمول تھا کہ ناشتہ کرتے ہی وہ گھر

سے نکل جایا کرتا تھا، کیونکہ سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اس کی امی کے پاس وہ لڑکیاں آنا شروع ہو جاتی تھیں جو ان سے سلائی کڑھائی سیکھتی تھیں۔ ان ماں بیٹے کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا نجانے کب سے طے پا گیا تھا، جو چلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا، جب اس کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کا باپ ایک مناسب عہدے پر فائز سرکاری ملازم تھا۔ اس نے پچھلے وقتوں میں اس جگہ گھر بنا لیا تھا جو اس وقت تو عام سا علاقہ تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ اب وہ کالونی پوش علاقہ سمجھی جاتی تھی۔ والد کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی امی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ چھت کا ہونا غنیمت تھا۔ لیکن پینشن کے روپے اتنے نہیں تھے کہ وہ گھرداری چلانے کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ اعلیٰ تعلیم دلوا سکتیں، جس کا خواب ان دونوں میاں بیوی نے کبھی دیکھے تھے۔ اپنے شوہر کے خوابوں کی تکمیل کے لیے اس نے سلائی کڑھائی شروع کر دی۔ جس سے ایک طرف اس کی آمدن میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب اس کی تنہائی کا مداوا ہو گیا۔ کالونی اور آس پاس کے علاقوں کی لڑکیاں اس کے پاس آنے لگی تھیں، جس سے سارا دن ان کے گھر میں میلہ لگا رہتا۔ خواتین آجا رہی ہیں۔ لڑکیاں چہک رہی ہیں۔ سینے پرونے کا کام کر رہی ہیں۔ آنا فانا اس کے گھر سے کام بھی ہو رہے ہیں۔ سہ پہر کے بعد ان کے آنگن میں خاموشی چھا جاتی۔ تب وہ بھی گھر واپس آ جایا کرتا تھا۔ پھر رات سو جانے تک دونوں ماں بیٹا خوب باتیں کرتے۔ ماں اپنی خواہشیں دہراتی اور بیٹا روزانہ بڑا آدمی بننے کا عزم کرتا۔ باپ کا خواب، ماں کی خواہش بن کر اسے سننے کو ملے تو اسے اپنی زندگی کا مقصد مل گیا۔ وہ اپنی تعلیم میں اس قدر محو ہوا کہ اردگرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ اس نے خود کو پڑھائی کے لیے وقف کر دیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا ہوا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کالج دور میں آتے ہی وہ خود بھی تھوڑا بہت کمانے لگا تھا۔ یوں ایک تنگی بندھی زندگی بھی جس میں وہ خوش تھا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا تو بڑے اچھے نمبروں میں پاس ہو گیا۔ انٹرویو پاس کیا اور ٹریننگ مکمل کر لی۔ ان دنوں وہ تعیناتی کے احکامات کا منتظر تھا لیکن پھر بھی وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر ناشتے کی میز پر تھا، کیونکہ اس نے گھر سے نکل جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

"شعیب پتر! یہ تمہیں تعیناتی کے آرڈر کب ملیں گے۔؟" ناشتا کر چکے تو چائے پیتے ہوئے اس کی امی نے پوچھا۔

"بس جلدی مل جائیں گے۔ مجھے خود بڑا انتظار ہے۔" وہ ہولے سے بولا

"میں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر کہیں نزدیک تعیناتی ہوئی ہے تو پھر میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی، لیکن اگر کہیں دور تجھے جانا پڑا تو پھر میں تیرے ساتھ ہی جاؤں گی۔" اس کی ماں نے جذب سے کہا۔

"اور یہ جو آپ کی اتنی ساری فوج ہے، اس کا کیا ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کر لیا ہے بندوبست، ایک غریب بیوہ ہے۔ اس کے حوالے کر جاؤں گی۔ اب تو ویسے بھی مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ تجھے بہت ساری ترقیاں ملیں، میری تو اب یہی دعا ہے۔" اس نے پھر اسی جذب سے کہا تھا۔

"آپ ہی کی دعاؤں کے سہارے چلتا چلا جا رہا ہوں، بھلا میری ماں دعا کرے اور وہ قبول نہ ہو ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے خالی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا تو اس کی ماں کا دل بھر آیا۔ تبھی وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسو اس کا بیٹا دیکھ لے اور یونہی پریشان ہو جائے۔ شعیب اٹھا اور اپنی پرانی بائیک لے کر باہر نکل گیا۔

اس کا رخ بھاء حمید کی ورکشاپ کی طرف تھا۔ وہ ورکشاپ ریلوے اسٹیشن کی پچھلی جانب پھیلی ہوئی آبادی میں موجود ایک بڑی سی چار دیواری کے اندر تھی۔ وہاں بھاء حمید اور دوسرے چند لوگوں کی ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے رہتے تھے۔ وہیں مکینک اور اس کام سے وابستہ دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ بھاء حمید نے اپنا چھوٹا سا دفتر بنایا ہوا تھا۔ جہاں وہ سارا دن لوگوں سے گپیں لگاتے اور ملتے ملاتے گزار دیتا تھا۔ وہ انہی کی کالونی میں رہتا تھا۔ رکشے ٹیکسیاں ہونے کی وجہ سے خود کو ٹرانسپورٹر خیال کرتا تھا۔ بنیادی طور پر شریف آدمی تھا لیکن جس دنیا سے تعلق رکھتا تھا، اس میں تھوڑی بہت غنڈہ گردی کرنا ہی

پڑتی تھی۔ شاید شعیب اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ اور کرتا اگر اسے بھا حمید جیسا ہمدرد شخص نہ ملتا۔ اس نے شعیب کو حساب کتاب لکھنے کے لیے رکھ لیا تھا اور باقاعدہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ جبکہ شعیب کے والد نے اس کی بہت مدد کی تھی اور وہ اب تک اس کا احسان چکا رہا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ شعیب بھی اس کے لیے کئی کام کر دیتا تھا کبھی کسی دفتر کے اور کبھی کسی دفتر کے۔ وہ اس ماحول میں پوری طرح رچ بس گیا تو ڈرائیور نہ ہونے یا پیسوں کی ضرورت کے باعث وہ خود ٹیکسی یا رکشا لے کر نکل جاتا۔ کچھ نہ ہوتا تو ورکشاپ ہی کے ایک کمرے میں پڑا پڑھتا رہتا یا پھر قریبی پارک میں چلا جاتا۔ اگرچہ اس کا مقصد ایک بڑا آفیسر بننا تھا تاہم اسے شعور آگہی زمانے ہی کو برتنے سے ملی تھی۔ روزانہ مختلف لوگوں سے ملنے ملانے سے واسطہ پڑنے کے باعث نہ صرف وہ زمانے کے تیور سمجھ چکا تھا بلکہ دوسرے اسے بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ ٹریننگ کے دوران وہ کئی کئی دن ورکشاپ نہیں آ سکا تھا۔ اس دن جب اس نے ورکشاپ میں اپنی بائیک روکی تو بھا حمید اسے دیکھتے ہی کھل گیا۔

"اوئے آ او شعیب، کیا حال ہے تیرا۔ اب تو کبھی کبھی دکھائی دے جاتا ہے۔ افسر بن گیا تو پھر کہاں آسکے گا۔"

"کیوں پھر کیا ہو جائے گا۔" شعیب نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"او نہیں یار، بندہ مصروف ہو جاتا ہے نا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تو ہمیں بھول جائے گا۔" بھا حمید نے جلدی سے اپنی بات کی تصیح کر دی، پھر اپنے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ "لے چل پکڑ اخبار اور سنا خبریں، پتا چلے کہ ملک کے حالات کیا چل رہے ہیں؟"

"بھا، مجھے یہ بتا آپ کے اس طرح اخبار سننے سے ملک کے حالات درست ہو جائیں گے۔" اس نے اخبار پکڑتے ہوئے کہا۔

"بات تیری ٹھیک ہے۔ پر یار ہمیں معلومات ہوں گی تا حالات کے بارے تو ان کے درست ہو جانے کی امید بھی کر سکتے ہیں نا اور جس شے کے بارے میں پتا ہی نہیں، اس کی اُمید کہاں۔ چل تو سنا جلدی سے موٹی موٹی خبریاں، اتنے میں چائے آ جاتی ہے، پھر لگاتے ہیں گپیں۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور چھوٹے کو چائے لانے کے لیے آواز دے دی، پھر بھا خبریں سنتا رہا اور اپنی طرف سے ان پر تبصرے کرتا رہا۔ شعیب نے وہاں چائے پی اور اپنی آئی ہوئی ڈاک دیکھنے لگا۔ ان میں کچھ ادبی رسالے تھے یا پھر لوگوں کے خط، جنہیں پڑھ کر وہ جواب دینے لگا۔ اس کی ایک ہی دلچسپی تھی جسے وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ وہ شاعری کرتا تھا لیکن قلمی نام سے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس کی ایک الگ سے شخصیت بھی ہے۔ یہ دلچسپی بھی اسے یونہی ہو گئی تھی۔

شعیب جس پارک میں جا کر پڑھتا تھا۔ وہیں ایک ادھیڑ عمر کلہاڑی نجم شیرازی بھی آ جایا کرتے تھے۔ وہ دوپہر سے کچھ دیر پہلے پارک تقریباً سنسان ہوتا تھا۔ ایسی خاموشی جو اس کی پڑھائی کے لیے بہت موزوں ہوتی تھیں۔ وہ نجم صاحب کو دیکھتا تھا جو اکثر تنہا آتا خود میں اظہار رہتا اور پھر چلا جاتا۔ پہلے پہل تو شعیب نے اسے فاتر العقل ہی سمجھا تھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں میں علیک سلیک بڑھی تو نجم صاحب ایک زبردست شاعر نکلے، پھر معاملہ شناسائی سے بڑھا اور اس حد تک آ گیا کہ شعیب کو بھی شاعری میں دلچسپی ہونے لگی۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"سر جی۔ لوگ کہتے ہیں نا کہ شاعری تب ہوتی ہے جب بندہ عشق میں ناکام ہو جائے۔ تو نجم صاحب جذبات اور احساسات......"

"ارے میاں، کہاں کی لے بیٹھے ہو آپ، محبت میں ناکامی ہی وجہ شاعری نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی اپنی وسعت نگاہ ہے کہ آپ کہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ قدرت کے مناظر ہیں، فطرت ہے، کائنات ہے۔ اور پھر یہ خود انسان، جو اپنے اندر ایک کائنات ہے۔ اس کے رویے ہی کو آپ شاعری میں لے آئیں تو آپ ساری زندگی محض چند پہلو بھی غالباً پوری طرح بیان نہیں کر پائیں گے۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"چلیں، یہ تو طے ہو گیا نا کہ کوئی نہ کوئی ٹارگٹ، وجہ یا مقصد تو ہوگا نا ذہن میں، جس کے گرد شاعری گھومتی ہے۔ لیکن ایک شے ہے ہی نہیں اور اس کے لیے شاعری کرتے چلے جانا۔" اس نے باقاعدہ بحث چھیڑ دی۔

"ارے میاں، روایتی باتیں کرتے رہیں، کس نے روکا ہے۔ الفاظ جوڑنا اور ان سے مصرعے ترتیب دینا، روایتی خیالات کو نئے نئے پیرہن دے دینا، یہ الگ بات ہے۔ آپ نے دریافت کیا کیا؟ یہی دریافت ہی آپ کی شاعری کو انفرادیت بخشے گی۔"

شعیب کو بنیادی نکتہ کیا ملا وہ اس پر بہت کچھ سوچنے لگا، یہاں تک کہ ایک دن اس نے ایک نظم کہہ ڈالی، پھر جھجکتے ہوئے وہ نظم نجم صاحب کو لا دکھائی۔ انہوں نے بڑے شوق سے وہ نظم دیکھی اور پھر اونچی آواز میں پڑھنے لگے۔

خوابوں میں اتری ہوئی ایک موم بدن سی لڑکی نے
رات کے پچھلے پہر خاموشی اور برف زدہ سے کمروں میں
سردیوں میں دھوپ کے جیسے لہجے میں یوں خواب کہے
نہر کنارے بیٹھ کے پتھر پھینکوں میں بس پانی میں
تکتی رہوں ان دائروں کو جو بن جاتے ہیں پانی میں
چھوٹی سی دیواروں والے گاؤں کے کچے گھر میں، میں
بیٹھ کر چوکی پیڑھی پر وہ اکسن بجاتی تھک جاؤں میں
تنے سے ٹیک لگا کر جھولوں پیڑ صنوبر کے نیچے میں
سفید گلاب کی پتی پتی دیر تک گنتی رہوں میں
سبز سے والے بڑے سے گھر میں، کاسنی رنگ کا جوڑا پہنے
کرن دھنک کی ساری چوڑی، آنکھیں خوب سجاؤں میں
سر پہ سرخ سے گالوں والے بچوں کے سنگ کھیلوں میں
کھلی ہوئی کھڑکی میں بیٹھوں، بادل دیکھوں اٹھلے اٹھلے
چاند شرارت سے آنکھ مارے، ہستی رہوں تکتے پہروں میں
اپنے خواب سنہرے کہہ کر تکتی دیر وہ میری ہی
میں تو کچھ نہیں کہہ سکا اس کو، میری کیا لگتی تھی وہ
جسم کے بازار میں بیٹھی لذت بیچنے والی تھی وہ
میں تو دیکھ رہا تھا، اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں

نظم پڑھنے کے بعد نجم صاحب نے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ خواب ہیں جو ہر ایک لڑکی دیکھتی ہے۔ یہ بتا رہا ہے کہ ایک لڑکے نے لڑکی کے خوابوں کو محسوس کیا، لیکن اس میں جو آخری والے مصرعے میں بات کہی گئی ہے۔ یہی ساری نظم کی بنیاد بن گیا یعنی جبر، جو خوابوں کی تکمیل میں حائل ہوتا ہے۔ یہ جبر جتنا زیادہ ہوگا خواب اتنے ہی سنہری ہوں گے۔ احساس و جذبات میں بھیگے ہوئے خواب زندگی کو تازگی دینے کا سبب بنتے ہیں۔ جسم بیچنے والی کے پاس بھی تو یہی خواب ہیں۔ وہ بھی اندر سے ایک عورت ہے۔ چاہے وہ جتنی غلیظ ہے اور اس لڑکی کے خواب، جو معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ ذرا اسے سوچو، تمہیں زندگی کی اصل روح دکھائی دے جائے گی۔"

وہ نظم جو نجم صاحب نے جذب سے پڑھی اور پھر اس پر تبصرہ کیا۔ اس نظم نے شعیب کی آئندہ شاعری کا رخ متعین کر دیا۔ وہ سوچتا کہ لڑکیاں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں۔ کس طرح کی لڑکی کے خواب کیسے ہوتے ہیں۔ وہ خوابوں کی باتیں اپنی شاعری میں کرنے لگا تھا، پھر اس نے ایک خیالی پیکر تراش لیا۔ کئی ساری لڑکیوں کی خوبیاں اس ایک پیکر میں اکٹھی کر لیں۔ چند دن اسے سوچتا رہا تو اس کا جی ایک دم سے اوب گیا۔ اس نے اس خیالی محبوبہ کو یوں ختم کر دیا جیسے بچے ریت کا گھروندہ توڑ دیتے ہیں۔ اسے ایک عام سی لڑکی سے ہمدردی تھی جو اپنے اردگرد کے حالات سے فرار حاصل کر کے خوابوں میں پناہ تلاش کرتی ہے۔ شاید اس کے ذہن میں بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی موجود تھی، جس میں ایک شہزادی، ایک ظالم دیو کی قید میں ہوتی ہے۔ کہانی پڑھ کر اسے بڑا غصہ آیا تھا کہ یہ دیو جو ہوتے ہیں شہزادیوں کو ہی کیوں قید کرتے ہیں۔ اسے شہزادی سے بڑی ہمدردی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اب اسی شہزادی کے لیے شاعری کرے گا۔ وہ شعر کہتا اور نجم صاحب کو دکھاتا، وہ پسند کرتا اور بڑے مزے سے مشورے دیتا۔ ایک خیالی دنیا انہوں نے تراش لی تھی۔ شعیب نے اپنا قلمی نام اختر رومانوی رکھ لیا اور اسی نام سے شائع بھی ہونے لگا۔ پھر قارئین کی طرف سے تعریف و تنقید بھرے خطوط اور فون ملنے لگے۔ کئی لوگ اس سے باتیں کرتے۔ یوں ایک دلچسپ مشغلہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ شعیب ایک نیا کردار تخلیق کر کے اس کے مزے لینے لگا۔ چند لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شعیب ہی اختر رومانوی ہے۔ شاید وہ بھا وحید سے بھی اپنی شاعری چھپا جاتا لیکن نجم صاحب، جن سے وہ شاعری سیکھا کرتا تھا، ورکشاپ آنے لگے۔ وہاں بیٹھ کر چائے پیتے، گپ شپ لگاتے اور شاعری کے پر باتیں ہوتیں۔ بھا وحید ان دونوں کی

باتوں پر ہنسا کرتا تھا۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر باتیں ہوتی تھیں۔ شاعری سے متعلق ساری ڈاک ورکشاپ کے پتے پر آتی تھی۔ یوں شاعری شعیب کے گھر سے باہر ہی رہی۔ ٹریننگ کے ان دنوں میں شعیب نے بہت لکھا اور پھر اسی مناسبت سے شائع بھی ہوا۔ اس کی زندگی میں جو ٹھہراؤ تھا۔ خیالی دنیا میں پہنچ کر وہ بہت اکیلا محسوس کیا کرتا تھا۔ یوں اس کی زندگی بڑے پرسکون انداز میں گزرتی چلی جا رہی تھی۔

☆.....☆

دوسرے دن کی شام ہی کو پیر سائیں کی طرف سے نادیہ کے لیے بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سمیٹے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے گول کمرے میں جا پہنچی۔ پیر سائیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ سلام کر کے ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ وہاں صرف دادی اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کسی نے اسے وہاں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا بلکہ اس کے سلام کرنے کے فوراً بعد ہی پیر سائیں گویا ہوئے۔

"مجھے افسوس ہے بیٹی کہ میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق تحفہ نہیں دے پا رہا ہوں، میں تمہیں کالج جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ میں اپنی خاندانی روایات کے خلاف نہیں جا سکتا اور نہ ہی کسی کو یہ روایات توڑنے کی اجازت دوں گا۔ آئندہ تم بھی سوچ سمجھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا کرو، اب تم جا سکتی ہو۔"

لمحوں میں سنایا گیا فیصلہ سن کر وہ وہاں نہیں رکی۔ سیدھی اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عورت ہونا کوئی جرم ہے کیا۔ ہماری کوئی خواہش، کوئی ارمان یا کوئی امید نہیں ہوتی۔ ہمیں یہاں دیواروں کے بیچ قید کر کے آخر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ سوچ کا یہی سرا بنیاد بن گیا اور پھر نجانے وہ کتنی دیر تک روتی رہی، کافی دیر بعد اس کی دادی اماں اس کے پاس آئی اور دھیرے دھیرے تھپکنے لگی۔

"یہ ہماری قسمت ہے بیٹی کہ ہم اس خاندان کا حصہ ہیں۔ ہمیں اس حویلی میں اسی طرح ہی جینا ہے۔ اسی طرح زندگی گزارنے سے سمجھوتا کر لو، اسی طرح جینے کی عادت ڈال لو ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔" انہوں نے بھیگے ہوئے لہجے میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ نادیہ چونک گئی۔ اس نے دادی اماں کے لہجے میں اتنی حسرت پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ نادیہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"دادی اماں! میں اب کوئی خواہش نہیں کروں گی اور نہ کوئی گلہ میری زبان پر آئے گا، کوئی شکوہ نہیں سنیں گی آپ۔" یہ کہتے ہوئے وہ ان کے گلے لگ گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے لاشعور میں بغاوت زدہ سوچ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ اگرچہ نادیہ بددل تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ کتابوں میں کھو گئی۔ وہ ہوتی، اس کا کمرہ ہوتا، اس کی تنہائی ہوتی اور کتابوں کا ڈھیر اس کے اردگرد جمع رہتا۔ اس کی اپنی خصوصی ملازمہ پر نوازشیں بہت ہونے لگیں، جو باہری دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ وہی اسے نئی نئی کتابیں اور رسالے لا کر دیتی تھی یا پھر وہ چیزیں جن کی اسے ضرورت ہوتی تھی۔ ایک دن ایسے ہی وہ ایک ادبی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ شاعری کے حصے میں ایک صفحے پر دو غزلیں ایسی تھیں جو اس کے دل کو چھو گئیں۔ کیا اچھوتا پن تھا ان میں۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کے خوابوں کو بڑے حسین انداز میں لفظوں کے ریشمی غلاف میں سجا کر اسے پیش کر رہا ہو۔ اس نے جتنی بار وہ شاعری پڑھی، اتنی بار ہی وہ نئے خیالوں میں کھو گئی۔ کوئی شے کتنی پیاری ہو جاتی ہے۔ یہ دل کو چھو جانے کے بعد کی کیفیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ شاعری اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس نے شاعر کا نام پڑھا۔ "شعر روبازی، کیسا شاعرانہ نام ہے اس کا۔ میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں پڑھا؟" اس نے خود سے سوال کیا پھر اس کے جواب میں نادی نے پرانے رسالوں میں اس کی شاعری تلاش کرنے لگی۔ نادی کو کہیں کہیں اس کی شاعری دکھائی دی، جسے پڑھنے سے اس کی تشنگی مزید بڑھ گئی۔ وہ پہلے انہیں نظرانداز کر گئی تھی۔ اب کی بار پڑھا تو اس کی کیفیات وہی ہونے لگی جو اس کی شاعری پڑھ کر پہلے دن ہوئی تھی۔ ایک دم سے وہ شاعر اسے بہت اچھا لگنے لگا۔ چند دنوں میں اسے جتنی شاعری ملی، وہ سب اس نے اکٹھی کر لی۔ زندگی کا ایک نیا پہلو اس کے سامنے وا ہو گیا تھا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی اس کے خوابوں کو

یوں کھول کھول کر بیان کر دے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں اسے سوچنے لگی۔ یہاں تک کہ نادی کے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ وہ اختر رومانوی سے رابطہ کرے۔ دیکھیں تو سہی کہ گفتگو میں بھی وہ اس کے خوابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے مگر! فون کا حویلی میں آنا اور رکھنا اتنا ہی ہولناک تھا، جتنا وہ تصور کر سکتی تھی۔ خط وغیرہ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اختر رومانوی سے رابطے کی خواہش نہ صرف بڑھتی چلی جا رہی تھی بلکہ اسے بے چین کیے ہوئے تھی، وہاں سیل فون رکھنے کا جرم بھی اسے دہلائے دے رہا تھا، پھر خواہش جیت گئی۔ شاید اس جیت میں اس کے لاشعور میں پڑی بغاوت نے بڑا ساتھ دیا تھا۔ اس کی مخصوص نوکرانی نے ڈھیر ساری نوازشوں کے عوض اسے فون لا کر دے دیا۔ ملازمہ ہی کے بیٹے نے فون پر اسے سیل استعمال کرنے کے سارے طریقے سمجھا دیے۔ پھر اس دوپہر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان رسالے والوں کو فون کر دیا۔ جس میں اختر رومانوی کی شاعری چھپی ہوئی تھی۔ کافی دیر باتوں کے بعد اسے اختر کا نمبر مل گیا۔ احساس جرم میں اسے یوں لگا جیسے وہ پل صراط سے گزری ہو، مگر رابطہ نمبر مل جانے کی خوشی میں وہ سب کچھ نظر انداز کر گئی۔ جس وقت وہ اختر رومانوی کے نمبر ملا رہی تھی اس وقت جہاں ہاتھ کانپ رہے تھے وہاں دل بھی بڑی بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ہیلو۔ کون بات کر رہا ہے۔" دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا گیا تو اس کے بدن میں پھیلتی ہوئی لہر نے اسے ساکت کر دیا۔ خیالوں ہی خیالوں میں نجانے کتنی بار دہرائی گئی باتیں یوں صاف ہو گئیں جیسے کبھی لفظ اس کی دسترس ہی میں نہیں تھے۔ "ہیلو۔ بھئی بولیں کون بات کر رہا ہے؟" دل چیر کر اتر جانے والے لہجے میں کوئی بڑے پیار والی انداز میں پوچھ رہا تھا۔ تبھی اسے ہوش آ گیا۔ نادی نے پورے وجود کی ہمتیں اکٹھی کیں اور پوچھا۔

"کیا آپ اختر رومانوی بات کر رہے ہیں؟" اس نے محسوس کیا کہ اس کے کانپتے ہوئے لہجے میں لفظ تھر تھرا رہے تھے۔

"جی۔ میں اختر رومانوی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟" پھر اسی پرکشش لہجے میں پوچھا گیا۔

"میں آپ کی ایک فین بات کر رہی ہوں۔ آپ کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے تیزی سے کہہ دیا۔

"زہے نصیب اگر ہمارا بھی کوئی فین ہوا اور اس سے بڑی بات کہ میری شاعری آپ کو پسند آ گئی۔ اس پر میں آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔" وہی دل کھینچ لینے والی آواز میں شوخی در آئی تھی۔

"اس وقت میں آپ سے فقط دو باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔" نادی نے اختصار سے کہا تھا۔

"جی کہیے۔ پوچھیے۔" اس نے کہا۔

"ایک بات تو یہ ہے کہ آپ کہاں کہاں شائع ہوتے ہیں۔ میں آپ کی ساری شاعری پڑھنا چاہتی ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا میں آپ سے کبھی بھی بات کر سکتی ہوں۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

"جی، میں ابھی آپ کو ان رسالوں کی فہرست بتائے دیتا ہوں، جہاں جہاں میرا کلام شائع ہوتا ہے اور رہی دوسری بات تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی کہ آپ مجھ سے بات کریں گی۔ ہاں، جب میں مصروف ہوں گا تو آپ کی کال ریسیو نہیں کر پاؤں گا۔" اس نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا اور چند رسالوں کے نام گنوا دیے۔

"جی ٹھیک ہے، باقی باتیں پھر بعد میں ہوں گی۔" اس نے جلدی سے کہا اور کسی قسم کا کوئی الوداعی جملہ کہے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ نادی نے محسوس کیا کہ وہ پسینے میں بھیگ گئی ہے۔ اسے خود پر قابو پاتے ہوئے کتنا ہی وقت لگ گیا۔ وہ شام اور پھر رات سرشاری میں گزر گئی۔

پھر نادی کا معمول بن گیا۔ پہلے پہل وہ تھوڑی سی بات کرتی رہی تھی، پھر بات کھلی تو باقاعدہ موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ رات کی تنہائیوں میں لمبی لمبی باتیں خوشگوار مسرتوں کا باعث بننے لگیں۔ رنگوں اور خوشبو جیسی باتوں میں وہ اکثر بہک جایا کرتی تھی۔ اسے خیال ہی نہ رہتا کہ وہ کس طرح کی باتیں کرتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں اختر اسے سنبھال لیتا۔ دن کے وقت جب وہ ان باتوں کو یاد کرتی تو عجیب سے احساس اس سے لپٹ

جائے۔ صرف ایک بات اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پہچان اور تعارف نہیں دیا تھا۔ اختر پر یہ واضح نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کون ہے؟ نام تو اس نے نادیہ ہی بتایا لیکن کہاں سے بات کر رہی ہے یہ گول کر گئی۔ یوں باتیں کرتے ہوئے انہیں کئی دن ہو گئے تھے۔ نادی کے لیے زندگی کا یہ پہلو اس قدر حسین بن گیا کہ اسے لگا جیسے یہی پہلو حاصل زندگی ہے۔

ایک رات اس کے من میں ایک خواہش در آئی۔ جس پر اس نے چند لمحے سوچا اور پھر فوراً ہی اس کا اظہار اختر سے کر دیا۔ یہ بڑی خوبصورت سی خواہش تھی۔ چلتی ہوئی باتوں کے دوران اچانک اس نے پوچھا۔

"اختر! آپ دیکھنے میں کیسے ہیں؟"

"کیا مطلب۔ ادیکھنے میں انسان ہی لگتا ہوں۔" اس نے بات کو سمجھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"نہیں، میرا مطلب۔ آپ اتنی خوبصورت اور پیاری شاعری کرتے ہیں کہ دل کو چھو لیتے ہیں۔ اب یہ خواہش کچھ غلط بھی نہیں ہے کہ دیکھنے میں آپ کیسے ہیں؟" اس نے بھی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ بھئی ویسا ہی ہوں جیسے عام انسان ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ناک نقشے کی بات کر رہی ہو تو میں ٹھیک ہوں۔ کم از کم کہیں سے بے ڈھنگا نہیں ہوں۔" اس نے پھر اسی شوخی میں جواب دیا تھا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے حتمی انداز میں اپنے دل کی خواہش کہہ دی۔

"کیسے دیکھ سکیں گی۔ تم اتنی دور رہتی ہو۔ نہ تم مجھے مل سکتی ہو اور نہ میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آپ کی تصویر بھی تو کہیں شائع ہوئی ہو گی نا۔ آپ کسی میگزین میں اپنی تصویر شائع کروا دیں، میں دیکھ لوں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں صلاح دے ڈالی۔

"ایسا ممکن تو ہے لیکن آج تک میں نے تصویر شائع کروائی ہی نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیوں، کوئی خاص ہی معاملہ......؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بس یونہی......" اس نے پھر سنجیدگی ہی سے کہا۔ اب وہ کیا بتاتے کہ اس نے خود کو پہلے ہی چھپا رکھا ہے اور فرضی نام سے لکھ رہا ہے۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اس نے حیرت کی نار اضگی سے کہا۔ تب اس نے یونہی بہانہ بناتے ہوئے کہہ دیا۔

"میں اپنا مجموعہ کلام شائع کراؤں گا۔ تب اس پر تصویر بھی لگا دوں گا۔ تب تم دیکھ لینا۔"

"کب...... کب...... شائع ہو گا مجموعہ" اس نے بے تابی سے کہا۔

"جب میرے پاس پیسے ہوں گے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ بے چارے شاعروں کو اپنی کتابیں خود چھپوانا پڑتی ہیں، پھر خود ہی بیچنا بھی پڑتی ہیں۔ میں اتنا معروف شاعر تو ہوں نہیں کہ کوئی پبلشر مجھے مفت میں چھاپ دے۔ میرے جیسا غیر معروف بے روزگار شاعر کتاب چھپوا کر اپنے ہی ہاتھوں ذہنی اذیت نہیں سہ سکتا۔ یہ خودکشی جیسے والی بات ہے نا۔" اس نے یونہی اوٹ پٹانگ ہانکتے ہوئے ایک حقیقت بیان کر دی، جو بہت تلخ تھی۔

"کتنا خرچ آئے گا کتاب پر، وہ میں دے دیتی ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے آپ کتاب لے آؤ۔" وہ پھر سے اچانک فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ چونک گیا۔ اس لیے نادی کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"اچھا، ہم اس موضوع پر پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ہاں اس سے پہلے کیا موضوع چل رہا تھا۔" اس نے پہلو تہی کرتے ہوئے کہا تو وہ خواہ مخواہ میں ضدی ہو گئی۔ اس لیے اپنی رو میں بولی۔

"نہیں! آپ مجھے بتاؤ۔ کتنا خرچ ہو گا۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ، میں اس میں رقم بھجوا دوں گی۔"

"تم یہ سب رہنے دو۔ میں نے کتاب شائع کروانی ہوگی تو وہ ہو جائے گی۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے بچوں جیسی ضد کر لی۔

"تو ٹھیک ہے، آ جاؤ اور آ کر مجھے مل لو۔" وہ سکون سے بولا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے نہیں مل سکتی۔ یہ مجبوری خود نادی نے اسے بتائی تھی۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں نہیں مل سکتی۔ آپ کی

تصویر دیکھنے کے لیے میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ اپنی تصویر کسی میگزین ہی میں چھپوالیں، مگر اب جبکہ میں کتاب شائع کروانے کی بابت کہہ چکی ہوں، تو آپ میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔" نادی نے پورے خلوص سے کہا تھا اس لیے اس کا لہجہ تھوڑا ابھیگ بھی گیا۔

"نہیں۔ ابھی ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ قطعاً پسند نہیں کہ کوئی مجھے یہ احساس دلائے کہ میں اپنی کتاب بھی نہیں چھپوا سکتا۔ اس لیے اپنی بے جا ضد چھوڑ دو اور اس موضوع کو بدل دو۔ ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اس نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"اس طرح تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے میرے خلوص بھرے جذبات کو ٹھکرا دیا ہے۔ میں ایک اچھے دوست کی طرح کام آنا چاہتی ہوں اور آپ......"

"صرف اپنی اس خواہش کے لیے کہ مجھے دیکھ سکو۔ خیر ہم پھر بات کریں گے۔ اس وقت فون بند کر دینا ہی بہتر ہوگا۔" اس نے کہا اور کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔ نادی بے جان فون کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر اختر کو کال کی تو اس کا فون بند ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ بات نہیں کرے گا۔ اس نے یہی سوچا کہ کل تک اس بات کا اثر زائل ہو جائے گا۔ دوبارہ وہ ایسے کسی موضوع پر بات نہیں کرے گی جس سے اس کی انا مجروح ہو۔ سو اس رات اختر کی باتوں میں بھیگی ہوئی۔ لیکن اگلی رات اختر نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ کال پہ کال ملا کر اس نے ریسیو نہ کی۔ کیا وہ ناراض ہو گیا ہے؟ یا پھر کوئی اور معاملہ ہے۔ میں نے اتنی بے جا ضد تو نہیں کی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی واحد کھڑکی سے آن لگی۔ جہاں آ کر وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی۔

کھڑکی سے باہر کے سارے منظر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چاند بھی جیسے اس سے روٹھ گیا ہوا تھا۔ حویلی کی دیوار پر لگے برقی قمقمے جہاں تک روشنی پھیلا سکتے تھے وہاں تک کے سارے منظر اسے اپنے ساتھ جاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ورنہ اس سے آگے کھیتوں اور درختوں پر اندھیرا اترا ہوا تھا۔ دور گاؤں کے کچے پکے گھروں میں کہیں کہیں دیے کی مانند روشنی جھلملا رہی تھی۔ نجانے کیا دیر تک وہ یونہی ان تاریک منظروں کا حصہ بنی رہی تھی۔ شاید وہ ان منظروں سے اکتا کر سو چکی ہوتی اگر وہ اپنے آپ سے نہ الجھتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اختر اس کی فون کال نظر انداز بھی کر سکتا ہے؟ وہ مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ سیل فون بند ہوتا تو اسے چین آ جاتا۔ اگر وہ مصروف ہے تو محض ایک پیغام بھیج دے کہ وہ مصروف ہے۔ پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے اتنی بار کوشش کی ہو۔ پہلی بار پلٹ کر اس کا رسپانس نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے تھے۔ نجانے اس کے ساتھ کیا وجہ ہے؟ کیا وہ ناراض ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں نجانے کیسے کیسے خیال اس کے من میں اتر آئے تھے۔ اس نے اپنے اندر ہی سے اٹھنے والے وہم اسے ڈراتے رہے۔ کوئی ایسا متبادل ذریعہ بھی نہیں تھا کہ جس سے وہ کسی بھی معاملے کی تصدیق کر سکتی۔

نادی خود بھی الجھی ہوئی تھی۔ اختر ایک فون کال کی دوری پر تھا۔ یہی یقین تھا اور یہی ایک رابطہ، وہ اس کے لیے محض ایک آواز ہی نہیں تھا بلکہ نجانے کتنے خوابوں کی بنیاد بن گیا تھا۔ اس کا لہجہ نادی کے من میں سپنوں کا شہر آباد کر چکا تھا۔ صرف اسی آواز نے اس کے ایوان ذہن میں کتنے چہروں کی تصویریں ٹانک چکی تھیں۔ ہر چہرہ مکمل تھا مگر وہ کسی سے بھی مطمئن نہ تھی۔ وہ نت نیا چہرہ تخلیق کرتی چلی جا رہی تھی، بس اختر کی آواز تھی جو اس کی ذات کے گرد حصار بن کر چھا گیا تھا اور وہ لفظ لفظ اسے اپنی ذات میں یوں اتارتی چلی جا رہی تھی، جیسے بارش میں بھیگی ہوئی کوئی لڑکی شفاف پانی کی ٹھنڈک اپنی روح تک محسوس کرے۔

نادی کی الجھن ایک خیال کی وجہ سے تھی جو اس کے ذہن میں دھوئیں کی مانند پھیل گیا تھا اور اس نے نادی کی ساری سوچیں مفلوج کر دی ہوئی تھیں۔ اسے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر اختر گم ہو گیا اور اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو پھر وہ اسے کیسے تلاش کر پائے گی۔ آواز کی بھی ڈور ٹوٹ گئی تو پھر وہ کس کے سہارے اس تک رسائی پا سکے گی؟ وہ کس طرح کے صحرا میں آ گئی ہے۔ جہاں نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ غیر مادی سراب، جسے وہ چھو

نہیں سکتی۔ فقط اس کا احساس ہے۔ یہ بھی نہ رہا تو وہ کیا کرے گی؟ "فانی لمحات میں کوئی شے جھن سے اس کے اندر ٹوٹ گئی تو وہ بے ساختہ چونک گئی، کیا وہ اختر کے لیے اتنا ہی جذباتی ہو گئی ہے؟ کہیں وہ اس سے محبت تو نہیں کرنے لگی۔ کیا وہ ایک رائیگاں سفر پر چل نکلی ہے؟ واہمہ، حیرت اور انکشاف نے اس کے اندر ہلچل مچا دی۔ وہ خود کو یقین دلاتے دلاتے تھک کر چور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی پری کی مانند خوبصورت منظروں میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ رائیگاں سفر کی تھکن اور اس کی آبلہ پائی کی دکھن اس نے پورے وجود میں محسوس کی۔ تب اس کی آنکھوں سے چشمے ابل پڑے۔ وہ بے حس و حرکت کھڑکی ان تاریک منظروں میں جھانکنے لگی جو اس کے من میں بھی اتر آئے تھے۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب صبح کی اذان اس کے کانوں میں پڑی۔ تب وہ مایوس ہو کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔

☆.....☆

شعیب بائیک لے کر گھر سے نکلا تو اپنے ذہن پر خاصا دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سیدھا حمید کی ورکشاپ جائے گا لیکن پارک سے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اس نے بائیک پارکنگ میں کھڑی کی اور خود دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ایک سنگی بنچ پر آ بیٹھا۔ وہ ایک فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ رات جب وہ کھانا کھا چکا تو اس کی امی کچن سے چائے بنا کر لے آئی۔ انہی لمحوں میں نادیہ کی کال آنا شروع ہو گئی۔ اس نے دو بار نظر انداز کیا، پھر تیسری بار اس نے فون "خاموشی" پر لگا دیا۔ اس کی امی بڑے غور سے اس کی الجھن دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی تنی ہوئی تھی۔ اس لیے شعیب نے کپ اٹھا لیا اور کوئی بات نہیں کی۔ تب اس کی امی نے ہی پوچھ لیا۔

"کون تنگ کر رہا ہے تمہیں؟"

"کوئی نہیں، امی بس یونہی....." اس سے اپنی ماں کے سامنے جھوٹ بولا ہی نہیں گیا۔ اس لیے ادھوری سی بات کر کے گرم چائے کا سپ لے لیا۔

"دیکھو۔ اب تم ایک انتظامی آفیسر بن جانے والا ہے، جس کی اپنی ایک الگ سے منفرد حیثیت ہوتی ہے۔ تمہیں عام لوگوں سے ذرا ہٹ کر رہنا ہو گا اور یہ بھی ایسی کالیں تمہیں اب زیب نہیں دیتیں۔ جان چھڑا لے ان سے جو تمہیں رات رات بھر سونے نہیں دیتیں۔" امی نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے سرزنش کی۔

"بس امی، یہی ایک فون کال سنتا ہوں۔ یہ فارغ دن ہیں نا، جب مصروفیت ہو گئی تو یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔" اس نے یونہی بے جا سی دلیل دے دی تھی۔

"میں جانتی ہوں بیٹا کہ تم کردار کے بہت اچھے ہو، لیکن بعض اوقات معاملات اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ بندہ پھر چاہے بھی تو ان سے اپنا دامن نہیں بچا پاتا۔ جذبات انسان کے بہکاوے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ اس احتیاط بہتر ہوتی ہے۔ ہاں تم خود سمجھ دار ہو۔" امی نے بڑے دکھی لہجے میں اسے نصیحت کر دی تا کہ وہ سمجھتا رہے۔

"ٹھیک ہے امی جیسا آپ چاہیں۔" اس نے مزید بحث نہ کرنے کی غرض سے فوراً بات مان لی۔

اصل میں شاعری کی وجہ سے بہت سارے لوگ اسے فون کالز کرتے تھے۔ اسی تبصرہ و تنقید کے باعث اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی شاعری پڑھنے والوں کا ردعمل کیا ہے۔ نجانے کتنے لوگ آئے اور گئے۔ کسی سے ایک آدھ بار بات ہوتی تھی، کسی سے چند دن یا پھر کوئی چند ہفتے بات کرتا رہتا۔ یہ لوگ جس طرح آتے تھے اسی طرح اندھیری دنیا میں غائب ہو جاتے۔ یوں جیسے کبھی ملے ہی نہ ہوں۔ کسی نے خود تعلق توڑ لیا اور کسی سے خود اس نے بات کرنا پسند نہ کی۔ بات شاعری کے محور سے ہٹ کر، کسی اور راستے پر ڈالنے کی کوشش ہوتی، شعیب وہیں رک جاتا۔ یہ فقط نادیہ ہی تھی، جس کے ساتھ تعلق کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے فقط شاعری پر بات کی تھی اور اسی حوالے سے زندگی کو سمجھنا چاہا تھا۔ خود شعیب کے لیے یہ کردار بہت دلچسپ بن گیا تھا۔

"کیا سوچنے لگے ہو بیٹا۔" امی نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چونک گیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں چائے کا مگ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ امی نے مزید کوئی بات نہ کی اور خالی مگ اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ وہ اٹھا اور اپنے

کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سارے دن کی تھکی ہوئی ماں اب سو جائے گی۔ اس رات وہ نادیہ سے بات نہیں کر سکا۔ اس نے فون بند کیا اور سو جانے کی کوشش کرنے لگا مگر ساری رات وہ یونہی بے چین رہا۔ سوتے جاگتے اس نے وہ رات بتا دی تھی۔

وہ پارک کے پرسکون ماحول میں نادیہ ہی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ صبح جب اس نے فون کھولا تو پیغامات کی بھرمار تھی جو رات بھر وہ وقفے وقفے سے بھیجتی رہی تھی۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے تعلق نہیں رکھے گا۔ لیکن کیا وہ نادیہ کو بھی چھوڑ دے گا؟ سوال اسے خود بے چین کیے دے رہا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی وہ واحد لڑکی تھی جو بے ضرر ثابت ہوئی تھی۔ وہ جتنی بھی باتیں کرتی وہ بھی اس کے یا اس کی شاعری کے بارے ہی میں ہوتی تھیں۔ کہیں بھی کسی لالچ کا شائبہ نہیں تھا۔ وہ صرف اور صرف زندگی کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھی۔ نادیہ نے اپنی ذات کے اردگرد ایک حصار بنا رکھا تھا اور اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو اس حصار میں جھانکنے کی اجازت دے رہی ہو۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی ذات کو الگ کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ بینچ پر بیٹھا بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے اپنے من میں کوئی ایسا تھا جو سارے دلائل ہی نادیہ کے حق میں جا رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس سے ناتا توڑنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ انہی لمحات میں نادیہ کا پیغام اس کے سیل فون پر آ گیا۔ جس میں یہی سوال تھا کہ آخر وہ اپنی خاموشی کی وجہ تو بتا دے؟ تب جواز نہ ہونے کی کمی اسے کچھ مزید بڑھ گئی۔ شعیب نے لاشعوری طور پر اس کے نمبر پش کر دیے۔ چند لمحوں بعد ہی رابطہ ہو گیا۔

”اختر۔ ایسی کیا وجہ ہو گئی تھی جو آپ نے فون نہیں سنا۔“ نادیہ کے لہجے میں انتہائی تجسس اور خوف تھا۔

”بس یونہی رات میری طبیعت خراب تھی۔ اب ٹھیک ہوں۔“ اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ۔ مجھے ڈر تھا کہیں آپ گم ہی نہ ہو جائیں۔“ وہ جھجکتے ہوئے خوشگوار لہجے میں صاف گوئی سے بولی تو شعیب کو اس کی معصومیت بہت اچھی لگی۔

”اور اگر میں کسی دن واقعی ہی گم ہو گیا تو؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔ لیکن اتنا احساس ہے کہ میں زندگی کے خوبصورت ترین احساس سے محروم ہو جاؤں گی، جو میری زندگی میں خوشگواریت لے آیا ہے۔“ وہ جذب سے بولی

”کیا میرے ساتھ تعلق کو تم اتنی ہی اہمیت دیتی ہو۔“ اس کے حیرت سے پوچھا انہی لمحات میں اسے اپنی ہی کا خدشہ درست معلوم ہوا۔

”ہاں! ایسا ہی ہے اور یقین جانیں یہ انکشاف مجھے رات ہی ہوا تھا۔ آپ کے تعلق سے اب میں اپنی تنہا اور سپاٹ زندگی میں خوبصورت اور من موہنے خیالوں کا ہجوم اپنے ہمراہ پاتی ہوں جو مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتے اور یہ بھی کہ اب مجھے سپاٹ زندگی کی اذیت سہنا پڑتی ہے۔“ وہ بتا رہی تھی کس حد تک جذباتی ہو چکی تھی۔

”فرض کیا میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں تو پھر.....؟“ اس نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”جب وہ وقت آئے گا تو دیکھ لوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی تھی، پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی ”تو میں آئندہ آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“

”بات یہ ہے نادیہ۔ ابھی بے روزگار بندہ نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مجھے ان چند دنوں میں ایک نوکری کی امید ہے۔ اگر یہ نوکری لگ گئی تو پھر وقت بے وقت کی مجبوری تو ہو جائے گی نا..... راتوں کو دیر دیر تک کیسے باتیں کر سکیں گے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اختر۔ آپ شاعر ہیں۔ آپ تو اس بات کو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں اگر ان سے برسوں بات بھی نہ ہو تو بھی تعلق کے برقرار رہنے کا احساس رہتا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں آپ کی کسی کامیابی میں آڑے نہیں آؤں گی۔“ وہ پرسکون انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر ہم بات نہ بھی کر سکے تو ہمارے درمیان خوشگوار تعلق کا خوبصورت احساس ضرور رہے گا۔“ اس نے کہا اور ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔ رات سے جو لاشعوری پریشانی اس سے لپٹی ہوئی تھی وہ ایک

لمحے میں اس سے آزاد ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چند دنوں میں نادیہ اسے بھول جائے گی۔ جس طرح وہ بہت سارے لوگوں کو بھول گیا ہے۔ نادیہ کے لیے فقط یہی تھا کہ دھیرے دھیرے اسے چھوڑ دیا جائے۔ بہانہ تو اس کے ہاتھ لگ ہی چکا تھا۔ انہی لمحات میں ایسا کچھ من میں در آیا تھا کہ جس سے پورے وجود میں انجانا غبار پھیل گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا، خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ پارک سے اٹھا اور بھا وحید کی ورکشاپ چل دیا۔

اگلے دو دنوں میں وہ بہت مصروف رہا تھا۔ نادیہ سے بات ہی نہ کر سکا۔ اسے سلامت نگر نامی قصبے میں جا کر ڈیوٹی کرنے کا حکم نامہ مل گیا تھا۔ سلامت نگر تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا اور وہاں کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر متعین ہوا تھا۔ وہ قصبہ لاہور سے بہت دور تھا۔ شعیب سوچ میں پڑ گیا کہ پتا نہیں وہاں کا ماحول کیا ہوگا۔ اس نے پہلے وہ علاقہ نہیں دیکھا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے ساتھ امی کو لے کر جائے یا نہیں۔ اسی کشمکش میں اس نے یہی فیصلہ کیا کہ شروع کے دنوں میں وہ خود وہاں کا ماحول دیکھے گا، پھر بعد میں حالات دیکھ کر اپنی امی کو بلا لے گا۔ وہ گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کی امی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! پھر کہاں ملی تمہیں ڈیوٹی، میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں گی یا نہیں؟''

''امی۔ ابھی تو سوچ رہا ہوں۔ میں نے معلومات لی ہیں۔ وہ علاقہ بہت دور ہے یہاں سے، پتا نہیں کیسا ماحول ہوگا سلامت نگر کا۔''

''کیا۔ کیا کہا تُو نے.... کون سی جگہ ہے۔؟'' اس کی اماں نے ہذیانی انداز میں پوچھا تو شعیب چونک گیا۔ یہ اس کی امی کو کیا ہوا ہے ایک دم سے۔ اس نے جگہ کے بارے میں دوبارہ بتایا تو اس کی امی کی حیرت اتنی شدید تھی کہ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا، جیسے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ شعیب کے لیے یہ ردعمل حیرت انگیز تھا۔ سلامت نگر کے نام سے ان کی یہ حالت بھلا کیوں ہو گئی تھی۔ تبھی اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اماں، کیا ہوا ہے آپ کو۔ آپ کی حالت ایسے کیوں ہو گئی ہے؟''

''نہیں! کچھ نہیں..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم اپنی ڈیوٹی بدلوا لو..... کہیں اور چلے جاؤ.....'' وہ بے ربط سے لہجے میں بولی۔

''لیکن کیوں اماں؟'' اس نے شدت سے پوچھا تو اس کی امی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم بے خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

''اتنی دور..... اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ پہلی بار مجھ سے جدا ہو کر اتنی دور جا رہے ہو، تو عجیب سی حالت ہو گئی ہے میری۔ اتنی دور اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔'' اس کی امی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ تب وہ اٹھا اور اپنی ماں کو اپنے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے بولا۔

''میں کوشش کروں گا کہ وہاں نہ جاؤں لیکن یہ سرکاری احکام ہیں۔ پہلی بار اچھا نہیں لگتا۔ میں جلد ہی وہاں سے تبادلہ کروا لوں گا۔ یا پھر آپ کو بہت جلد ہی وہاں بلوا لوں گا اور اگر آپ میرے ساتھ ہی جانا چاہتی ہیں تو چلیں۔'' اس نے حتمی انداز میں کئی سارے آپشن اپنی ماں کے سامنے رکھ دیے۔

''تم بیٹا، جلدی سے تبادلہ ہی کروا لینا، پھر کسی اچھی سی جگہ پر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔'' امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا تو امی وہاں سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

امی کچن میں چلی گئی تو شعیب سوچ میں پڑ گیا۔ امی نے کبھی بھی ایسے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر ماں اپنے بچوں کے بارے میں جانتی ہے تو بچوں کو بھی ماں کی بدلی ہوئی معمولی سے حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سلامت نگر کے نام پر وہ یوں جذباتی کیوں ہو گئی تھیں۔ یہ محض اس کی دوری کی وجہ سے تھا یا پھر کوئی اور بات تھی؟ کچھ تھا، ورنہ وہ یوں ایک دم سے کھو نہ جاتیں۔ ایسا کیا تھا؟ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آیا، پھر اس کی امی چائے لے آئی تھیں۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی امی کی حالت دیکھ کر وہ ہمت ہی نہ کر سکا۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں چائے ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے بہر حال سلامت نگر جانے کی تیاری کرنا تھی۔

☆......☆

زبیدہ خاتون اپنے کمرے میں اندھیرا کیے جاگ رہی تھی۔ وہ بستر پر پڑی مسلسل سوچتی چلی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک اور امتحان آ گیا تھا۔ زندگی کا ایک طویل حصہ جو اس نے ریاضت میں گزارا تھا، وہ رائیگاں جانے والا تھا۔ وہ ماضی، جس سے وہ خود آنکھیں چرایا کرتی تھی۔ شعیب سے کیسے بیان کرسکتی تھی۔ اگر بتاتی ہے تو اس کا بیٹا ٹوٹ کر رہ جاتا۔ کتنی مشقت بھری محنت سے اس نے شعیب کو پروان چڑھایا تھا۔ اپنے بیٹے کو وہ جس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس مقام تک پہنچ گیا تھا۔ اب اگر اس کے ماضی کی جھلک بھی اس پر عیاں ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مقام کی اونچائی سے پستیوں میں جا گرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلامت نگر کا نام سنتے ہی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ مگر اسے اپنا آپ سنبھالنا پڑا۔ وہ ماضی بے نقاب ہوجانے کے خوف سے خاموش ہوگئی تھی۔ ورنہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شعیب کسی طور بھی وہاں جائے۔ یہ وہی دیار تھا جہاں اس کا ماضی بکھرا پڑا تھا۔ نجانے اسے کیوں یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ سلامت نگر چلا گیا تو کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ماضی عیاں ہو جائے گا اور پھر جو طوفان اٹھے گا، اس کا سراسر نقصان ان دونوں ماں بیٹے کا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شعیب کو سلامت نگر جانے سے روک لے۔ اس کا وہاں جانا اسے قطعاً قبول نہیں تھا، مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی اسے کس موڑ پر لے آئی تھی یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پھر سے اسے سلامت نگر سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ جہاں پیر سائیں کی حویلی تھی۔ جس میں اس کا بچپن بیتا تھا، جوانی کے ایام بھی گزر رہے تھے۔

ان دنوں زبیدہ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ عام لڑکیوں کی مانند اس کے من میں بھی خوابوں، خواہشوں اور امیدوں کا جہاں آباد ہو چکا تھا، یقیناً ان میں اتنی شدت نہ ہوتی اگر وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح حویلی کے اردگرد کی بستیوں میں سے کسی ایک بستی میں رہتی ہوتی۔ حویلی میں آباد پیر گھرانے کی وہ بھی ایک فرد تھی، لیکن عورت ہونے کے ناتے اس کی ذرا سی بھی حیثیت نہیں تھی جو ایک عام سی لڑکی کی ہوتی ہے۔ وہ روایات کی زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایک عام سی لڑکی کی طرح سانس لینے کی آرزو کی تھی۔ وہ پرندوں کی طرح آزاد فضاؤں میں اُڑنا چاہتی تھی۔ نیلے آسمان کو چھونے کی خواہش کرتی تھی۔ بادلوں میں تیرنے کی آرزومند تھی، مگر جیسے ہی خود کو دیکھتی تو اسے اپنے پر بندھے ہوئے ملتے اور وہ بے بسی سے حویلی کی چاردیواری میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔ اس کی دنیا محض اتنی سی تھی کہ وہ ہر جمعرات کو دربار شریف پر اپنی ملازماؤں کے ساتھ چلی جاتی۔ وہ پورے جسم پر حجاب اوڑھے ہوتی۔ اس کی آمد پر وہاں موجود خواتین اس کے اردگرد جمع ہو جاتیں۔ وہ فاتحہ خوانی کے لیے تھوڑی دیر ٹھہرتی اور پھر پلٹ کر واپس حویلی آ جاتی۔ بس یہ اس کی کل کائنات تھی۔

پھر ایک دم سے اس کی زندگی میں طوفان آ گیا۔ اس نے کاشف کو پہلی بار دربار شریف پر ہی دیکھا تھا۔ وہ مزار کے اندر کھڑا پورے جذب سے مجو دعا تھا اور زبیدہ مزار سے باہر کھڑکی جالیوں میں سے اندر دیکھ رہی تھی۔ کاشف کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہوگئی۔ یہاں دربار شریف پر آتے جاتے اس نے نجانے کتنے چہروں کو دیکھا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے من کے موسم میں ذرا سی بھی تبدیلی آ جائے۔ اس کے اندر تو ایک طویل خزاں کا موسم بس چکا تھا۔ کاشف پر نگاہ پڑتے ہی موسم اچانک بدل گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ خزاں کے بعد اب بہار کی آمد آمد ہے۔ اس نے یوسفؑ اور زلیخا کا قصہ بڑی دلچسپی سے سنا تھا۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ زنانِ مصر نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لیے تھے۔ اگرچہ وہ نہ تو زلیخا تھی اور نہ ہی سامنے کھڑا کاشف یوسف تھا، مگر زبیدہ کو سمجھ آ رہی تھی کہ زنانِ مصر کی انگلیاں کس طرح کٹ گئی تھیں۔ اونچا لمبا قد، گلابی جھلک مارتا ہوا سفید رنگ، بھرا بھرا جسم، بھاری مونچھیں، چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں پر سفید جالی دار ٹوپی، براؤن کرتے اور سفید گھیر دار شلوار میں وہ کسی اور ہی جہاں کا فرد لگ رہا تھا۔ زبیدہ نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ کاشف نے فاتحہ خوانی کی، کچھ دیر مودب کھڑا رہا اور پھر وہاں سے چلا

گیا۔ زبیدہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا آپ بھی اسی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ وہ وہاں سے حویلی پلٹ آئی لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ اپنا سب کچھ وہیں دربار پر چھوڑ آئی ہے۔ انسان کا ایک اپنا پن ہی تو ہوتا ہے اس کے پاس۔ وہ ہی نہ رہے تو پھر باقی کیا بچتا ہے۔

موسم خزاں میں جذبات کی ہلکی ہلکی پھوار میں جب ہجر کے بادل چھا جائیں تب پھوار تیز بارش میں بدل ہی جایا کرتی ہے اور بہار آنے کی نوید مل جاتی ہے۔ ایسے میں سوچوں کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ابھی خوشبو نہیں پھیلی تھی مگر خوشبو کے احساس ہی سے وہ مدہوش ہونے لگی تھی۔ جذبات کی بارش میں بھیگی خوشبو کے احساس سے مدہوش اور محدود سوچوں کے حصار میں قید وہ خود کو ایک نئے جہاں کا باشندہ تصور کرنے لگی۔ ساری دنیا ایک کاشف کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ جیسے یہ شاید تک نہیں تھا کہ کوئی اسے اتنا ٹوٹ کر چاہنے لگا ہے کہ اس کا اپنا آپ بھی نہیں رہا۔ وہ اگلی جمعرات دربار شریف گئی تو کاشف اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ معمول سے کہیں زیادہ وقت وہاں رہی۔ لیکن دیدار نہ پاسکی اور مایوس لوٹ آئی۔ وہ دل ہی دل میں اسے دیکھنے کی حسرت لیے نجانے کتنی بار دعا کر چکی تھی پھر ایک دن اسے یوں لگا جیسے اس کی ساری دعائیں قبول ہو گئیں۔ وہ حیرت سے بت بنا گئی۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے حویلی کے مردان خانے کا تھوڑا سا صحن دکھائی دیتا تھا۔ کاشف وہاں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم پسینے میں نہا گئی اور بے ترتیب سانسیں لیے کتنی ہی دیر تک اپنے بیڈ پر پڑے سوچتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔۔۔

کاشف محکمہ انہار میں دوسرے درجے کا آفیسر تھا۔ وہ محکمے کی طرف سے سلامت نگر آیا تھا۔ اس وقت زبیدہ کے والد پیر سائیں تھے۔ جنہوں نے اپنی زمینوں کے لیے نہر کے بندوبست کی خاطر محکمے کو بلوایا تھا۔ اسی لیے کاشف اور دیگر اہلکاروں کو مردان خانے میں رہنے کے لیے جگہ دی گئی۔ وہیں سلامت نگر میں ان کا تین مہینے رہنے کا پراجیکٹ تھا۔ وہ سب لوگ صبح کے نکلے شام ڈھلے واپس آتے۔ زبیدہ اور کاشف کی پہلی بار نگاہیں چار ہوئیں تو پھر یہ آنکھ مچولی چل نکلی۔ وہ سارا دن اس کے انتظار میں گزار دیتی۔ صبح کا ذرا سا وقت یا پھر شام کو تھوڑی سی دیر کے لیے وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس سے بات کرنے کی خواہش دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ لیکن حویلی میں رہتے ہوئے ایسا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زبیدہ کی خاص ملازمہ شرماں مائی کو اس کی دلچسپی کے محور کے بارے معلوم ہو گیا۔ وہ اس راز سے واقف ہوئی تو ایک راستہ نکل آیا۔ ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی کا وہ واحد ذریعہ بن گئی۔ جس کے باعث دونوں میں تعلق پروان چڑھنے لگا۔ شرماں مائی پر تو نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ تقریباً دو مہینے یونہی گزر گئے۔ شرماں مائی کا کچا گھر پکا ہو گیا اور زبیدہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ دن کس طرح گزر گئے۔ ورنہ تو اس حویلی میں دن گزارنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ ان دونوں میں تعلق اس عروج پر آ گیا کہ ملنے کی خواہش انہیں بے جان کرنے لگی۔

ایک شام زبیدہ کو یہ پیغام ملا کہ مردان خانے میں کوئی نہیں ہے۔ سارے ساتھی اہلکار اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو آ جائے، موقع ہے۔ پیغام ملتے ہی وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگی۔ رات ذرا گہری ہوئی تو شرماں مائی کی وساطت سے وہ مردان خانے میں جا پہنچی۔ پورے جسم کو وہ بڑی سی چادر میں لپٹائے اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ دالان میں کھڑا کاشف اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو کتنی دیر تک وہ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ بس نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو اپنے من میں اتارتے رہے۔ زبیدہ کا دل پورے وجود سمیت دھڑک رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ تب کاشف نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"زبیدہ۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ جسے نہ تم پار کر سکتی ہو اور نہ میں۔ کیوں نہ ہم اپنے بڑھتے قدموں کو روک لیں۔ ورنہ پچھتاوا ہمارا مقدر بن جائے گا۔"

...جذب کا یار کر چکی ہوں۔ ہاں اگر ...ر سکتے ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ اسے میں ...مت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔" اس نے مایوسی ...ئی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"جذبے اگر سچے ہوں تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میری بات چھوڑو اپنی کہو، صرف باتوں سے یا خیالوں میں فاصلے پار نہیں ہوا کرتے۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی عتاب نازل ہو۔" اس نے پورے خلوص سے کہا۔

"آپ مجھے اپنے مضبوط سہارے کا احساس دلا دیں۔ میں آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار ہوں۔ اس سفر میں چاہیں جتنی مشکل آئے۔" وہ محبت سے سرشار لہجے میں بولی۔

"اگر ایسی بات ہے تو چلو، اس دنیا سے نکل چلتے ہیں اور دور کہیں اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔" کاشف نے اچانک فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ حویلی سے باہر کی دنیا میں بھی سانس لے سکتی ہے۔ کوئی نئی دنیا بھی بن سکتی ہے۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی شادی نہیں ہو پائے گی۔ اس کا احساس بہت پہلے اسے دلا دیا گیا تھا اور اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ساری زندگی اسی حویلی میں گزرنی ہے۔ یہی وہ لمحات تھے جب زبیدہ نے بھی فیصلہ کر لیا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" اس نے ایک دم سے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا۔

"تو جاؤ، واپس چلی جاؤ اور اس لمحے کا انتظار کرو، جب میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔" کاشف نے اس یقین و اعتماد سے کہا کہ پورے وجود سے بھیگ گئی۔ وہ انہی قدموں پر پلٹ کر اپنے کمرے تک آن پہنچی اور اسی وقت سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی تھی، پھر وہ کبھی نہیں ملے۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ دن یونہی انتظار میں کھلتے رہے۔ تب ایک شام شرماں مائی نے زبیدہ خاتون تک یہ پیغام پہنچایا کہ آج رات یہاں سے نکل جانا ہے۔ وہ لمحہ لمحہ انتظار کرتی ہوئی اس لمحے تک آن پہنچی، جب اس نے حویلی سے باہر قدم رکھ دیا۔ وہ

کاشف کے ساتھ حویلی سے بہت دور لاہور کی گنجان آبادی میں آ گم ہوئی۔ کاشف اسے اپنے گھر نہیں رکھ سکا، کیونکہ وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بعد میں ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ وہ تو نکاح کے بعد ایک الگ گھر میں رہنے لگے اور حویلی والے کاشف کو تلاش کرتے اس کے گھر والوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے تھکیانہ دفتر ہی کو ذریعہ بنایا تھا۔ کاشف نے چھٹی لے رکھی تھی۔ حویلی والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ زبیدہ اور کاشف نکاح کر چکے ہیں اور زبیدہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو خاموشی چھا گئی۔ کاشف ان کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔ کاشف ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کا بڑا بھائی ظاہر شاہ ان دونوں کے حق میں تھا لیکن چھوٹا دلاور شاہ ان کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ یہ تو کاشف کے آفیسر درمیان میں پڑ گئے اور قانونی چارہ جوئی کے بعد بات عدالت تک جانے والی تھی کہ ایک دم ایسی خاموشی چھائی تھی کہ جیسے اس کا وجود حویلی والوں کے لیے بھی تھا ہی نہیں۔ وہاں حویلی میں کیا ہوا کیا نہیں ہوا؟ اسے کوئی خیر خبر نہ ملی تھی۔ وہ ان سے دور کیا ہو گئی کہ سب کچھ بھول کر اپنی دنیا میں کھو گئی۔ یہاں تک جب شعیب چند سال کا ہوا تو کاشف اس دنیا میں نہ رہا۔ زبیدہ نے وہیں بسیرا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سامنے اپنے بیٹے کی پرورش تھی۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ٹھہری تھی۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ اس کی زندگی میں پھر سے سلامت تکرا گیا۔ وہ ساری رات اپنی بے بسی سے الجھتی رہی تھی۔ جس وقت اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو اسے اپنے ماضی سے پلٹنا پڑا۔ انہی لمحات میں اس نے ایک دم سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے پر اس وقت تک یہ راز افشا نہیں کرے گی، جب تک حالات ایسا نہیں چاہیں گے۔ ممکن ہے بہت جلد اس کا تبادلہ ہو جائے۔ اس کا راز، راز ہی میں رہے اور اس کا مان یونہی برقرار رہے۔ تب اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ نہ جانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ کہیں کوئی جذباتی لمحہ اس کا ماضی کھول کر نہ رکھ دے اس نے یہ سب طے کیا اور پرسکون ہو کر اٹھی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ (جاری ہے)

☆.....☆